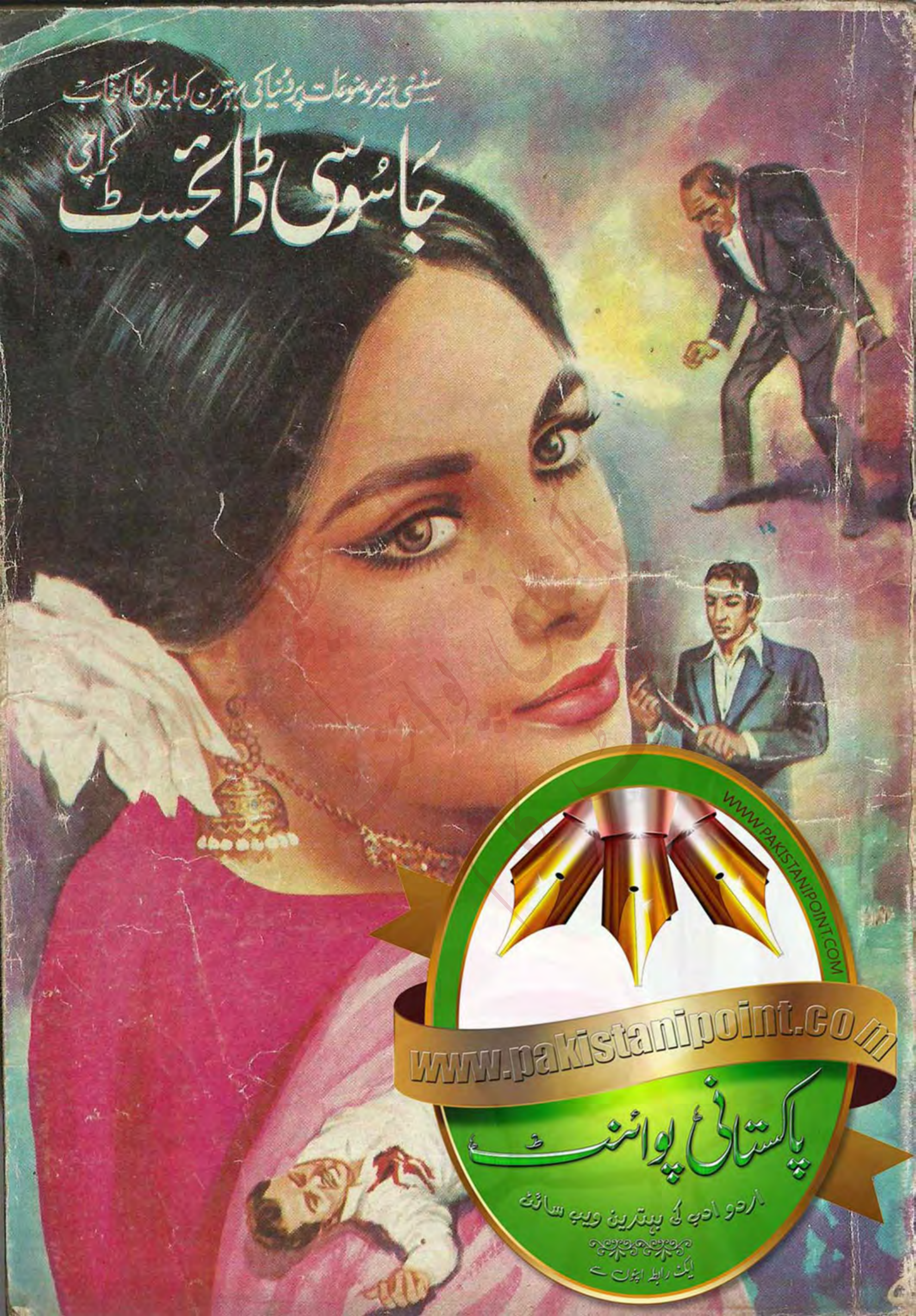

WWW.PAKISTANIPOINT.COM
www.pakistanipoint.com
پاکستانی پوائنٹ
اردو ادب کی بہترین ویب سائٹ
ایک رابطہ اپنوں سے

جرم و سزا

گھاس کی پیاس
ابوضیاء اقبال ۸

ایک نوجوان محافظ اور ایک سائنسداں کی دلچسپ کہانی!

نصف گھنٹے کی تاخیر
اویس ناصر ۴۸

جرم و سزا کا یہ دلچسپ واقعہ ایک جہاز راں کمپنی کے منتظم کو پیش آیا

حرام کمائی
حفیظ اقبال ۵۴

مشہور حبیب کترے عبدل کی تاثر انگیز کہانی

اناڑی جاسوس
اطہر ندیم ۹۰

ایک اناڑی جاسوس، ایک حسین دوشیزہ اور ہوائی جہاز کا سفر!
یہیں سے اس دلچسپ کہانی کی ابتدا ہوتی ہے!

پُراسرار

سنگتراش
اقلیم علیم ۴۰

مشرق کی پُرفسوں فضاؤں کی ایک سنسنی خیز داستان!
(ساتویں قسط۔ سابقہ قسطوں کے خلاصے کے ساتھ)

ناگ بھون — سلطان محمد خاں — ٦٢

ناگ بھون میں سلطان محمد خاں کو پیش آنے والے ہولناک واقعات!
(اُنتیسویں قسط، سابقہ قسطوں کے خلاصے کیساتھ)

جرائم

کاروبار کا گُر — ثمینہ اقبال — ٨١

اس کہانی کو سسپنس ڈائجسٹ کے مدیر اقبال پاریکھ نے منتخب کیا ہے!

خوابوں کا شہزادہ — آفریدہ وقار — ٩٩

یوں تو وہ اس کے خوابوں کا شہزادہ تھا۔ لیکن وہ کچھ اور بھی تھا!

جنگ عظیم

رقصِ آتش — سید معروف علی — ١١٠

دوسری جنگ عظیم کے ہولناک واقعات!
ایک رقاصہ کی بے مثال قربانی کی لازوال داستان

سرورق

رانگ نمبر — اثر نعمانی — ١٢٧

مشہور جوڑ حیران کے کردار پر سرورق کی پہلی کہانی!

اُس کا انتقام — ش صغیر ادیب — ١٤٢

جاسوسی ڈائجسٹ کے انعام یافتہ مصنف کے قلم سے سرورق کی دوسری کہانی!

قیمت ● دو روپے ٢٥ پیسے

جلد ٣ ● شمارہ ٨ ● اگست ١٩٧٢ء

زرِ سالانہ مع رجسٹری فیس ● ٢٥/- روپے

خط و کتابت کا پتہ ● پوسٹ بکس ٢٢٩ کراچی ١

پبلشر ● عبدالغفار

پرنٹر ● منظور احمد خان

مطبوعہ ● جاوید پریس
آئی آئی چندریگر روڈ کراچی

مقامِ اشاعت ● ٧-E-٧/١٤ ناظم آباد، کراچی ١٨

دفتر : ٣١- سعید منشن، بلیموریا اسٹریٹ، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی

باب

جاسوسی ڈائجسٹ کو شائع ہوتے ہوئے تقریباً تین سال ہو چکے ہیں ملک کا یہ مقبول اور کثیر الاشاعت ماہنامہ اس مقصد کو لے کر آپ کے سامنے نہیں آیا تھا کہ آپ کی تفریحِ طبع کیلئے ہر ماہ کچھ جاسوسی کہانیاں پیش کرے بلکہ اس کا مقصد آپ کے اندر وہ شعور پیدا کرنا تھا، جو آپ کو انسانی لغزشوں کے ان تاریک پہلوؤں سے روشناس کرے جس کو "جرم" کہا جاتا ہے "جرم" کا لفظ بہت وسیع ہے قتل، چوری یا ڈاکہ وغیرہ ہی جرائم نہیں ہیں بلکہ ہر وہ حرکت جرم ہے جس کی وجہ سے خود کو یا کسی دوسرے کو تکلیف پہنچے، بہت سے افعال ایسے ہیں جن سے کسی دوسرے کو تکلیف ضرور پہنچتی ہے جنکے کرنے کی موجودہ تہذیب نے اجازت دے دی ہے ___ یا دوسرے لفظوں میں قانونِ تعزیرات نے اُن کو جرم قرار نہیں دیا ہے۔ مگر بہر حال وہ ایسے ہیں جن سے کسی دوسرے کو تکلیف ضرور پہنچتی ہے، یاد رکھئے کوئی شخص ساری دُنیا کو تو کیا چند آدمیوں کو بھی درست نہیں کر سکتا لیکن وہ خود کو تو درست کر سکتا ہے، اگر ہر شخص خود کو درست کر لے، ساری دُنیا خود بخود درست ہو جائیگی ___ یہی وہ مقصد ہے جس کو لے کر جاسوسی ڈائجسٹ شائع ہوا تھا اور آج بھی یہی اُس کا پیغام ہے۔

پچھلے شمارے میں میں نے جاسوسی ڈائجسٹ میں کی جانے والی تبدیلیوں کا ذکر کیا تھا، اس سلسلے میں مجھے قارئین کے کئی خطوط موصول ہوئے ہیں جن میں مفید مشورے دئیے گئے ہیں۔ جس کیلئے میں اُن کا بے حد ممنون ہوں اور ساتھ ہی معذرت خواہ بھی کہ فرداً فرداً ان خطوط کا جواب دینا میرے لئے ممکن نہیں ___ اگلے ماہ سے خطوط کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے، قارئین سے درخواست ہے کہ اس شمارے سے متعلق اپنی بیش قیمت آراء سے ہمیں نوازیں اور جاسوسی ڈائجسٹ کو مزید بہتر بنانے کیلئے ذہن میں کوئی تجویز ہو تو ہمیں لکھ بھیجیں ___!

اس ماہ انعام یافتہ کہانی پیش نہیں کی جا رہی ہے، میں پہلے بھی آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ انعام یافتہ کہانی کا ہماری نظر میں ایک خاص معیار ہے، اگر کوئی کہانی اس معیار پر پوری نہیں اُترتی تو کسی اور کہانی کو "پہلی کہانی" کے طور پر پیش کر دیا جاتا ہے۔ اس ماہ کی پہلی کہانی "گھاس کی پیاس" ہے جسے آپ کے لئے ابو ضیاء اقبال نے تحریر کیا ہے، توقع ہے کہ جُرم و سزا کی یہ کہانی اپنے منفرد اور دلچسپ اندازِ بیان کی وجہ سے آپ کو پسند آئے گی۔ جُرم و سزا کی اس بار تین دلچسپ کہانیاں اور ہیں ___ اویس ناصر کی "نصف گھنٹے کی تاخیر" ___ حفیظ اقبال کی "حرام کی کمائی" ___ اور اطہر ندیم کی "اناڑی جاسوس" ___!

سید معروف علی "رقصِ آتش" پیش کر رہے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کی یہ ولولہ انگیز اور پُر تاثیر کہانی آپ کو ضرور پسند آئے گی۔

سرورق کی اس ماہ دو کہانیاں پیش کی جا رہی ہیں۔ "رانگ نمبر" مشہور چور جبران کے کردار پر دلچسپ اور سنسنی خیز کہانی اثر نعمانی نے تحریر کی ہے۔ سرورق کی دوسری کہانی "اُس کا انتقام" ہے جسے مشہور مصنف ش صغیر ادیب نے لکھا ہے۔

ابوضیا اقبال

تمہید

صرف اس کی رکھوالی اور حفاظت کرنی ہے۔" پروفیسر سامری نے تقریباً سو مربع فٹ میں پھیلی ہوئی گھاس کی طرف اشارہ کرکے کہا "اگر کسی نے اس پر پاؤں رکھا یا اس کی ایک پتی بھی ٹوٹی تو اس کی تمام تر ذمہ داری تم پر ہوگی اور معاہدے کی رو سے میں تمہیں جو چاہوں گا سزا دوں گا۔"

"آپ مطمئن رہیئے۔" میں نے اعتماد سے کہا۔ "اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔"

"آؤ، اب تمہیں تمہارا کمرہ دکھادوں۔" پروفیسر سامری نے قدرے شفقت سے کہا اور ہم اس کی طویل و عریض کوٹھی میں داخل ہوئے۔

ہمارے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا، اس کی رو سے میری تنخواہ ہزار روپے ماہوار مقرر کی گئی تھی۔ مجھے چوبیس گھنٹوں میں سے کل اٹھارہ گھنٹے ڈیوٹی دینی تھی۔ کوٹھی کی حدود سے پروفیسر کے حکم کے بغیر قدم باہر نہیں نکالنا تھا۔ کسی فرد سے، خواہ وہ کوٹھی میں رہتا ہو یا باہر سے آئے، ایک لفظ نہیں بولنا تھا۔ میرے ذمے جو فرض لگایا گیا تھا، اس سے کوتاہی کی پاداش میں، پروفیسر جو مناسب سمجھے وہ سزا بلا چوں و چرا قبول کرنی تھی۔ پروفیسر کی جان کی پوری پوری حفاظت کرنی تھی۔ میری رہائش اور ضرورت کی ہر چیز کی فراہمی پروفیسر کے ذمے تھی۔ میں کوٹھی کے طعام خانے میں موجود ہر چیز جب اور جتنا چاہے کھا پی سکتا تھا۔ ڈیوٹی کے اوقات میں پروفیسر کی دی ہوئی یونیفارم جو خاکی بش شرٹ، خاکی پتلون اور لمبے ربر کے جوتوں پر مشتمل تھی، پہننا تھی۔ خط لکھنے یا ٹیلی فون کرنے کی قطعاً اجازت نہیں تھی۔ مجھے اپنی پسند کے اخبارات رسائل اور کتابیں مہیا کرنے کی ذمے داری پروفیسر کے سر تھی۔ ہر ماہ ملنے والی تنخواہ اگر میں چاہوں تو اس کے ذریعے بنک میں رکھوا سکتا تھا۔ بارہ بجے رات سے صبح چھ بجے تک اپنے کمرے سے نکلنا نہیں تھا کیونکہ اس وقت دو خونخوار شکاری کتوں کو کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے، جو کوٹھی کی حدود میں نظر آنے والے کسی بھی شخص کو چیر پھاڑ کر ہلاک کرسکتے ہیں۔ اس لئے خود اپنے مفاد میں مجھے کمرے میں رہنا تھا۔ اس دوران اگر کسی چیز کی ضرورت پڑے تو دیوار پر لگی ہوئی گھنٹی بجانی تھی۔ پروفیسر کے بلائے بغیر اس سے ملنے کی کوشش نہیں کرنی تھی، لیبارٹری میں اس کی اجازت کے بغیر قطعاً نہیں جانا تھا۔ اس کے کام میں مخل نہیں ہونا تھا۔

گریجویشن کرنے کے بعد مجھے ملازمت تلاش کرنے کا مرحلہ درپیش تھا۔ کلرکی مجھے پسند نہیں تھی اور کوئی ایسی ملازمت جس میں ہاتھ پاؤں سے کام لینے کی ضرورت ہو، ملتی نہیں تھی۔ میں ہاتھ پاؤں کا مضبوط تھا اور ہائی اسکول سے کالج تک ایتھلیٹ رہ چکا تھا۔ اس ضمن میں مجھے کئی انعامات اور سندیں ملی تھیں۔ باکسنگ، جوڈو اور کشتی میرے محبوب مشاغل تھے میرے کالج کے ساتھی اور دوسرے احباب مجھے فولادی انسان کہتے تھے۔ میری خواہش فوج میں جانے کی تھی لیکن ذہنی استعداد مجھے کمیشن کا اہل نہ بنا سکی تھی۔ یہاں سے مایوس ہوکر میں پولیس میں بھرتی ہونے، بارڈر پولیس میں شامل ہونے یا کسٹم کی انسپکٹری کے لئے کوشش کررہا تھا۔ اسی اثناء میں اخبار کے ایک اشتہار پر نظر پڑی جو ذاتی محافظ کے لئے تھا۔ امیدوار کے لئے اس کا اہل ہونے کی جو شرائط رکھی گئی تھیں، وہ تقریباً ساری مجھ میں موجود تھیں اور تنخواہ ہزار روپے ماہوار تھی جس کا میں تصور بھی نہ کرسکتا تھا۔ میں اسی دن اشتہار کے نیچے دیئے ہوئے پتے پر جا پہنچا۔

پروفیسر سامری کی طلسماتی کوٹھی شہر سے دور، سڑک سے کوئی دو سو قدم پیچھے جنگل کے کنارے واقع تھی۔ یہ طلسماتی اس لئے تھی کہ اس کی وضع قطع عام اور مروجہ طرز کی کوٹھیوں سے یکسر مختلف تھی، قدرے قلعہ نما تھی، کوئی چھ سو اچھ سو گز کے مستطیل پلاٹ پر بنی ہوئی تھی۔ اس کی دیواریں اونچی اونچی تھیں اور ان پر خاردار تار بچھے ہوئے تھے، جس میں میری دانست میں برقی رو بھی کسی وقت دوڑائی جاتی ہوگی۔ پھاٹک اتنا چھوٹا تھا کہ اس میں سے صرف پروفیسر کی چھوٹی سی بے بی موریس کار گزر سکتی تھی۔ اندر داخل ہونے پر دائیں اور بائیں سبزے کے قطعات تھے جن میں کہیں کہیں پھولوں کے پودے بھی تھے۔ یہ قطعات مثلث کی شکل میں تھے۔ پھاٹک سے پختہ سرخ

اینٹ کی کوئی تیس فٹ سڑک سیدھی پورٹیکو کو جا چھوتی تھی۔

یہ کوٹھی کے بارے میں میری ابتدائی معلومات تھیں جو اُس کے مکین سے ملنے اور اس سے معاہدہ ہونے سے پہلے سامنے آئیں۔ مجھے پھاٹک پر کسی نے نہیں روکا تھا اور میں سینہ تانے، ہاتھ فوجیوں کی طرح ہلاتا سیدھا پورٹیکو میں جا کھڑا ہوا تھا اور ایک طرف لگی ہوئی گھنٹی بجانے والا ہی تھا کہ ایک بھاری آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"اُس کی ضرورت نہیں ہے، نوجوان!" میں نے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ اتنے میں شیشے کا صدر دروازہ خود بخود کھل گیا اور وہی آواز سنائی دی۔

"اندر آجاؤ۔" میں اندر گیا تو کمرے میں نیم تاریکی تھی اور باہر کی تیز روشنی میں سے آنے کی وجہ سے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے پر مجبور تھا۔ جب آنکھیں اس نیم تاریکی سے مانوس ہوئیں تو مجھے آتشدان کے پاس آرام کرسی پر ایک شخص نیم دراز نظر آیا۔ میں اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اُس نے تحکماً مجھے بیٹھ جانے کو کہا اور میں اُس سے کچھ فاصلے پر رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

کمرے میں ایک منحوس سی خاموشی طاری تھی اور میرا دم گھٹنے لگا تھا کیونکہ میں اس قسم کے قبر نما کمروں میں جانے کا عادی نہیں تھا۔ میں امید و بیم کی ایک صبر آزما کیفیت میں ڈوبا، بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ اپنے مقابل بیٹھے ہوئے شخص کے چہرے کو میں اچھی طرح دیکھ نہیں سکتا تھا، تاہم میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ دو تیز نظریں میرے سارے جسم پر گھڑی کی سوئیوں کی طرح رینگ رہی تھیں۔ چند منٹوں تک یہی حالت رہی، پھر اُس نے اسی تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "تم نے اشتہار کو غور سے پڑھ لیا ہے نا۔؟"

"جی۔" میں نے دبی ہوئی آواز سے کہا کیونکہ میری آواز پاٹ دار تھی۔ پھر میں نے اُسے اپنے قد، وزن، سینے کی چوڑائی اور انعامات، اسناد وغیرہ کی پوری تفصیل بتائی۔ یہ بھی بتایا کہ میں کسی ایسی ملازمت کے لئے سرگرداں ہوں جس میں مجھے اپنے خداداد جسم سے کام لینے کا پورا پورا موقع ملے۔

"خوب!" اُس نے کہا "تم مجھے اِس کام کے لئے موزوں آدمی لگتے ہو۔ اگر تمہیں یہ ملازمت کرنی ہے تو ایک معاہدے پر دستخط کرنے ہوں گے اور اس سے خلاف ورزی کا انجام بھی ذہن میں رکھنا ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور ایک بڑی سی آبنوسی میز کے پاس گیا۔ اُس کی دراز کھول کر ایک فائل نکالی اور مجھے اپنے پاس بلایا۔ میں میز کے قریب گیا تو اُس نے ٹیبل لیمپ جلایا اور فائل میری طرف بڑھا دی۔ اس میں ایک ٹائپ کیا ہوا معاہدہ تھا۔ میں نے اُس کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھا اور دستخط کر دیئے۔ اُس نے فائل دراز میں بند کر دی اور ٹیبل لیمپ بجھا دیا۔

★

"یہ رہا تمہارا کمرہ۔" پروفیسر سامری نے کمرے کا دروازہ کھولتے

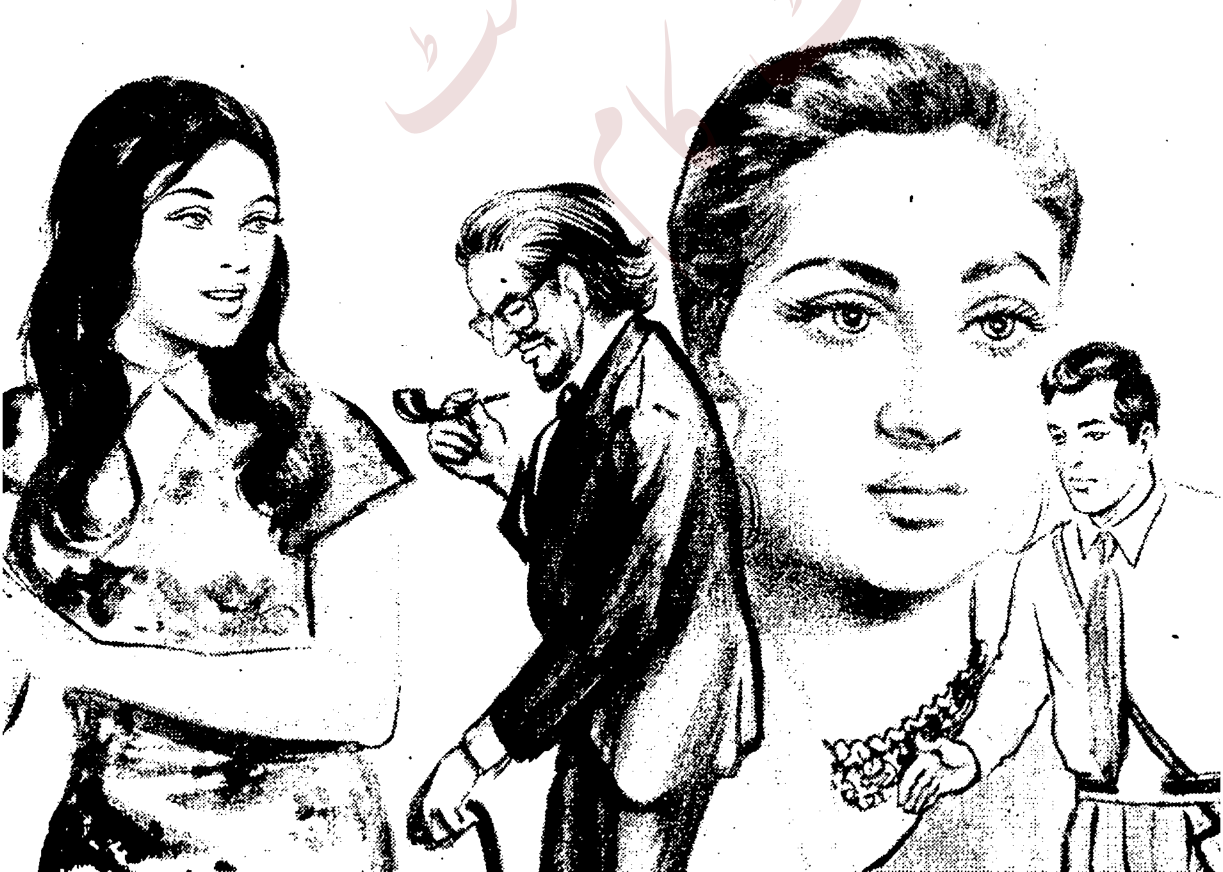

ہوئے کہا' اور دونوں اندر داخل ہوئے۔ کمرہ خاصا کشادہ اور آرام دہ تھا۔ ہر چیز قرینے کی تھی۔ میں اِن بیش قیمت چیزوں کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا اور اپنی خوش بختی پر ناز کر رہا تھا۔

"اب پوری کوٹھی خوب اچھی طرح دیکھ لو۔" پروفیسر نے کہا اور میں اُس کے ساتھ چل پڑا۔ کمرے سے باہر نکل کر اُس نے ساتھ کے کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہ میرا کمرہ ہے یعنی میری خواب گاہ۔ اگر تمہیں اس میں رات کے وقت کسی قسم کا ہنگامہ یا شور و غل سُنائی دے یا یہ محسوس ہو کہ مجھے مدد کی ضرورت ہے تو میری جان بچانا تمہاری ذمے داری ہو گی۔ اگر تم اِس میں ناکام رہے تو معاہدے کی رُو سے۔۔۔"

"میں جانتا ہوں۔" میں نے اُس کی بات کاٹی "آپ کو کوئی شکایت نہیں ہو گی۔"

ہم راہداری میں سے گزر رہے تھے، جس کے اختتام پر ایک ہال تھا۔ پروفیسر نے چابی لگا کر دروازہ کھولا اور بولا۔ "یہ میری لیبارٹری ہے۔ میں اس میں تجربے کرتا ہوں۔ تمہیں اس میں بن بلائے داخلے کی اجازت نہیں ہے، اِس میں بعض ایسی خطرناک چیزیں ہیں جن کے قریب سے گزرنے پر بھی جان کا خطرہ ہے۔ تم اپنا نفع نقصان خود سوچ سکتے ہو۔"

لیبارٹری کے ایک کونے میں ایک بڑا سا پلائی وڈ کا تختہ دیوار سے جڑا ہوا تھا۔ اس پر شیشہ لگا ہوا تھا۔ اس تختے کا مقصد میری سمجھ میں نہ آیا۔ لیکن میں نے پروفیسر سے پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ ہم لیبارٹری سے باہر آئے تو راہداری میں بائیں طرف ایک ہال نما کمرے میں ایک بڑی سی گول میز کے گرد کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ پروفیسر نے بتایا کہ یہ کانفرنس روم ہے لیکن اس میں اب تک کوئی کانفرنس نہیں ہوئی ہے۔ جب میں اپنے تجربے میں کامیاب ہو جاؤں گا تو ساری دنیا کے سائنس دانوں کو مدعو کروں گا اور اس کمرے میں اُن کے سامنے اپنے تجربے کے نتائج کا انکشاف کروں گا۔ اب ہم راہداری میں سے گزرتے ہوئے میرے کمرے کے دائیں طرف گئے۔ آخر میں راہداری کے دائیں اور بائیں طرف دو کمرے آمنے سامنے تھے دائیں طرف کے کمرے کے بارے میں اُس نے بتایا کہ باورچی خانہ ہے اور اُس کے سامنے کھانے کا کمرہ۔

"تم ناشتے اور کھانے کے لئے اِس کمرے میں آؤ گے۔" پروفیسر نے کہا اور مجھے لے کر پھر اِس کمرے میں آ گیا جس میں اُس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اُس کے بتائے بغیر میں سمجھ گیا کہ یہ ڈرائنگ روم تھا۔

"تم نے اپنی ڈیوٹی اچھی طرح سمجھ لی ہے۔" اُس نے میز کی دراز کھولتے ہوئے کہا۔ "یہ لو۔ میں تمہیں تنخواہ پیشگی دیتا رہوں گا۔" اُس نے نوٹوں کی ایک گڈی میری طرف بڑھا دی اور بولا "لیکن تم اُسے لے کر کبھی بھی بھاگ نہیں سکو گے۔ معاہدے کی رُو سے۔۔۔"

"میں نہیں بھاگوں گا۔" میں نے اُسے یقین دلایا۔ اُس نے سر ہلاتے ہوئے دراز میں سے ایک ریوالور اور چھوٹا سا ڈبّہ نکالا اور بولا "اس ڈبّے میں کارتوس ہیں۔ انہیں بلاوجہ استعمال نہیں کرنا ہے، سمجھے!" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا" اور اس ریوالور سے میری اور میری گھاس کی حفاظت کرنی ہے۔" میں نے پھر سر ہلا دیا۔

"اب تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ تمہیں یونیفارم وہیں مل جائیگی، ہاں صبح کے ناشتے کا وقت سات بجے ہے۔ دوپہر کا کھانا ٹھیک بارہ بجے، شام کی چائے ٹھیک پانچ بجے اور رات کا کھانا ٹھیک آٹھ بجے۔ میں وقت کی سختی سے پابندی کرتا ہوں اور تم سے بھی یہی توقع رکھتا ہوں۔ وقت کی پابندی تمہارا اخلاقی فرض ہے۔ البتّہ تم وقت پر ناشتہ کرنے اور کھانا کھانے کے علاوہ بھی جس وقت چاہو کھا پی سکتے ہو۔ کوئی روک ٹوک نہیں ہے لیکن اس کے لئے تمہیں نوکر کو ہر بات لکھ کر بتانی ہو گی کیونکہ وہ بالکل بہرا ہے اور۔۔۔ تمہاری اطلاع کے لئے، گونگا بھی۔"

میں پروفیسر سے رخصت ہو کر اپنے کمرے میں آیا تو سوچنے لگا کہ کہیں میں کسی خطرے میں گِھر تو نہیں گیا ہوں! کوٹھی کا ماحول اور پروفیسر کی پُراسرار شخصیت میرے لئے خاصی پریشان کُن باتیں تھیں، تاہم میں اسے ایک طرح کی مہم جوئی سمجھ رہا تھا جس میں دلچسپی کا سب سے بڑا اور اہم مرکز وہ پیسہ تھا۔ کچھ دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی ہاتھوں پر کوئی بنڈل سا اُٹھائے اندر آیا۔ اُس نے بنڈل کو میز پر رکھا اور جانے لگا۔ جی میں آئی کہ اُس سے کچھ پوچھوں لیکن اُس کی سرد مہری اور پروفیسر کے ڈر سے خاموش رہا۔ اس آدمی میں کوئی پُراسرار سی بات تھی جو مجھے کھٹک رہی تھی۔ اُس کی عمر پچاس سے اوپر تھی۔ داڑھی، مونچھ اور سر صفا چٹ تھا۔ جسم تنومند اور قد چھوٹا تھا۔ آنکھیں، جو میری آنکھوں سے لحظہ بھر کے لئے ملی تھیں، مجھے اُلّو کی طرح لگیں۔ اُس کی چال ڈھال سے میکانیکی پن ٹپک رہی تھی۔ وہ اُس سدھائے ہوئے بن مانس کی طرح تھا، جو کھانے اور حکم بجا لانے کے سوا تیسری بات نہیں جانتا۔ میں نے اسی دم اس کا نام سوچ لیا۔ بن مانس۔

اُس کے جانے کے بعد میں نے بنڈل کو کھولا تو اُس میں یونیفارم نکلی، وہی چیزیں جو پروفیسر نے بتائی تھیں، البتّہ اس کے ساتھ فوجی افسروں کی طرح کا کراس بیلٹ بھی تھا جس کی ایک طرف ریوالور کے لئے اور دوسری طرف خنجر کے لئے پیٹی تھی۔ خنجر۔۔۔ کیا مجھے خنجر بھی پاس رکھنا ہو گا؟ میں نے سوچا، اور ایک چمکتی ہوئی گول چیز اُٹھا لی۔ یہ پیتل کا ایک بیج تھا جس کا قطر تقریباً

چار انچ تھا۔ درمیان میں نصف گولائی میں اسٹیل کے بنے ہوئے حروف تھے اوپر "لیب" اور نیچے "گارڈ" تھا اور ان کے درمیان میں بڑا سا "ایس" تھا۔ اس کا مطلب میں نے یہ لیا کہ میں ایس یعنی سامری کی لیبارٹری کا گارڈ تھا۔

میں اپنی یونیفارم کو الٹ پلٹ کر دیکھ ہی رہا تھا کہ "بن مانس" پھر آیا۔ اب کے اُس کے ہاتھ میں ربر کے لمبے جوتے تھے جو عام طور سے سنز بارشوں میں پہنے جاتے ہیں۔ اُن کے تلے بھی ربر کے تھے اور یہ میری پنڈلیوں کے اوپر تک آتے تھے۔ بن مانس جوتے رکھ کر میری طرف دیکھے بغیر چلا گیا میں نے یونیفارم پہن لی اور جوتے پیروں میں ڈال کر الماری کے قدِ آدم آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔ معاً میرا سینہ پھول گیا۔ میں فوجی یا پولیس افسر بننے کے خواب دیکھ رہا تھا اور اس یونیفارم میں اس سے کہیں زیادہ جچ رہا تھا۔ اِس کے علاوہ میری تنخواہ اور آسائشیں ایک نئے نئے فوجی یا پولیس افسر کے مقابلے میں دوگنا تھیں۔ اس خیال سے میں کلّی طور پر مطمئن ہو گیا اور اپنے فرائض کی بجا آوری کے لئے بڑی مسرت اور اعتماد سے تیار ہو بیٹھا۔ گھڑی دیکھی تو پونے بارہ بجے تھے، گویا کھانے میں صرف پندرہ منٹ کی دیر تھی۔ وقت گزارنے کے لئے میں کمرے کا معائنہ کرنے لگا۔

سب سے پہلے میں نے دیوار پر لگے ہوئے گھنٹی کے بٹن کو غور سے دیکھا کیونکہ مجھے اُس سے بہت کام لینا تھا۔ اِس کے بعد الماری میں جھانکا، روزمرّہ استعمال کی تمام چیزیں، تولئے، صابن، کریم کی شیشی، شیو کا سامان، رومال، بنیان اور جرابوں کے کئی جوڑے، ٹوتھ پیسٹ، کئی کنگھیاں، ٹارچ معہ سیل کے ڈبے۔ پانی کا جگ معہ گلاس، حتیٰ کہ بٹن اور سوئی دھاگہ بھی تھا اگر کوئی چیز نہیں تھی تو کاغذ، پنسل اور فاؤنٹین پین۔ گویا مجھے لکھنے کے سوا ہر قسم کی آزادی تھی۔ بارہ بجنے میں ایک منٹ رہ گیا تو میں کھانے کے کمرے کی طرف چلا۔

لمبی چوڑی میز پر کھانا چُن دیا گیا تھا۔ میری نظریں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑ گئیں۔ اتنی ساری چیزیں بیک وقت سامنے دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا اور میں حیران تھا کہ یہ ایک آدمی کا کھانا ہے یا دس کا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے، میرے علاوہ اور لوگ بھی کھانے میں شریک ہوں، اور میں کونے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی ایک وردی باز بیرا آ کر میرے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ میں نے سر نیہوڑا کر دیکھا تو وہ بھی تقریباً "بن مانس" کی عمر کا تھا اور قد و قامت سے بھی ویسا ہی لگتا تھا۔ اُس کی بھی داڑھی مونچھ صاف اور سر مُنڈا ہوا تھا۔ میں انگلیوں کے پوروں سے آہستہ آہستہ میز بجاتا ہوا دوسرے لوگوں کا انتظار کرنے لگا۔ پانچ، دس، پندرہ منٹ گزر گئے، کوئی نہ آیا۔ مجھے نوکروں سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی لیکن یہ بات بڑی اہم تھی اور پھر میں نے اپنی ڈیوٹی شروع بھی نہیں کی تھی، اسلئے میں نے بیرے سے پوچھا۔

"پروفیسر صاحب کہاں ہیں؟" وہ ناک کی سیدھ میں دیکھتا رہا۔ میں اُٹھ کر اُس کے پاس گیا اور اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بھئی، پروفیسر صاحب نہیں آ رہے ہیں کیا۔؟" وہ اِسی طرح بُت بنا سامنے کی طرف دیکھتا رہا، جیسے انسان نہیں کوئی مشینی مجسمہ ہو۔ میں جھنجھلا گیا اور دل میں پروفیسر کو بُرا بھلا کہتے ہوئے میز پر بیٹھ گیا۔ مجھے غصہ آ رہا تھا کہ ایسی بھی کیا پابندی کہ کوئی کسی سے اشد ضروری بات بھی نہ کر سکے۔ اگر خدانخواستہ میں بیمار پڑ گیا یا مجھے اور کوئی کام پڑ جائے تو میری کہاں شنوائی ہو گی! خواہ کیسی ہی ایمرجنسی ہو، پہلے اپنے کمرے میں جانا پڑے گا اور وہاں گھنٹی کا بٹن دبانا پڑے گا۔ جانے نوکر کب آئے اور میری بات پر کب اور کیسے عمل کرے، کھانا کھاتے ہوئے میں نے تہیّہ کر لیا کہ پروفیسر سے کم از کم اتنی رعایت کے لئے ضرور بات کروں گا کہ بوقتِ ضرورت ملازموں سے سرکاری حیثیت میں بات تو کر سکوں۔ کھانا بے حد لذیذ تھا اور اس میں کئی چیزیں تھیں۔ میں نے ڈٹ کر کھایا اور ڈکاریں لیتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

پیٹ بھر جانے سے مجھ پر غنودگی طاری تھی یا مرغن کھانے کا اثر تھا، لیکن مجھے ڈیوٹی دینی تھی۔ میں نے سوچا کہ چائے کی ایک پیالی مل جائے تو کیا بات ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ بیرے کو کس طرح چائے لانے کے لئے کہا جائے۔ میں اِسی حیص و بیص میں تھا کہ میز کے ایک کونے پر رکھے ہوئے لکھنے کے پیڈ اور اس کے ساتھ ڈور سے بندھی ہوئی پنسل پر نظر پڑی۔ میں جلدی سے اس کی طرف بڑھا لیکن اچانک رُک گیا۔ لکھوں تو کس زبان میں۔؟ میں نے نظر اُٹھا کر بیرے کو دیکھا۔ وہ اِسی طرح بُت بنا کھڑا تھا۔ عجیب نامعقول آدمی ہے، میں نے دل میں کہا اور اسی لمحے اُسکے لئے خطاب "گوریلا" تجویز کر لیا اب ایک صاحب تو بن مانس تھے اور دوسرے گوریلا۔ جانے اب کتنے بندروں سے پالا پڑنا تھا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے انگریزی میں طبع آزمائی کی ٹھانی اور پنسل اُٹھا کر جلی حروف میں "ٹی" لکھ دیا۔ میرے لکھنے کی دیر تھی کہ گوریلا مشینی انسان کی طرح پیڈ کی طرف آیا، جُھکا، پڑھا اور اسی انداز سے دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو، گوریلا انگریزی تو پڑھ ہی لیتا ہے۔!

کوئی پانچ منٹ بعد گوریلا ایک بڑی سی ٹرے اُٹھائے آیا، اُس میں چائے کے سامان کے علاوہ بسکٹ وغیرہ بھی رکھے تھے میں نے خوب تیز چائے کی دو پیالیاں پیں۔ اور بدن میں چُستی محسوس کرتے ہوئے

باہر راہداری میں آیا۔ سامنے ہی باورچی خانہ تھا۔ میں نے شیشے کے دروازے میں سے اندر جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن پلائی ووڈ کا پارٹیشن حائل تھا اور میں اندر کی دنیا کو دیکھ نہ سکا۔ اب میں ڈرائنگ روم میں گیا کیونکہ باہر نکلنے کا وہیں سے راستہ تھا۔ پروفیسر ڈرائنگ روم میں بھی نہیں تھا شاید اپنے کمرے میں ہوگا' میں نے سوچا اور شیشے کا دروازہ کھول کر باہر نکلا'

دھوپ پوری تمازت کے ساتھ پھیلی ہوئی تھی اور ہر سو سکوت کا پہرہ تھا۔ پہلے میں پھاٹک کے پاس گیا۔ وہ بند تھا۔ یہاں سے اطمینان کر کے میں پھولوں کے تختوں کے درمیان آہستہ آہستہ چلتا ہوا گھاس کے اُس پلاٹ پر پہنچا جس کے تحفظ کے لئے مجھے یہ ناقابلِ یقین اعزاز ملا تھا۔ پلاٹ کے کنارے کھڑے ہو کر میں نے گھاس کو غور سے دیکھا تو جانے اس میں کیا خصوصیت اور انفرادیت محسوس کی کہ مبہوت سا ہو کر رہ گیا میری نظریں اِن خصوصیت اور انفرادیت کو تلاش کر رہی تھیں اور میں صرف اتنا دیکھ سکا کہ وہ نہایت ملائم تھی اور حبشی کے بالوں کی طرح ایسی گھنگھریالی تھی کہ ایک پتی بھی سیدھی کھڑی نہیں تھی۔ اُسے اس نفاست سے تراشا گیا تھا کہ تقریباً سو مربع فٹ میں کہیں بھی تھوڑی سی اونچ نیچ نہیں تھی۔ قطعی یکسانیت تھی' جیسے ہلکے سبز رنگ کا ایک ساکت دریا۔ ہوا کی سُبک خرامی سے میرے لمبے لمبے بال ہلکے ہلکے اڑ رہے تھے لیکن گھاس میں قطعی جنبش نہیں تھی' جیسے پتیاں نہیں لوہے کی کیلیں گڑی ہوں۔ دوسری خصوصیت گھاس کا رنگ تھا۔ اُس کے مڑے ہوئے سرے گہرے سبز تھے' درمیان میں بل کے قریب رنگ ہلکا سبز تھا اور جڑ قدرے سُرخی مائل تھی۔

اِس رنگ اور وضع قطع کی گھاس کا ہونا کوئی عجوبے کی بات نہیں تھی۔ غیر ملکوں میں بڑی عجیب و غریب قسم کی گھاس ہوتی ہے۔ لیکن نظر آنے والی خصوصیات کے باوجود میں اس کی انفرادیت کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ میری سوچ کا دائرہ وسیع تر اس لئے بھی ہو رہا تھا کہ پروفیسر اسے اتنی غیر معمولی اہمیت دے رہا تھا' لہٰذا اس بظاہر عام گھاس کی انفرادیت بلا وجہ نہیں ہو سکتی تھی۔ میں اسی سوچ میں غلطاں پلاٹ کے چاروں طرف گھومنے لگا اور جس زاویئے سے بھی دیکھا' گھاس کے رنگ اور اُس کی بناوٹ میں بال برابر فرق نہ پایا۔ معاً میری نظریں پائپ' نلکے کی ٹونٹی یا ربڑ کی نلکی کو تلاش کرنے لگیں جس سے گھاس سیراب کی جاتی ہو۔ آخر اسے پانی دینا تو ضروری تھا لیکن پلاٹ کے چاروں کناروں پر ایسی کوئی چیز دکھائی نہ دی اِس سے میں شش و پنج میں پڑ گیا کہ آبیاری کس طرح کی جاتی ہوگی۔ یہ تو ہونے سے رہا کہ گھاس پانی کے بغیر زندہ ہو' پھر اس کے کسی حصے پر زردی یا خشکی کا نام و نشان نہ تھا۔ ایسی سرسبزی تو صرف باقاعدہ کھاد اور مستقل آبیاری سے ہی ممکن تھی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے پانی دینے کے بعد نلکی اُٹھا کر کہیں رکھ دی جاتی ہو۔ یہ کیا ضروری ہے کہ ہر وقت پلاٹ میں پڑی رہے۔ اس خیال سے میں نے پلاٹ کے آس پاس نلکہ تلاش کیا لیکن سارے احاطے میں نلکہ کہیں نہ تھا۔ پھر میں کمروں کی اس دیوار کے پاس گیا جو پلاٹ کے بالمقابل تھی۔ پلاٹ کے بالکل سامنے لیبارٹری تھی' لیکن ساری دیوار میں نہ کوئی ٹونٹی تھی نہ پانی آنے کا کوئی اور ذریعہ تھا اب صرف ایک صورت رہ گئی تھی کہ پلاٹ میں مشک کے ذریعے پانی دیا جاتا ہوگا۔ اس کا کوئی وقت مقرر ہوگا۔ چلو یہ بھی دیکھ لیں گے۔ میں نے خود کو تسلی دی اور اِس طرح اکڑ اکڑ کر گھومنے لگا جیسے فوج کے کسی اہم ہیڈ کوارٹر یا اسلحہ خانے کی حفاظت پر مامور ہوں۔

سارے احاطے میں ایک ایک سرے پر سفید پتھر کی صرف ایک بنچ تھی۔ میں جا کر ایک پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ پروفیسر سے کتابوں اور رسائل کا مطالبہ ضرور کروں گا' ورنہ اِس طرح تو وقت کٹنے سے رہا۔

بیکار بیٹھے بیٹھے مجھے جمائیاں آنے لگی تھیں' چنانچہ پھر اُٹھ کھڑا ہوا اور کوٹھی کا چکر لگانے لگا۔ سنسان جگہ' کسی ذی روح کا گزر تک نہیں' تنہائی اور مصروفیت کا کوئی سامان نہیں۔ اِس کیفیت سے میں پریشان ہو گیا۔ یہ تو ابھی پہلا دن تھا' آغاز میں یہ حالت ہے تو یہ نوکری کیسے ہوگی! انسان کھانے پینے اور سونے کے علاوہ اور باتوں کا بھی تو محتاج ہے! جسم کی آسائش کے ساتھ ذہنی مصروفیت بھی لازمی ہے محض آرام سے تو اکتاہٹ ہو جاتی ہے۔ اس بوریت سے بیکاری بھلی تھی۔ کیا میں ملازمت چھوڑ دوں؟ لیکن ہزار روپے اور یہ ٹھاٹھ باٹھ کہاں ملیں گے؟ کیوں نہ حالات سے مفاہمت کی کوئی صورت نکالوں تاکہ عیش و آرام بھی ہاتھ سے نہ جائے اور ذہنی سکون بھی میسر رہے۔ اِس فتنۂ تنہائی سے چھٹکارہ ملے ۔۔۔ اس کے لئے پروفیسر سے بات کرنی ہی ہوگی۔ ہو سکتا ہے وہ مجھے لیبارٹری میں اپنے ساتھ لگا لے۔ اُس کا وقت بھی کٹے گا اور میری معلومات میں اضافہ بھی ہوگا۔ لیبارٹری میں کام کرنے سے ایک تجربہ ہاتھ آ جائے گا جس سے میں زندگی میں کبھی نہ کبھی فائدہ اٹھا سکتا ہوں یہ تجربہ ہر کس و ناکس کو نہیں ملتا۔ میرے لئے خدا کی دین ثابت ہوگا۔

اب سوال تھا کہ پروفیسر سے کہاں اور کب ملا جائے؟ دوپہر کے کھانے پر اُس سے ملنے کی توقع تھی لیکن وہ غائب رہا۔ ہو سکتا ہے شام کی چائے یا رات کے کھانے پر اس سے ملتا ہو۔ تب اُس سے کہوں گا کہ مجھ سے لیبارٹری میں بھی کوئی کام لے۔ اس سے معاہدے کی رُو سے موجودہ ڈیوٹی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا یہ وعدہ رہا۔ اب پانچ بجے تک اس کا انتظار کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ میں پھر بنچ پر جا بیٹھا اور علاجِ تنہائی کے لئے فلمی گانوں کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ کچھ دیر

بعد گلے نے میری مدد کرنے سے انکار کر دیا اور میں اونگھنے لگا۔ غنودگی سے چونکا تو پانچ بج کر دس منٹ ہو گئے تھے۔ جلدی سے اُٹھا اور بھاگم بھاگ کھانے کے کمرے میں گیا۔ پروفیسر نہیں آیا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھ کر گوریلا صاحب کی راہ دیکھنے لگا۔ چند سیکنڈ بھی نہ گزرے کہ وہ ٹرے اُٹھائے آگیا۔ چائے کے ساتھ کیک، پیس بسکٹ، تلے ہوئے آلو کے پتلے پتلے قتلے، دو سیب اور چار کیلے تھے۔ اُس نے ساری چیزیں میرے سامنے رکھ دیں اور حسبِ سابق میری پُشت پر آکھڑا ہوا۔ میں نے چائے بنائی، کیک کا ایک پیس اور آلو کے چند قتلے کھائے اور مزے مزے سے عمدہ چائے کی چُسکیاں لینے لگا۔ ہائے، کیا شاندار زندگی ہے۔ اگر میرے دوستوں کو اس کا علم ہو جائے تو حسد کے مارے مر ہی جائیں۔ جب میں بعد میں انہیں بتاؤں گا تو وہ یقین تھوڑا ہی کریں گے! بالکل شاہزادوں کی طرح زندگی ہے... لیکن! چائے پینے کے بعد آٹھ بجے تک اور اس کے بعد بارہ بجے تک کیا کروں گا۔۔؟ تنہائی اور بیکاری کے وحشت ناک تصوّر سے مجھے اچھو ہو گیا اور چائے میری نفیس اور قیمتی یونیفارم پر گر گئی۔ گوریلا صاحب جلدی سے آگے بڑھے اور انہوں نے کاندھے پر رکھی ہوئی صافی سے پہلے میری یونیفارم اور پھر میز صاف کی۔ اس کے بعد پھر اُسی طرح بت بن کر کھڑے ہو گئے۔!

ساڑھے پانچ بج گئے تھے اور پروفیسر کے آنے کی توقع ختم ہو چکی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ خود جا کر اُس سے ملوں گا۔ تیزی سے کھانے کے کمرے سے نکلا اور میرے قدم اُس کے کمرے کی طرف اُٹھنے لگے۔ میں نے کمرے پر ہلکی سی دستک دی، پھر قدرے زور سے اور تیسری دستک زیادہ زور سے لیکن دروازہ نہ کھلا۔ مجھے خیال آیا کہ وہ لیبارٹری میں ہو گا اور میں وہاں پہنچا۔ اُس پر بھی کئی بار دستک دی لیکن وہ بھی نہ کھلا۔ میں پیچ و تاب کھانے لگا کہ یا معبود! کس مصیبت میں جان پھنس گئی ہے۔ معاً مجھے اپنے کمرے کی گھنٹی کا خیال آیا کہ اُسے بجا کر ملازم یعنی اس بن مانس کو بلاؤں اور اس کے ذریعہ پروفیسر کو پیغام بھیجوں۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچا اور گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ اُسی وقت مجھے خیال آیا کہ پیغام بھجواؤں گا کس طرح! کاغذ ہے نہ قلم اور بن مانس بقول پروفیسر بہرا اور گونگا ہے۔ میں اسی فکر میں تھا کہ بن مانس منہ اُٹھائے آ پہنچا اور یہ دیکھ کر میں حیرت میں رہ گیا کہ اُسکے ایک ہاتھ میں شارٹ ہینڈ کی نوٹ بک کی طرح کا پیڈ اور دوسرے میں پنسل تھی۔ میرے منہ سے پروفیسر کی فراست اور اُس کے حُسنِ انتظام پر بے ساختہ داد نکل گئی۔ میں نے بن مانس کے ہاتھوں سے دونوں چیزیں لیں اور لکھا۔ محترم پروفیسر صاحب! میں آپ کی عنایات کا بے حد شکر گزار ہوں اور انہیں اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں، البتہ میری ایک تکلیف آپ کی نظرِ کرم کی محتاج ہے۔ میں تنہائی کا شدید شکار ہوں اور وقت کاٹے نہیں کٹتا ہے۔ آپ نے اخبارات اور کتابوں، رسائل کا وعدہ فرمایا تھا۔ ازراہِ کرم چند رسائل اور کتابیں عنایت کیجئے۔ ایک اور درخواست ہے کہ مجھ سے لیبارٹری میں بھی کوئی کام لیجئے تاکہ میرا ذہن کسی طرف لگا رہے۔ اس کام سے میری ڈیوٹی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اور میں نہایت تندہی اور جانفشانی سے معاہدے پر عمل کرتے ہوئے اپنے فرائضِ منصبی انجام دوں گا۔!

میں نے پیڈ اور پنسل بن مانس کو لوٹا دی اور اُس کے جانے کے بعد نرم و گداز بستر پر نیم دراز ہو کر پروفیسر کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ چند منٹ گزرے تھے کہ وہ خود آموجود ہوا۔ میں اُسے دیکھ کر ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سیدھا آکر میرے روبرو کھڑا ہو گیا اور اُس کی نظریں میرے چہرے پر پیوست ہو گئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے گرم گرم برمے سے میرے چہرے میں سوراخ ہوئے جا رہے ہیں۔ کھوپڑی میں جیسے کوئی چیز اُبل رہی ہے اور دل پر گرم گرم رطوبت کا غلاف سا چڑھتا جا رہا ہے۔ میں اُس کی نظروں کی تاب نہ لا کر فرش کو دیکھنے لگا جیسے کوئی پناہ گاہ ڈھونڈ رہا ہوں۔

"مسٹر!" اُس کی بھاری آواز کے تیر میرے کانوں پر سے سنسناتے ہوئے گزر گئے "تم نے معاہدے کی خلاف ورزی شروع کر دی ہے، پہلی بات، تم نے لیبارٹری کے دروازے پر زور زور سے دستک دے کر میرے کام میں مخل ہونے کی کوشش کی اس سے میرے کام میں رخنہ پڑا۔ دوسری بات، تم شام کی چائے پر دس منٹ تاخیر سے پہنچے۔ تیسری بات، تم نے کھانے کے کمرے میں ملازم سے بات کرنے کی کوشش کی اور چوتھی بات یہ کہ اب ڈیوٹی کے اوقات میں کمرے میں آبیٹھے ہو۔ آج پہلا دن ہے، اس لئے تمہاری کوتاہی کو معاف کرتا ہوں ورنہ معاہدے کی رُو سے تم سزا کے مستحق ہو۔ جہاں تک تمہارے بور ہونے کا تعلق ہے، یہ میری ذمے داری نہیں ہے۔ تم نے سوچ سمجھ کر اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ معاہدے کی رُو سے تم جتنے اخبار، رسائل اور کتابیں چاہو، لے سکتے ہو۔ مجھے ان کی فہرست بنا کر دے دو۔ کل سب چیزیں مل جائیں گی۔ اِس کے علاوہ۔ انسانی ہمدردی کے تحت۔ محض انسانی ہمدردی کی بنا پر ـــ میں نے تمہارے دل بہلانے کا سامان کر لیا ہے۔ اور وہ تمہیں آج رات بارہ بجے کے بعد کسی وقت بھی مل جائے گا۔ اب تمہیں اپنے حواس کو قابو میں اور اعصاب کو مضبوط رکھنا ہو گا۔ یہ نہ بھولو کہ معاہدے کی رُو سے گھاس کی حفاظت اور میری زندگی کا تحفظ تمہاری ذمے داری ہے اگر گھاس پر یا مجھ پر ذرا بھی آنچ آئی تو۔۔ اپنا انجام خود سوچ سکتے ہو۔ اگر تم ملازمت چھوڑنا چاہو تو مجھے اعتراض نہیں ہے لیکن بغیر بتائے بھاگنے کی کوشش میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ کوئی ذی روح میری مرضی کے

بغیر پھاٹک سے باہر نہ نکل سکتا ہے نہ دیوار پر سے کود سکتا ہے۔ اِن میں ایسے خفیہ سائنسی آلات نصب ہیں جو تمہارے جسم کو لمحوں میں راکھ کا ڈھیر بنا دیں گے (میں تھرّا اٹھا) اب آخری اور سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ تم نے لیبارٹری کا نام لیا ہے۔ یہ لفظ آئندہ تمہاری زبان پر تو کیا تمہارے ذہن میں بھی نہ آئے۔ اگر مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑے گی تو میں تمہیں بلا لوں گا۔ اب جاکر ہوشیاری سے اپنی ڈیوٹی دو۔" یہ کہہ کر پروفیسر جانے کے لئے مڑا۔ لیکن دروازے کے پاس پہنچ کر رکا اور پلٹ کر بولا۔

"ملازمت چھوڑنی ہو تو بتا دینا' تاکہ میں دوسرے آدمی کا انتظام کروں۔"

میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکلا۔ وہ لیبارٹری کی طرف گیا اور میں ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا۔ باہر نکلا تو موسم بے حد خوشگوار تھا۔ مطلع قدرے ابر آلود تھا اور ٹھنڈی ہوا کے فرحت بخش جھونکے چل رہے تھے۔ مغرب ہونے میں ابھی کافی دیر تھی اور سورج لحظہ لحظہ زمین کو الوداع کہہ رہا تھا۔ میرے کانوں میں پروفیسر کے حکم' انتباہ اور دھمکی کی صدائے بازگشت گھوم رہی تھی۔ پہلے تو میں نے اُس کے اِن الفاظ پر غور کیا کہ میرے دل بہلانے کا سامان رات بارہ بجے کے بعد کسی وقت بھی مل جائیگا یہ ایسی کیا چیز ہوگی؟ ہو سکتا ہے ریڈیو یا ٹی وی ہو' میں نے بے دلی سے سوچا۔ اس کے بعد پھاٹک اور دیوار کے بارے میں اُس کا کہا ذہن میں کلبلانے لگا۔ کتنا خطرناک شخص تھا یہ پروفیسر! اُسے اپنی گھاس اور اپنی جان کی حفاظت کے لئے ایسے خطرناک حربوں کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ کیا اُس کی گھاس اور زندگی کو کسی دشمن سے خطرہ ہے؟ ہاں' یہی بات ہوگی' ورنہ وہ مجھے ریوالور نہ دیتا۔ تو کیا مجھے بھی اُس کی گھاس اور زندگی کے لئے جان کی بازی لگانی ہوگی؟ اُسے بچاتے بچاتے اگر میں بھی جان سے گیا تب؟ پھر کیا میں ملازمت چھوڑ دوں؟ نہیں ـــ پروفیسر خبطی آدمی ہے۔ ایسے لوگ ساری دنیا کو اپنا حریف اور دشمن سمجھ بیٹھتے ہیں' حتیٰ کہ اپنے سائے سے بھی خائف رہتے ہیں ـــ مجھے کسی وہم میں نہیں پڑنا چاہیئے۔ خوف زدہ نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ ہزار روپے ـــ! یہ عیش و آرام ـــ! کہاں ملیں گے' کون دے گا؟

کچھ دیر بعد اندھیرا چھانے لگا اور میرے سامنے ایک نیا مسئلہ سر اُٹھانے لگا کہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنی پڑیں گی۔ معاً مجھے ٹارچ کا خیال آیا اور میں جلدی سے اُسے الماری میں سے نکال لایا۔ سات بجکر پچاس منٹ تک بڑی تندہی سے کوٹھی کے چکر لگاتا رہا اور ٹھیک وقت پر کھانے کے کمرے میں جا پہونچا۔ مجھے اس گوریلا سے بھی خوف آنے لگا تھا۔ اسی کمبخت نے پروفیسر کو بتایا ہوگا کہ میں شام کی چائے پر دس منٹ کی تاخیر سے پہنچا تھا اور اُس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ شخص خطرناک حد تک پروفیسر کا وفادار تھا اور اس سے احتیاط لازمی تھی۔ عشائیہ بھی شاہانہ قسم کا تھا۔ انواع و اقسام کی چیزیں تھیں اور میں فیصلہ نہ کر سکتا تھا کہ کسے ہڑپ کروں اور کسے چھوڑوں۔ خیر میں نے ہر چیز کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کی اور کھا چکا تو مجھ سے اُٹھا نہ جاتا تھا۔ کھانے سے فارغ ہوا تو گوریلا کافی لایا۔ بڑی مزے دار تھی۔ کافی کی خالی پیالی میز پر رکھ کر میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اب میری آج کی ڈیوٹی کے چار گھنٹے رہ گئے تھے۔

یہ چار گھنٹے میں نے متواتر گھومنے میں گزار دیئے۔ لیبارٹری اور کمروں کی روشنی روشندانوں سے چھن چھن کر باہر آرہی تھی جس سے زندگی کی ہماہمی کا قدرے احساس ہوتا تھا۔ ورنہ اس بھیانک سناٹے میں وحشت کے سوا اور کیا مل سکتا تھا؟ اب مجھے احساس ہوا کہ پروفیسر اتنا گھبراتا کیوں ہے؟ کئی میل تک آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ کوٹھی کے سر پر مہیب جنگل تھا۔ کوٹھی میں اُس کے اور گونگے بہرے دو ملازموں کے سوا چوتھا فرد نہیں تھا۔ اُس کی لیبارٹری میں یقیناً لاکھوں روپے کی مالیت کا سامان ہوگا' ایسے میں کوئی آدمی ڈرے گا نہیں تو کیا کرے گا؟ چور ڈاکو بڑی آسانی سے نہ صرف کوٹھی کا صفایا کر سکتے تھے بلکہ خود اسے بھی دوسری دنیا میں پہنچا سکتے تھے۔ لیکن ـــ اُسے گھاس کی اپنی جان کی طرح فکر کیوں تھی؟ کیا اُس کی جان کی قیمت اور گھاس کا مول برابر تھا ـــ؟

جوں توں کر کے بارہ بجے اور میں پروفیسر کے چیر پھاڑ کرنے والے خونخوار کتوں کے خوف سے کوٹھی میں بگٹٹ بھاگا۔ اپنے کمرے میں جا کر یونیفارم اُتاری' الماری سے نیا سلیپنگ سوٹ نکالا اور اُسے پہن کر بستر پر لیٹ گیا۔ کمرے میں ایک تیز روشنی کا بلب جل رہا تھا اور اُس کا سوئچ میرے سرہانے دیوار میں لگا تھا۔ میں ہاتھ بڑھا کر لیٹے لیٹے بتی بجھا سکتا تھا لیکن جلد نیند آنے کی توقع نہیں تھی کیونکہ ایک خیال ذہن کو ستائے جا رہا تھا۔ بارہ بجے کے بعد کسی وقت بھی مجھے اپنا دل بہلانے کے لئے کیا سامان ملنے والا ہے۔ اِس میں پروفیسر کی کوئی چال تو نہیں ہے؟ مجھ سے دھوکا تو نہیں کیا جا رہا ہے؟ لیکن ایسا کرنے کی وجہ بھی کیا ہو سکتی تھی! پروفیسر نے اپنی مرضی سے مجھے اتنی شاندار ملازمت دی تھی اور جب چاہے مجھے برخاست کر سکتا ہے۔ اگر میں بھی چاہوں تو ملازمت چھوڑ سکتا ہوں' پھر ہیرا پھیری کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے! اِس بات سے مجھے تسکین سی ملی اور یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ جلد نیند نہیں آئے گی۔ کیونکہ میرے پپوٹے بوجھل ہونے لگے تھے۔

مجھ میں ایک خاص بات یہ ہے کہ خواہ کتنی ہی گہری نیند میں کیوں

نہ ہوں گا، معمولی سے کھٹکے اور ذرا سی آہٹ پر آنکھ فوراً کھل جاتی ہے میں نے اپنی اسی عادت پر اعتماد کرکے یہ ملازمت قبول کی تھی اور اسی عادت کی بنا پر اُس رات بھی میری آنکھ کھل گئی۔ دروازہ کسی نے خاصی آواز کے ساتھ کھولا تھا۔ میں نے سر گھما کر دیکھا اور گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ سر سے پاؤں تک سیاہ چادر میں لپٹی ایک لڑکی کمرے میں داخل ہو کر آہستہ آہستہ چلتی میری طرف آرہی تھی۔ بلب کی تیز روشنی میں اُس کا حسین چہرہ دمک رہا تھا اور کالے لباس میں نور اور بھی نکھر آیا تھا۔ میں نے جلدی سے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ایک بج کر چالیس منٹ ہو رہے تھے۔ میں اپنے دل کی دھڑکن کو صاف سُن سکتا تھا اور سر سے پاؤں تک پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ یہ کوئی انسان نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ بالکل ایک کھمبے کی طرح پلک جھپکائے یا بدن کو جنبش دیئے بغیر میرے قریب آرہی تھی۔ اُس کی نظریں میرے چہرے پر گڑی تھیں اور ہونٹوں پر نہ مُسکراہٹ تھی نہ سنجیدگی۔ جانے وہ رنجیدہ تھی یا خوش۔!

میرا ہاتھ جلدی سے سرہانے کی طرف گیا اور میں نے پھرتی سے تکیے کے نیچے سے ریوالور نکال لیا۔ ریوالور دیکھ کر اُس کے خوبصورت چہرے پر گھبراہٹ اور خوف کے نیلے سائے رینگ گئے۔ ہونٹ پھڑپھڑانے لگے جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو اور اُس نے چادر میں سے دونوں سفید سفید ہاتھ نکال کر سامنے کر دیئے، جیسے گولی سے بچاؤ کر رہی ہو۔ اُسے اِس حالت میں دیکھ کر میرا خوف جاتا رہا۔ میں تو اُسے کوئی بدروح سمجھ بیٹھا تھا۔ میں نے ریوالور نیچے کر لیا اور اُسے غور سے دیکھا۔ میری پہلی نظر نے مجھے دھوکا نہیں دیا تھا، وہ واقعی حسین کہلانے کی مستحق تھی۔ لیکن کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ میرے کمرے میں کیوں آئی تھی؟ کیا اِس کوٹھی میں رہتی ہے؟ بن مانس یا گوریلا میں سے کسی کی لڑکی ہے؟ پروفیسر کی رشتے دار ہے؟ میں ان سوالوں کی زنجیر میں اُلجھ کر رہ گیا۔ میں پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا اور وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ اب اُس کی نظروں میں خوف کی جگہ بے تکلفی کی جھلملاہٹ تھی اور ہونٹوں نے مُسکراہٹ اور سنجیدگی میں سے پہلی چیز کو منتخب کر لیا تھا۔ گویا اُسے اطمینان ہو گیا تھا کہ میں اُسے گولی نہیں ماروں گا۔ یا اُس سے متاثر ہو گیا ہوں۔

"کون ہو تم؟ یہاں کیوں آئی ہو؟" میں نے خود پر قابو پا کر پروفیسر کے محافظ کی حیثیت سے پوچھا۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا اور اُس کی مُسکراہٹ زیادہ جاندار ہو گئی جس سے وہ اور زیادہ حسین لگنے لگی۔

"تم جواب کیوں نہیں دیتیں؟" میں نے قدرے جھلا کر کہا۔ وہ پھر بھی کچھ نہ بولی اور اپنی سیاہ چادر جسم پر سے اُتار کر کرسی پر پھینک دی۔ اُس نے پنڈلیوں سے اونچا ہلکے نیلے رنگ کا نائٹ گاؤن پہن رکھا تھا۔ میری نظر پہلی مرتبہ اُس کے پیروں پر پڑی۔ اس میں اسفنج کے سلیپر تھے۔ گاؤن اور سلیپر سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کہیں باہر سے نہیں آئی تھی اور اسی کوٹھی میں رہتی ہے۔ اب یہ معلوم کرنا رہ گیا تھا کہ وہ کس کی عزیزہ تھی۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے کرسی پر بیٹھنے کو کہا اور وہ بیٹھ گئی۔ مجھے سُوجھ نہیں رہا تھا کہ بات کا آغاز کہاں سے کروں۔ اُس کے رویّے سے ظاہر تھا کہ وہ مجھ سے واقف تھی، لیکن اِس وقت اُس کا یہاں آنا۔ رات، تنہائی، اجنبی مرد۔ یہ کیا معاملہ ہے!۔ معاً پروفیسر کے الفاظ میرے کانوں میں گونجے۔ "میں نے تمہارے دل بہلانے کا سامان کر لیا ہے اور وہ تمہیں رات بارہ بجے کے بعد کسی وقت مل جائے گا" اور اب ایک بج چکا تھا،

"تمہیں پروفیسر صاحب نے بھیجا ہے؟" میں نے لڑکی سے پوچھا۔ وہ جواب میں صرف مُسکرا دی۔ تو یہ بات ہے! میں نے دل میں کہا۔

بدقسمتی سے میں اِس قماش کا آدمی نہ تھا۔ مجھے صرف ایک ہی چیز کا شوق بلکہ خبط تھا، ایک نامور انٹیلیجنٹ بننے کا۔ میں نے بڑی ریاضت سے اپنے جسم کو سنوارا تھا اور میرے کسرتی، طاقتور جسم پر کئی لڑکیاں فریفتہ ہو چکی تھیں لیکن میں نے کسی کو اپنے قریب پھٹکنے نہ دیا۔ اس وقت مجھے پروفیسر کی ذہنیت پر تاؤ آرہا تھا۔ آخر اُس نے مجھے کیا سمجھ رکھا تھا! جی میں آیا کہ ابھی جا کر اُس کا گریبان پکڑ لوں اور۔۔ لیکن اُس کا بھی کیا قصور تھا! کیا میرے ماتھے پر لکھا تھا کہ اس صحتمند خوش شکل اور اپٹوڈیٹ نوجوان کے پھن بُرے نہیں ہیں؟ اس زمانے میں؟ ایسے ماحول میں؟ اب سوال یہ رہ گیا تھا کہ لڑکی کون ہے؟

"تم پروفیسر صاحب یا کسی اور کی عزیزہ ہو؟" میں نے اب بدلے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ اس بار بھی لڑکی صرف مُسکرا دی، اُس کی مُسکراہٹ بڑی دلپذیر تھی لیکن میں ان دونوں مُسکراہٹوں سے جھنجھلا گیا آخر یہ بولتی کیوں نہیں؟ مانا کہ میرے دل میں اس کے لئے کوئی بُرا خیال نہیں تھا لیکن بات کرنے کے لئے کوئی ملا تو تھا، وہ بھی ایک حسین لڑکی! یہاں رہ کر تو خود میرے گونگے بن جانے میں کوئی کسر نہیں رہے گی! میں نے اُسے اپنے قریب بلایا اور وہ ایک ادا سے اُٹھی۔ میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا اور وہ پلنگ سے نیچے پاؤں لٹکاتے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے کھیلنے لگی۔

"کیا نام ہے تمہارا۔؟" میں نے پیار سے اُس کے سُنہری بالوں پر ہاتھ پھیرا، لیکن وہ بدستور سر جھکائے بیٹھی رہی۔

"کوئی بات تو کرو۔ کچھ تو بولو۔ اگر بات نہیں کرنی تھی تو میرے کمرے میں آئی کیوں تھیں۔؟" میں نے اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا۔

اُس نے سر گھما کر میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا لیکن پھر بھی نہ بولی۔ اب تو میری جھلاہٹ قابو سے باہر ہوگئی اور میں دوزانو بیٹھ گیا۔

"کیا تم گونگی ہو، بہری ہو؟" میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے ہونٹوں اور کانوں کو چھُو کر قدرے چلا کر کہا۔ اُس کی نظریں میرے ہاتھوں پر۔ دوڑتی ہونٹوں اور کانوں پر پہنچیں اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کیا یہ بھی گونگی اور بہری ہے؟ اتنی حسین لڑکی اور قدرت کا یہ کھیل! مجھے اِس المیئے پر رونا سا آ گیا۔ جانے کس جذبے سے میں نے اُسے لپٹا لیا۔ وہ جیسے اِس بات کی منتظر تھی، مجھ سے یوں چمٹ گئی جیسے اُس کی زندگی کا یہی مقصد رہ گیا ہو۔ میں نے لیٹ کر اُس کا سر اپنے سینے پر رکھ لیا اور اس کے ریشم جیسے نرم بالوں سے کھیلنے لگا، اور کھیلتے کھیلتے سو گیا۔

صبح آنکھ کھلی تو چھ بج رہے تھے۔ جانے وہ لڑکی کب اُٹھ کر چلی گئی تھی۔ کون تھی؟ اب دوبارہ بھی آئے گی یا نہیں؟ اگر نہیں آئے گی تو میں اُسے کہاں تلاش کروں گا؟ اُسے تلاش کرنا بے حد ضروری ہو گیا تھا۔ میں اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ میں ناشتہ کرنے پہنچا تو خلافِ توقع پروفیسر کو وہاں دیکھ کر چونکا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لڑکی کے بارے میں

جس کا انتظار تھا

اے ایس صدیقی کی

معرکۃ الآرا کتاب

ترمیم و اضافے کے بعد

اب

شائع ہو گئی ہے

دُنیا کے

۶ پُراسرار علوم

ایک کتاب میں، ۶ چھ کتابیں

- علمُ الاعداد
- دست شناسی
- تحریر سے کردار شناسی
- علم قیافہ
- علم نجوم
- رنگوں سے کردار شناسی

انتہائی آسان اور عام فہم زبان میں
متعدد خاکوں کے ساتھ

وہ سب کچھ جو آپ نہیں جانتے اور جاننا چاہتے ہیں اور وہ سب کچھ بھی، جسے جان کر آپ اپنے دوستوں کو حیران کر دیں گے۔

آج ہی آرڈر روانہ کریں۔ قیمت -/۴ علاوہ محصول ڈاک

کراچی بک ڈپو ــــ اردو بازار ــــ کراچی

ضروریات کرے گا اور میں اُسے جھاڑ دوں گا۔

"آؤ مسٹر!" اُس نے ناشتہ جاری رکھتے ہوئے کہا "اپنی پسندیدہ کتابوں اور رسائل کی فہرست بنا دو۔ وہ رہے کاغذ اور پنسل۔"

مجھے اِس بات پر حیرت نہیں ہوئی کہ اُس نے ناشتے پر میرا انتظار نہیں کیا۔ میں نے میز پر رکھا ہوا پیڈ اور پنسل اُٹھائی اور وہیں کرسی پر بیٹھ گیا۔ جلن کے مارے جتنے رسائل اور کتابوں کے نام ذہن میں آئے، لکھ مارے، کوئی پندرہ رسالے اور پچاس کے قریب کتابیں ہو گئیں۔ میں نے فہرست پروفیسر کو دی تو اُس نے اس پر ایک نظر ڈال کر اطمینان سے کہا۔ "بس!"

"جی ہاں۔" کہہ کر میں ناشتے کے لئے بیٹھ گیا۔ پروفیسر بڑی تیزی سے منہ چلا رہا تھا۔ شاید اُسے جلدی تھی۔

"لڑکی پسند آئی؟" اُس نے کاروباری لہجے میں کہا اور میرا خون کھول اُٹھا لیکن میں نے ضبط کر کے جواب دیا۔

"بے حد! آپ کی ہے۔؟" تیر نشانے پر بیٹھا اور پروفیسر نے مجھے گھور کر دیکھا، پھر نظریں ہٹا کر کھانے لگا۔

"اب تمہارا دل نہیں گھبرائے گا" اُس نے اسی کاروباری لہجے میں کہا۔

"وہ تو صرف رات کو چند گھڑیوں کے لئے آئے گی اور وہ بھی میری نیند خراب کرنے۔ دراصل پہاڑ جیسا دن گزارنا مشکل ہے۔" میں نے ڈھٹائی سے کہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میری بات سے جزبز ہوگا اور مجھے ڈانٹ دے گا۔ معاہدے کی رُو سے۔

"رات وہ پہلی بار کوٹھی میں آئی تھی۔ اب یہیں رہے گی اور تم سے دن میں بھی مل سکتی ہے۔" پروفیسر کے اِس جواب سے میں حیران رہ گیا۔

"لیکن۔" اُس نے ڈپٹ کر کہا "اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اس سے عشق لڑاتے رہو اور اپنی ڈیوٹی کو بھول جاؤ۔ تمہاری ڈیوٹی میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیئے، ورنہ۔۔"

"معاہدے کی رُو سے۔۔" میں نے اُس کی بات پوری کی اور اطمینان سے اُبلا ہوا انڈہ سالم منہ میں رکھ لیا۔

ناشتہ کر کے میں لان میں پہنچا اور ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر بعد دیکھا تو وہ لڑکی چلی آ رہی تھی اُسے دیکھ کر مجھے خوشی بھی ہوئی اور یک گونہ سکون بھی۔ وہ سیدھی میرے پاس آئی اور کھڑی ہو گئی۔ میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا اور دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ مجھے اس گونگی اور بہری سے ایک ناقابلِ بیان لگاؤ ہو گیا تھا۔ معلوم نہیں سُرخ و سپید رنگت، ستواں ناک، بڑی بڑی بھوری آنکھوں اور سُنہرے بالوں والی یہ لڑکی کس کی تھی؟ پروفیسر کے ہتھے کیسے چڑھی؟ اُس نے لڑکی کو میرے لئے بُلوایا تھا، تو کیا یہ کوئی آوارہ لڑکی تھی! ظاہر تو یہی ہوتا تھا، کیونکہ یہ بخوشی میرے پاس آئی تھی۔ کچھ بھی تھا، بہرحال مجھے اُس سے اُنسیت بھی ہو گئی تھی اور ہمدردی بھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اُس کے دل میں بھی میرے لئے جگہ پیدا ہو گئی تھی، شاید اس لئے کہ میں نے اس سے وہ سلوک نہیں کیا تھا جس کی توقع میں وہ میرے پاس آئی تھی۔

میری لڑکی سے یک طرفہ باتیں ہو رہی تھیں، کیونکہ صرف میں بول رہا تھا اور صرف میں ہی سُن رہا تھا۔ مجھے اس خبیث پروفیسر پر بڑا غصہ آ رہا تھا کہ دودھ دیا بھی تو اُس میں مینگنیاں ڈال کر۔ احسان کیا تو ایسا کہ اس سے فائدہ بھی نہ اُٹھا سکوں۔ میں لاکھ اُس سے اشاروں میں پوچھتا کہ کون ہو، کہاں سے آئی ہو۔ لیکن جواب میں اُس کی صرف وہی ایک مسکراہٹ تھی اور بس۔ وہ میرے ساتھ کوئی دو گھنٹے رہی۔ ہم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ساری کوٹھی کے بار بار چکر لگاتے رہے۔ اس کے بعد وہ چلی گئی اور میں ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔

دوپہر کے کھانے تک میں نے گھاس پر پہرہ دے کر وقت گزارا۔ اِس دوران بار بار جی چاہا کہ لڑکی کے پاس جاؤں یا اُسے اپنے پاس بُلاؤں لیکن دونوں باتیں میرے امکان سے باہر تھیں۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اُسے کس کمرے میں رکھا گیا تھا۔ کوٹھی کے سارے کمرے میری نظروں میں تھے صرف باورچی خانے میں جانے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ ہو سکتا تھا اُس میں رہائش کا بھی انتظام ہو کیونکہ بن مانس اور گوریلا آخر کہیں تو رہتے ہوں گے! شاید لڑکی اُن کے ساتھ تھی یا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ خود پروفیسر نے اُسے اپنے کمرے میں رکھا ہو۔ جب بارہ بجنے میں دس منٹ باقی رہ گئے تو میں کھانے کے کمرے کی طرف چل پڑا۔

میں کھانے کی میز پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ پروفیسر نے ہی اس لڑکی کو میرے ساتھ کھانا چاہیئے تھا۔ جب پروفیسر نے اُسے میرے لئے وقف کر رکھا تھا اور اُسے کھلے بندوں میرے ساتھ پھرنے اور اُٹھنے بیٹھنے کی آزادی دے رکھی تھی تو وہ کھانے کے کمرے میں میرے ساتھ کیوں نہ موجود ہو۔ یہ منطق کیا تھی! بہرحال پروفیسر اُلٹی کھوپڑی کا آدمی تھا۔ اُس کی باتیں میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ کھانا میز پر چُنا جا رہا تھا کہ میرا ہاتھ اپنی پیٹی پر گیا اور میں نے دیکھا کہ ریوالور نہیں ہے۔ میں گھبرایا کہ اسے کہاں گرا دیا یا رکھ دیا ہے! اس کی تو مجھے بے حد ضرورت ہے۔ اچانک خیال آیا کہ شاید لان کی بنچ پر بھول گیا ہوں۔ جلدی سے اُٹھا اور اشارے سے گوریلا کو بتایا کہ ریوالور نہیں ہے۔ ڈھونڈنے

جا رہا ہوں اور کمرے سے باہر نکلا۔ ڈرائنگ روم میں قدم رکھا ہی تھا کہ پیچھے سے پروفیسر کی آواز آئی۔ وہ کسی سے کچھ کہہ رہا تھا۔ میں نے یوں ہی پلٹ کر دروازے میں سے جھانکا اور دیکھا کہ وہ لڑکی کو لئے ہوئے لیبارٹری کی طرف جا رہا تھا۔ شاید اپنے کمرے سے نکلا تھا۔

انہیں یکجا دیکھنا کوئی اچنبھا خیز بات نہیں تھی لیکن انہیں باتیں کرتے دیکھ کر میں سکتے میں رہ گیا۔ لڑکی گونگی تھی نہ بہری۔ میں نے اسکی مہین آواز خود اپنے کانوں سے سُنی تھی اور اُسے ہاتھ ہلا کر پروفیسر سے کچھ کہتے دیکھا تھا۔ میں کچھ دل برداشتہ سالان میں گیا۔ ریوالور بیچ پر پڑا مل گیا اور میں آکر کھانا کھانے لگا۔ لڑکی کا چہرہ میری نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ اچھا! تو اسی لئے میری ہر بات کا جواب مُسکراہٹ سے دیتی تھی کیونکہ وہ میری بات سُن لیتی تھی اور میں سمجھتا رہا کہ بے چاری معذور ہے اور مُسکراہٹ اُس کی فطرتِ ثانیہ بن گئی ہے۔ گویا وہ مجھے مستقل بیوقوف بنائے جا رہی تھی۔ اُسے یہ اداکاری اس کے ہدایت کار پروفیسر نے سکھائی تھی۔ اب مجھے گوریلا اور بن مانس پر بھی شک ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ بھی اداکاری کر رہے ہوں۔!

اس کے بعد وہ مجھے نظر نہیں آئی۔ شام ہوئی اور پھر رات آئی' رات گزری تو اگلا دن نکلا۔ میں نے بھی اُس کی پرواہ نہیں کی۔ دراصل مجھے اُسکے تصور تک سے نفرت ہو گئی تھی۔ اگلے روز تک پروفیسر کی شکل بھی دکھائی نہ دی۔ شاید وہ اپنے کسی تجربے میں غرق تھا۔ اسی رات کو میں ڈیوٹی سے فارغ ہو کر لوٹا اور کپڑے تبدیل کر کے سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھُلا۔ میرا رُخ دروازے کی طرف ہی تھا' اس لئے مجھے علم ہو گیا۔ میں نے جلدی سے تکیئے کے نیچے سے ریوالور نکالا اور دونوں ہاتھ پشت پر رکھ کر کھڑا رہا۔ اتنے میں ایک لڑکی کمرے میں داخل ہو چکی تھی۔ اُس نے بھی پہلی لڑکی کی طرح ایک سیاہ چادر میں خود کو لپیٹ رکھا تھا اور اُسی کی طرح میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُس کے پاس گیا' اور دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ راہداری میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ پہلی بار میں نے ایسا کیا تھا۔ اس کے بعد میں نے لڑکی کو غور سے دیکھا۔ یہ پہلی لڑکی جیسی حسین نہیں تھی تاہم اسے بھی حسین کہا جا سکتا تھا کھلتا ہوا رنگ' سیاہ بڑی بڑی آنکھیں' سیاہ لمبے بال' ترشیدہ ہونٹ' ناک البتہ کچھ چھوٹی تھی۔ اس کا جسم گدرایا ہوا اور قد قدرے چھوٹا تھا۔ اس میں پہلی لڑکی سے کہیں زیادہ جنسی کشش تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر برابر مسکرائے جا رہی تھی میں نے بایاں بازو اُس کی کمر میں ڈالا اور اسے اپنے پلنگ کے پاس لے آیا

"کون ہو تم؟" میں نے پوچھا۔ وہ خاموش رہی البتہ اُس کی شوخ آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ میں نے اشارے سے پوچھا کہ گونگی اور بہری ہو تو اُس نے بھی سر کے اشارے سے ہاں کہہ دیا۔ خوب! تو یہ بھی گونگی اور بہری ہے' میں نے دل میں کہا اور اس کے جسم پر سے چادر اتار کر کرسی پر رکھ دی۔ پہلی لڑکی کی طرح اس نے بھی نائٹ گون پہن رکھا تھا' البتہ اُس کا رنگ گلابی تھا۔ میں نے اُسے پلنگ پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور وہ بیٹھ گئی۔

میں نے دروازے کی طرف دیکھ کر اطمینان کر لیا کہ چٹخنی لگی ہے پھر لڑکی کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ میرا بایاں ہاتھ اُس کی کمر میں تھا اور دایاں تکیئے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لڑکی نے اپنا جسم میرے جسم سے بالکل چپکا دیا تھا اور سر میری بغل میں دے دیا تھا۔ میں نے تکیئے کے نیچے سے ریوالور نکالا اور ہاتھ گھما کر پُشت پر لے آیا۔

"کیا نام ہے تمہارا۔؟" میں نے بڑے پیار سے اُس کے کان میں سرگوشی کی اور اُسے قدرے بھینچ لیا۔ اُس کے جسم کی جھرجھری کو میں نے صاف محسوس کر لیا۔

"بتا دو نا نام! ایسی قاتل لڑکی اور بے زبان! سُننے سے معذور' یہ ہو نہیں سکتا میری جان!" میں نے اُسے اور زور سے بھینچا اور اس کے ہونٹوں سے سسکی نکل گئی لیکن وہ بدستور گونگی اور بہری بنی رہی میں نے بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اُس کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اوپر اُٹھایا۔ اُس نے لحظہ بھر کے لئے میری آنکھوں میں دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے' جانے کچھ کہنے کے لئے یا۔ میرے ہونٹوں کے لمس کے لئے۔ میں نے دائیں ہاتھ کو آگے بڑھا کر ریوالور کی نال اُس کی پسلی سے لگا دی اور اُس کی گردن میں حمائل بایاں ہاتھ اُس کے منہ پر رکھ دیا۔ ریوالور کی نال چُبھنے سے وہ کسمسائی اور مجھ سے الگ ہونا چاہا لیکن میرے بائیں ہاتھ کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ وہ جُنبش نہ کر سکی۔ آخر ایک اینتھلیٹ کا ہاتھ تھا۔!

"اگر میں ریوالور کی گولی تمہاری پسلی میں پیوست کر دوں تو تم کچھ نہ کر سکو گی نہ پروفیسر مجھے کچھ کہے گا کیونکہ میرے پاس اس کا معقول جواز ہو گا' اور میں نمٹ لوں گا۔ اگر زندگی عزیز ہے تو جو میں پوچھتا ہوں' ٹھیک ٹھیک بتا دو۔" میں نے اس کے منہ پر سے ہاتھ کا دباؤ ہلکا کر دیا۔

"نادیا۔" لڑکی نے لرزتی ہوئی آواز میں آہستہ سے کہا۔ میں اُسے چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا' اور اُس نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا۔ غالباً وہ رو رہی تھی۔

"نادیا!" میں نے اُس کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔ "تم سے پہلے بھی ایک لڑکی اسی طرح گونگی اور بہری بن کر آئی تھی۔ وہ بے حد

حسین تھی لیکن کل کے بعد نظر نہیں آئی۔" میرے یہ کہنے پر نادیا نے چونک کر چہرے پر سے ہاتھ ہٹالیئے اور میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔" میں حیران ہوں کہ پروفیسر ایسا کیوں کر رہا ہے۔ یہاں کے ملازم بھی گونگے اور بہرے ہیں۔ اُسے اپنے کام کی رازداری کا پورا حق حاصل ہے، لیکن میرے ساتھ لڑکیوں کے معاملے میں اُس نے ایسی حرکت کیوں کی؟ میں یہ معلوم کر کے رہوں گا خواہ مجھے تمہاری اور پروفیسر کی جان ہی کیوں نہ لینی پڑے۔"

نادیا نے خوفزدہ نظروں سے میری طرف دیکھا میں نے ریوالور کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے کہا۔" میں یہاں کے چپے چپے اور ہر بات سے واقف ہوں۔ کوٹھی کے تینوں افراد میری نظروں میں ہیں اور میں..." میں نے اپنے بھرے بھرے بازوؤں کی ابھری ہوئی مچھلیوں کو نمایاں کر کے کہا۔" ان تینوں کو پار لگانے کی طاقت رکھتا ہوں۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ بتادو پروفیسر نے ایسا کیوں کیا۔؟"

"میں نہیں جانتی۔" نادیا آہستہ سے بولی" مجھے تو یہاں پانچ سو روپے یومیہ پر لایا گیا ہے۔ شرط یہ رکھی گئی کہ جب تک یہاں رہوں، گونگی اور بہری بنی رہوں۔"

"تمہارا پروفیسر سے کیا تعلق ہے۔؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی تعلق نہیں" وہ بولی" میں ایک سوسائٹی گرل ہوں پروفیسر نے میرے ساتھ معاملہ طے کیا اور میں یہاں آگئی۔ اُس نے مجھے تین دن کی رقم پیشگی دے دی۔"

"تمہیں رہنے کے لئے کون سا کمرہ دیا گیا ہے۔؟" میں نے پوچھا

"پروفیسر نے مجھے اپنے کمرے میں ٹھہرایا ہے" اُس نے بتایا۔

"کوٹھی کے ملازموں سے تمہاری بات چیت ہوئی ہے؟"

"مجھے اپنے کام سے کام ہے۔ بس اتنا کہہ سکتی ہوں کہ تینوں گونگے اور بہرے ہیں۔"

"تینوں۔؟"

"ہاں۔ دو مرد اور ایک عورت۔"

اچھا تو کوئی عورت بھی ہے! میں نے دل میں کہا۔ یہ اچھا ہوا جو معلوم ہو گیا۔ میں اُس کے پہلو میں بیٹھ گیا اور بولا۔" دیکھو نادیا! میری اور تمہاری پوزیشن ایک ہی ہے۔ تم بھی معاوضے پر کام کرنے آئی ہو اور میں بھی ہمیں ایک دوسرے کو دھوکا نہیں دینا چاہیئے۔ جب تک یہاں رہیں آپس میں تعاون کرنا چاہیئے۔ میں تمہیں یہاں زیادہ عرصے رکنے کی کوشش کروں گا تاکہ تمہیں زیادہ سے زیادہ پیسے ملیں۔ اور یہ بھی بتادوں کہ تمہیں یہاں جس کام کے لئے لایا گیا ہے وہ تمہیں نہیں کرنا پڑے گا۔ تم میرا مطلب سمجھ گئی ہو۔ مجھے رہ رہ کر پروفیسر پر شک گزرتا ہے کہ وہ آخر کس بات سے خائف ہے۔ اُس کے تجربات تو اپنی جگہ ہے لیکن وہ اس گھاس کی جان سے زیادہ کیوں حفاظت کر رہا ہے۔ کہیں گھاس کے نیچے کوئی خزانہ وغیرہ تو نہیں ہے۔؟"

میری اس بات سے نادیا نے چونک کر میری طرف دیکھا اُس کی آنکھوں میں حیرت اور اشتیاق کی ملی جلی چمک تھی۔ میں نے کہا۔" تم بدستور گونگی اور بہری بنی رہو اور پروفیسر کی حرکتوں اور باتوں پر نظر رکھو۔ ہو سکتا ہے قسمت نے میرا اور تمہارا میل اسی لئے کرایا ہو کہ ہمارے دن پھر جائیں۔" نادیا کے چہرے پر مسرت اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

"تمہیں لکھنا تو آتا ہوگا؟" میں نے پوچھا اور خود ہی اپنے سوال پر شرمندہ ہو گیا۔

"جی ہاں۔" نادیا نے جواب دیا۔

"کوئی بات اگر بتانے کا موقع نہ ملے تو کسی کاغذ پر لکھ کر میری الماری میں رکھ دینا میرے شیو کے سامان کا جو ڈبہ ہے، بس اس کے نیچے رکھ دینا۔ اچھا اب تم جاؤ۔" نادیا اُٹھ کر چلی گئی اور میں بستر پر لیٹ گیا۔

★

صبح میں ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ بن مانس نے آکر ایک چٹ دی۔" تمہاری کتابیں اور رسالے تمہارے کمرے میں پہنچا دیئے گئے ہیں تمہیں دن بھر بھرتے رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر پڑھتے رہو اور وقفے وقفے سے کوٹھی کا چکر لگاتے رہو۔ تمہیں زیادہ توجہ پھاٹک پر دینی ہے اور اس کے بعد جنگل والی سمت کی دیوار پر۔ ڈرائنگ روم کی بڑی میز پر گھنٹی کا بٹن ہے۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو اسے دبادینا۔"

چٹ پر پروفیسر نے اپنا نام نہیں لکھا تھا۔ میں نے اُسے تہہ کر کے جیب میں رکھا اور اپنے کمرے میں گیا۔ کتابوں اور رسائل کے چار بند پیکٹ تھے۔ میں نے چاروں کھول لئے اور ایک رسالہ لے کر ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ میں نے سوچا کہ پہلے کوٹھی کا ایک چکر لگانا چاہیئے تاکہ پھر ایک گھنٹے تک آرام سے بیٹھ جاؤں۔ میں سب سے پہلے پھاٹک پہنچا اور دیکھا کہ وہ اچھی طرح بند ہے۔ وہاں سے گھاس کے پلاٹ پر گیا۔ گھاس کچھ زیادہ ہی نکھری نکھری اور اُجلی اُجلی تھی۔ اُس کی تروتازگی دیکھ کر لگتا تھا کہ اُسے کسی خاص پانی سے سیراب کیا گیا ہے۔ مجھے خیال آیا کہ پروفیسر آخر سائنسدان ہے اُس نے پانی میں کوئی ایسی دوا ملائی ہوگی جس سے گھاس میں غیر معمولی طور پر تازگی، ستھراہٹ اور رعنائی آگئی ہے۔ گھاس کو دیکھ کر مجھے پھر اسی بات کا خیال آیا کہ اُسے پانی کس طرح دیا جاتا ہے؟ اگر مشک سے دیا جاتا ہے تو

مشک کون اور کہاں سے لاتا ہے! جانے کیوں گھاس میرے حواس پر سوار ہو گئی تھی۔!

میں اسی طرح کھڑا لاشعوری طور پر گھاس کو دیکھ رہا تھا کہ ایک سیاہ بھنورا اُڑتا ہوا آیا اور ایک جگہ منڈلانے لگا' پھر وہ گرا اور شاید گھاس سے چپک کر رہ گیا۔ میں نے سوچا کہ اس جگہ ضرور کوئی ایسی چیز ہو گی جس پر بھنورا منڈلا رہا تھا اور پھر تھک کر گر گیا۔ ہلکی سبز نظر فریب گھاس پر سیاہ بدزیب بھنورا چمک رہا تھا اور اس سے گھاس کی رعنائی بُری طرح پامال ہو رہی تھی۔ مجھ سے یہ منظر دیکھا نہیں جا رہا تھا اور میں بھنورے کو وہاں سے اُٹھا کر پھینکنے کے لئے بے چین ہو اُٹھا' لیکن مجبور تھا۔ گھاس پر پاؤں نہیں رکھ سکتا تھا اور بھنورے تک اُڑ کر پہنچنا امکان میں نہ تھا۔ یہ میرے ذوق اور نفاست پسندی کے لئے چیلنج تھا اور اس سے گھاس کا نقصان ہونے کا بھی احتمال تھا۔ چنانچہ میں ڈرائنگ روم میں گیا اور میز پر لگے ہوئے بٹن کو دبایا۔ چند سیکنڈ بعد بن مانس بوتل کے جن کی طرح آموجود ہوا۔ میں نے اُسے چٹ لکھ کر دی کہ پروفیسر کو دے آئے۔ چٹ میں میں نے بھنورے کی ساری کہانی مختصراً لکھ دی تھی۔ چند منٹ گزرے تو پروفیسر ڈرائنگ روم میں آیا۔ اُس کے ہاتھ میں تتلیاں پکڑنے والی لمبی سی چھڑی تھی۔ اُس نے مجھے ساتھ لیا اور ہم دونوں لان میں گئے۔

گھاس کے پلاٹ پر پہنچ کر میں نے بھنورے کی طرف انگلی سے اشارہ کیا اور پروفیسر نے چھڑی کو گھما کر اُس کے سرے پر لگی ہوئی جالی سے بھنورے کو ڈھک دیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ پروفیسر حماقت کر رہا ہے بھنورے پر جالی کا کٹورا سا رکھنے سے کیا بھنورا اُٹھایا جا سکتا تھا! اس کے لئے تو چمٹے جیسی کوئی چیز درکار تھی جس سے بھنورے کو پکڑ کر اُٹھایا جا سکتا تھا' لیکن میں یہ دیکھ کر حیرت میں رہ گیا کہ بے جان سا بھنورا اوپر اُٹھ کر جالی سے چپک گیا اور پروفیسر نے بڑے اطمینان سے اُسے کھینچ لیا۔ اُس نے جالی کو زمین پر اُلٹا کر جھٹکا تو بھنورا گر گیا۔ وہ مرا ہوا تھا۔ مجھے یہ بڑی حیرانی کی بات لگی کہ مُردہ بھنورا اوپر اُٹھ کر جالی سے چپک کیسے گیا۔ جالی میں ایسی کیا مقناطیسی کشش تھی۔ میں نے جھک کر جالی کو دیکھنا چاہا تو پروفیسر یوں اچھلا جیسے اُسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو اور مجھے یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا جیسے اُسے وہاں میری موجودگی کا پہلے علم نہیں تھا۔ اُس کی آنکھوں سے کئی رنگ جھلک رہے تھے' پچھتاوے کے۔ اضطراب کے۔ غصے کے رنگ' چند ثانیئے وہ مجھے گھورتا رہا' پھر جھک کر بھنورے کو اُٹھایا اور چھڑی کاندھے پر رکھ کر تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا چلا گیا۔ میں سوچ رہا کہ اُس کا پچھتاوا' اضطراب اور غصہ آخر کس بات سے تھا؟ میں نے کیا کر دیا تھا! میں نے تو اُس کی گھاس کے لئے ایک اچھی بات کی تھی۔ میں اسی سوچ میں تھا کہ نادیا آپہنچی۔

"کیا ہو رہا ہے؟" اُس نے زیرِ لب کہا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے بھی اسی انداز سے کہا۔ میں اسے فی الحال کوئی بات بتانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ سچ پوچھئے تو مجھے اُس پر پوری طرح اعتماد نہیں ہوا تھا۔ "کوئی نئی بات؟" میں نے پوچھا۔

"رات تمہارے پاس سے گئی تو پروفیسر کمرے میں نہیں تھا۔ صبح ناشتہ کر رہی تھی تو وہ آگیا اور پوچھا کہ رات کیسے گزری۔!"

"تم نے کیا بتایا؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔ وہ بھی مسکرائی۔

"کہہ دیا کہ بڑی مزے دار گزری۔"

"پھر۔؟" میں نے کہا۔

"پھر اُس نے مجھے سُرخ رنگ کی دو بڑی بڑی گولیاں کھانے کے لئے دیں اور تاکید کی کہ اُس کا دیا ہوا ٹانک ہر گھنٹے بعد پیتی رہوں" نادیا بولی۔

"اُس نے تمہیں پینے کے لئے کوئی ٹانک بھی دیا ہے؟" میں نے پوچھا

"ہاں۔ سبز رنگ کا ایک لذیذ ٹانک ہے۔ کہنے لگا کہ ٹانک اور ان گولیوں سے تمہارا شباب دیر تک قائم رہے گا۔ پچاس سال کی عمر میں بھی بیس سال کی لگو گی۔"

"خوب۔ کیا کہنے!" میں نے کہا۔ "پھر تو تمہارے عیش ہیں' ایسا کاریگر آدمی کہاں ملے گا۔"

"ایک بات تو ہے۔" نادیا بولی "ٹانک پینے سے میں جسم میں کئی گنا زیادہ طاقت محسوس کر رہی ہوں۔ کھانا بھی دوگنا تگنا کھا رہی ہوں رگوں میں ایک انجانی فرحت اور مستی کی لہریں دوڑتی لگ رہی ہیں۔ دماغ کو غیر معمولی سکون مل رہا ہے۔"

"یہ تو تمہارے فائدے کی باتیں ہیں! ڈاکٹروں کو سینکڑوں روپے دیتیں' تب بھی یہ نہ ہوتا۔"

ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے ڈرائنگ روم کی طرف آئے اور پورٹیکو میں پہنچ کر چپ ہو گئے۔

میں ڈرائنگ روم میں جا کر بڑی میز پر بیٹھ گیا اور نادیا ساتھ پڑی ہوئی کرسی پر جسم ڈھیلا چھوڑ کر اور پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئی۔ میں رسالہ دیکھنے لگا۔ اچانک نادیا سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور قلمدان میں رکھا ہوا قلم اُٹھا کر اُس سے کھیلنے لگی۔ کبھی وہ اُسے میز پر بجاتی' کبھی چومنے لگتی اور کبھی اُس سے ناخن پر سیاہی پھیرتی۔ میں اُس کی بچکانہ حرکتوں کو کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نے لکھنے کا پیڈ اُٹھا لیا اور اس پر بیل بوٹے بنانے لگی

معاً اُس نے اپنے پاؤں سے میرے پاؤں کو ٹھوکا دیا اور میں نے کنکھیوں سے پیڈ کو دیکھا۔ لکھا تھا "نظریں ہمارا پیچھا کر رہی ہیں"۔ پھر اُس نے اس تحریر کو بیل بوٹوں میں چھپا دیا۔ میں اسی طرح رسالے پر نظریں گاڑے بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد بن مانس آیا اور اُس نے مجھے ایک چٹ دی۔ پرفیسر نے مجھے میرے کمرے میں طلب کیا تھا۔ میں گیا تو وہ کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر رُکے بغیر بولا۔

"میں دو روز کے لئے باہر جا رہا ہوں۔ اس دوران میں کوٹھی کی تمام تر ذمے داری تمہارے شانوں پر ہو گی، سمجھے!"

"جی ہاں" میں نے جواب دیا "آپ مطمئن رہیے۔ میں اپنے فرض میں کوتاہی نہیں کروں گا"

"میں کسی وقت بھی چلا جاؤں گا" پرفیسر بولا "اور ہاں یاد آیا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کچھ کمزور ہوتے جا رہے ہو۔ کچھ زیادہ ہی عیاشی کرنے لگے ہو مسٹر، اپنے اس صحت مند جسم کا خیال رکھو۔ گئی جوانی پھر نہیں آتی ہے سمجھے! یہ لوٹانک، ہر گھنٹے بعد ایک چمچہ پی لینا۔ اس سے سدا جوان رہو گے۔ جی بھر کے عیش کرتے رہو۔" اُس نے جیب سے ایک بوتل نکال کر مجھے دی۔ اس میں سبز رنگ کا مشروب تھا۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کر کے بوتل لے لی، اور وہ چلا گیا۔

شام سے پہلے میری نادیا سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میں چائے پی کر لان میں گیا اور اُس کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ سامنے سے آتی دکھائی دی۔ وہ میرے قریب سے سرگوشی میں کہتی ہوئی گزر گئی "بات نہ کرنا" میں وہاں سے ٹل گیا اور نادیا مثلث کی شکل کے گھاس کے تختے پر جا بیٹھی پھر وہ لیٹ گئی۔ چند منٹوں کے بعد میں نے گوریلا کو پورٹیکو میں آتے دیکھا اور انجان بن کر کوٹھی کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ کچھ دور جا کر میں نے کنکھیوں سے دیکھا تو گوریلا نادیا کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں یہ جاننے کے لئے بے چین تھا کہ وہ اس سے کیا کہنے آیا ہے۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس پُراسرار گھاس کے پاس گیا اور پلاٹ کے کنارے بیٹھ گیا۔ اتنے میں میں نے نادیا کو اچانک اُٹھ کر کوٹھی کی طرف جاتے دیکھا۔ گوریلا اُس کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ نادیا کی چال سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی کشمکش میں تھی اور تیز تیز چل رہی تھی۔ گوریلا میری طرف بھی دیکھتا ہوا جا رہا تھا۔ میرے کانوں میں خطرے کا الارم بجنے لگا۔ اور جب دونوں صدر دروازے سے اندر چلے گئے تو میں اُٹھ کر دوڑتے ہوئے ان کے پیچھے گیا۔ ربر کے جوتوں کی وجہ سے میرے بھاگنے کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

جب میں اندر پہنچا تو دونوں کہیں نظر نہ آئے۔ میں ڈرائنگ روم سے ہو کر راہداری میں نکلا۔ میرے ذہن میں ایک خیال دوڑ رہا تھا کہ پرفیسر اپنے کہنے کے مطابق کوٹھی میں نہیں ہو گا اور گوریلا نادیا کو تنگ کر رہا ہو گا دوسری بات جو اس بدگمانی کو رد کر رہی تھی، یہ تھی کہ شاید پرفیسر نے نادیا کو بُلا بھیجا ہو، لیکن ایسا کام تو وہ بن مانس سے لیتا تھا۔ گوریلا کی ڈیوٹی کھانے کے کمرے میں رہا کرتی تھی۔ اِس دوسرے خیال سے پروفیسر کے کمرے کی طرف میرے اُٹھتے ہوئے قدم رُک گئے، اور میں ڈرائنگ روم میں لوٹ آیا۔ پھر لاشعوری طور پر میرا ہاتھ میز کے بٹن پر پہنچ گیا۔ چند سیکنڈ بعد بن مانس آ کھڑا ہوا۔ میں نے یہ دیکھنے کے لئے کہ پروفیسر ہے یا چلا گیا، اُسے چٹ لکھ کر دی۔ "ایک ضرور بات کرنی ہے۔ ملنا چاہتا ہوں"

بن مانس نے چٹ کو دیکھا اور پھر میری طرف دیکھ کر انکار میں سر ہلا دیا۔ اچھا، تو یہ صاحب پڑھے لکھے ہیں! میں نے اپنے آپ سے کہا۔ اس سے مجھے اطمینان ہو گیا اور بن مانس کے جانے کے بعد میں ڈرائنگ روم سے نکلا۔ راہداری میں جا کر میں نے دائیں بائیں دیکھا اور پروفیسر کے کمرے کی طرف بڑھا۔ اندر سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے کان لگا دیئے اور ڈر بھی رہا تھا کہ بن مانس یا گوریلا دیکھ نہ لے۔ نادیا تیز تیز لہجے میں کچھ کہہ رہی تھی۔ جیسے غصّے میں بھری ہو۔ پھر مجھے پرفیسر کی آواز سنائی دی۔ میرا اطمینان رخصت ہو گیا اور میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ڈرائنگ روم میں چلا آیا۔ میز پر بیٹھ کر میں سوچنے لگا کہ پروفیسر نے یہ چکر کیوں چلایا؟ اُس نے مجھ پر یہ ظاہر کیوں کیا کہ وہ کوٹھی میں نہیں ہے؟ میرے دل میں اُس کی طرف سے خوف سا بیٹھ گیا اور میں نے اپنی حفاظت کرنے کا تہیہ کر لیا۔

مجھے ایک شرارت سوجھی اور میں نے گھنٹی بجائی۔ بن مانس آیا تو میں نے اسے چٹ پر کافی لانے کے لئے لکھا۔ وہ چٹ لے کر مشینی آدمی کی طرح چلا گیا۔ وہ کافی لے آیا تو میں نے چٹ پر لکھا کہ نادیا کو لائے۔ وہ یہ چٹ بھی لے گیا اور فوراً واپس آیا۔ میں بڑے اطمینان سے کافی پی رہا تھا۔ میں نے کافی ختم کی تو اُس نے مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ میں اُس کے پیچھے اپنے کمرے پر پہنچا۔ اُس نے دروازہ کھول کر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اسی وقت میری چھٹی حس نے مجھے کسی خطرے سے خبردار کیا چنانچہ میں نے اشارے سے اُسے پہلے اندر جانے کو کہا۔ وہ جھجکا تو مجھے شک گزرا اور میں نے اُسے زبردستی کمرے میں دھکیلا۔ وہ میری اِس غیر متوقع حرکت سے لڑکھڑا گیا لیکن فوراً سنبھل کر مجھے گھونسا مارنا چاہا۔ میں پھرتی سے بیٹھ گیا اور اُس کا گھونسا دروازے کے ایک بند پٹ سے ٹکرایا۔ چوٹ لگنے سے اس کے حلق سے غراہٹ سی نکلی اور دوسرے لمحے میں نے اُسے ریوالور کی نالی پر دھر لیا۔ اُس کا اُٹھا ہوا ہاتھ نیچے گرا تو میری نظر اُس کے ہاتھ میں

فولادی پنجے پر پڑی۔ اگر اس کا گھونسا بے رحیے یا سر پر پڑتا تو اِس وقت میں فرش پر لیٹا نظر آتا۔

ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے تھے پھر میں نے بائیں ہاتھ سے دروازہ بند کرکے چٹخنی لگادی اور ریوالور کے اشارے سے اُسے پلنگ کی طرف چلنے کو کہا۔ اُس نے بلا چوں وچرا تعمیل کی۔ میں نے اُسے پلنگ پر دھکا دیا اور وہ خاموشی سے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ وہ مجھے اِس طرح گھور رہا تھا کہ ذرا موقع ملے اور مجھے پیس کر رکھ دے گا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" میں نے ریوالور کی نال اُس کی کنپٹی پر رکھ کر کہا۔ وہ میری طرف دیکھتا رہا جیسے میری بات سُنی نہیں ہے۔

"تم لوگ زیادہ عرصے مکاری نہیں کرسکتے۔" میں نے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم گونگے ہو نہ بہرے۔ اگر تم میری باتوں کا ٹھیک ٹھیک جواب دوگے تو اچھا ہے، ورنہ میں بہت سنگدل انسان ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے تکیہ اُٹھایا اور اُس کی گردن کے پیچھے سے ہاتھ لاکر اُس کا منہ تکیے میں دبالیا۔ اُس نے سر ہلانے کی کوشش کی لیکن ایک تو اُس کی گردن میرے فولادی پٹھوں سے جکڑی ہوئی تھی اور دوسرے ریوالور کی نال اُس کی کنپٹی پر تھی۔ یہ میری طرف سے گویا انتباہ تھا کہ میں گولی چلاؤں گا تو تمہاری چیخ کمرے سے باہر نکل نہ سکے گی اور تم خاموشی سے ختم ہوجاؤ گے۔

"دیکھو! میں تم جیسے چار آدمیوں کو اِس طرح ختم کرسکتا ہوں تم یہاں دم توڑ چکے ہوگے اور کسی کو پتہ نہ چلے گا۔ تمہارے بعد پروفیسر اور اس کُتے اور کُتیا کی باری آئے گی جو تمہارے ساتھی ہیں۔" میں نے اُس کی گردن کو مزید دباتے ہوئے کہا اور اچانک دیکھا کہ میرے کُتیا کہنے پر اُس کی آنکھوں میں دم بھر کے لیے چمک سی پیدا ہوئی۔ میں بھانپ گیا کہ اُس کا اس عورت سے کوئی رشتہ ضرور ہے جس کے بارے میں نادیا نے بتایا تھا اور میں نے جسے اب تک دیکھا نہیں تھا۔ چند لمحوں میں اُس کا دم گھٹنے لگا تھا، لیکن اُس میں غضب کی قوتِ برداشت لگتی تھی۔

"میں تمہیں صرف ایک منٹ اور دیتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "کیوں پروفیسر کے پیچھے جان گنواتے ہو۔ صرف میری چند باتوں کا جواب دو، پھر تمہیں چھوڑ دوں گا۔" میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنا چاہ رہا ہے، اِس لیے میں نے اُس کے منہ پر تکیے کا دباؤ ہلکا کردیا لیکن اُس پر سے ہاتھ نہیں ہٹایا۔ اُس کے منہ سے ایک لفظ نکلا اور میں نے تکیہ ہٹالیا۔

"ڈینیل۔" اُس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"تم عیسائی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"اِس سارے گورکھ دھندے کے بارے میں کیا جانتے ہو؟ سچ سچ بتاؤ۔"

"اور تم سب کچھ معلوم کرکے مجھے مار ڈالو۔"

ذہانت، قابلیت، قوتِ فیصلہ، قوتِ انہماک، دانشمندی، موقع شناسی، ہوشیاری، جمالیت پسندی بالغ نظری، ایمان داری، قوتِ مشاہدہ، قوتِ متصورہ آپ کے اندر لاتعداد خوبیاں اور خامیاں پنہاں ہیں

لیکن آپ نہیں جانتے

خُود کو سمجھیے

خُود کو سنواریے

خُود کو جانیے

دُوسروں کو پہچانیے

اُردو میں اپنی نوعیت کی وہ واحد کتاب ہے جس میں مشہور ماہرینِ نفسیات کے ترتیب کردہ آزمائشیں (TESTS) جمع کردی گئی ہیں — ان آزمائشوں کو حل کیجیے اور دیکھیے کہ — "آپ کتنے پانی میں ہیں۔"

شائع ہوگئی ہے — آج ہی طلب فرمائیے

قیمت: ۴ رُوپے معہ محصُول ڈاک

ملنے کا پتہ: کراچی بک ڈپو ۶۸ اردو بازار، کراچی

"دیکھو ڈینیل! تم بھی شاید میری طرح پروفیسر کے ملازم ہو۔ ہم دونوں ایک جیسے ہیں۔ اگر تم اس چکر کے بارے میں سچ سچ بتادو گے تو میں تمہیں انگلی بھی نہ لگاؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ تم بدستور گونگے اور بہرے بنے رہو۔ یہ یاد رکھو کہ میں نے بہت کچھ معلوم کر لیا ہے۔ اگر تم نے غلط بیانی کی اور مجھے اُلٹے راستے پر ڈالنا چاہا تو میں سچ کہتا ہوں کہ۔ یہ میرا چودھواں قتل ہوگا۔" میں نے اُسے دھونس دی حالانکہ میں نے زندگی میں ایک چوہے کا بچہ بھی نہیں مارا تھا۔ میری دھمکی کارگر ہوئی اور اُس نے بتایا کہ اُسے اور اُس کی بیوی کو پروفیسر کے ہاں ملازم ہوئے ابھی دو ماہ سے کم عرصہ ہوا ہے۔ دونوں کو فی کس پانچ سو روپے ماہوار تنخواہ پر رکھا گیا تھا اور شرط یہ تھی کہ انہیں پروفیسر کے سوا ہر شخص کے سامنے گونگے بہرے بن کر رہنا ہوگا۔ پروفیسر کے ہر حکم کی بلا چوں وچرا تعمیل کرنی ہوگی اور اس کی کوئی بات کسی کو بتانی نہ ہوگی۔ کوٹھی میں آنے یا یہاں رہنے والے مرد اور عورت پر کڑی نظر رکھنی اور اس کی ہر حرکت کی رپورٹ پروفیسر کو ہر گھنٹے بعد دینی ہوگی۔ انہیں لیبارٹری میں ہرگز جانا نہیں ہوگا۔ ڈینیل کی بیوی کا کام گھریلو ملازمہ کا تھا۔ اُسے باورچی خانے سے قطعاً باہر نہیں نکلنا تھا اور باہر کے کسی فرد کو اُس کی موجودگی کا علم نہیں ہونا تھا۔ ڈینیل کو گوریلا کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں تھا۔ وہ ان میاں بیوی کے آنے سے پہلے کوٹھی میں موجود تھا اور اُن کی طرح وہ بھی گونگا یا بہرا نہیں تھا۔ ڈینیل کو اُس کے فرائض کے بارے میں اِس سے زیادہ معلوم نہیں تھا کہ وہ بیرے کا کام کرتا تھا اور اُس کی ڈیوٹی کھانے کے کمرے میں رہتی تھی۔ پروفیسر نے اُن دونوں کو کبھی ایک ساتھ طلب نہیں کیا تھا' وہ اُن سے علیحدگی میں بات کرتا اور انہیں کسی کام کا حکم دیتا تھا۔ ڈینیل نے اُس کا نام سینڈو بتایا۔ جانے اُس کا اصلی نام کیا تھا' پروفیسر بھی اُسے اِسی نام سے پکارتا تھا۔

میں نے ڈینیل کو آزاد کر دیا اور ریوالور اُس کی کنپٹی پر سے ہٹا لیا اُس نے اطمینان کی ایک ٹھنڈی سانس لی اور میری طرف دیکھتا رہا میں نے مسکرا کر ایک ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا۔ اُس نے قدرے جھجکتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا اور مسکرا دیا۔

"نادیا اور پروفیسر میں اِس وقت کیا باتیں ہو رہی ہیں؟" میں نے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" ڈینیل بولا۔ "اُسے سینڈو بلا کر لے گیا ہے۔"

"اچھا' اب تم جاؤ۔ اگر میرا ساتھ دیتے رہے تو تمہیں مالا مال کر دوں گا۔" میں نے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور وہ اُٹھ کر چلنے لگا'

"دیکھو! اگر کوئی ایسی ویسی بات دیکھو جس میں تمہاری یا کسی کی جان کا خطرہ ہو تو مجھے بتا دینا۔ کسی کی جان بچانا میرا انسانی فرض ہے۔" میں نے کہا اور وہ چلا گیا۔

میں جلدی سے اُس کے پیچھے نکلا کہ دیکھوں کہیں بھانڈا پھوٹتا تو نہیں ہے۔ وہ چند ثانیے پروفیسر کے کمرے کے سامنے ٹھٹھکا اور پھر باورچی خانے میں چلا گیا۔ راہداری میں بلب روشن ہو چکے تھے حالانکہ باہر ابھی سورج کی روشنی تھی۔ میں ڈرائنگ روم میں گیا اور وہاں سے لان میں نکلا' مجھے نادیا کی فکر ستائے جا رہی تھی۔ خدا جانے وہ کہاں ہوگی اور کیا کر رہی ہوگی' میں پروفیسر کے ایک خاص آلہ کار کو توڑ چکا تھا اور اب ایک رہ گیا تھا۔ اگر وہ راستے پر نہ آیا تو اُسے سیدھا کرنا پڑے گا' خواہ مجھے زندگی میں پہلی بار گولی سے کام کیوں نہ لینا پڑے۔

مغرب ہو چلی تھی۔ میں نے پروگرام کے مطابق ساری کوٹھی کا چکر لگایا اور ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ میری نظریں لیبارٹری کے روشندان پر لگی تھیں اور ذہن میں ایک خیال گردش کر رہا تھا کہ اگر دیوار پر چڑھ کر روشندان میں سے جھانکوں تو کیسا رہے گا! اِس میں خطرہ ضرور تھا لیکن ایک خلش تو مٹ جائے گی۔ پھر میں نے اچانک فیصلہ کر لیا کہ گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان اپنا ارمان نکالوں گا لیکن اس سے پہلے سینڈو کو قابو میں کرنا تھا۔ میں نے اُٹھ کر کوٹھی کا ایک اور چکر لگایا اور پورٹیکو میں آن کھڑا ہوا۔ آٹھ بجنے میں کافی دیر تھی اور مجھے جو بھی کرنا تھا' وہ آٹھ بجے کے بعد کرنا تھا۔ میں اپنے کمرے میں گیا اور گھنٹی بجائی۔ ڈینیل آیا تو میں نے اُسے لکھ کر بتایا کہ تھوڑا سا گرم پانی نمک ملا کر لائے۔ میں غرارہ کروں گا۔ یہ محض اُسے بلانے کا بہانہ تھا۔ کوئی دس منٹ میں وہ پانی لایا تو میں نے اُس سے کہا کہ آج میں کھانے کے وقت سینڈو کو گھیرنے کی کوشش کروں گا اگر تم گڑبڑ کی آواز سنو تو کھانے کے کمرے میں ہرگز نہ آنا۔ پروفیسر بعد میں پوچھے تو کوئی بہانہ بنا لینا۔ مزید یہ کہ جب سینڈو کھانا لگا چکے تو تم راہداری میں رہنا اگر پروفیسر آتا نظر آئے تو کھانے کے کمرے سے باہر گلاس یا کوئی چیز فرش پر پھینک کر توڑ دینا۔

میں نے ڈینیل کو یہ باتیں سمجھائیں تو وہ اُلو کی طرح میرا منہ دیکھنے لگا۔ اُس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ اُسے میرے پروگرام سے اتفاق نہیں تھا۔ "کیوں' کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔" اُس نے دبی آواز سے کہا۔

"تم کیوں گھبراتے ہو؟ تم پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔" میں نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "اور اگر تمہیں اپنی روزی کی فکر ہے تو یہ ہر حال میں قائم رہے گی۔" یہ کہہ کر میں الماری کی طرف گیا۔ اُس میں میری تنخواہ کے ہزار روپے جوں کے توں رکھے تھے۔ میں نے پانچ سو نکال کر اُسے دیئے اور اُس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ "تم فکر نہ کرو۔

تمہاری نوکری نہ صرف رہے گی بلکہ زیادہ ملے گی۔" میں نے اُسے تسلی دے کر رخصت کیا اور کمرے سے نکلا۔

سات بجکر چالیس منٹ پر میں کھانے کے کمرے میں گیا اور میز پر بیٹھ گیا۔ آدھا کھانا چنا گیا تھا اور سینڈو غالباً باورچی خانے میں تھا چند سیکنڈ بعد وہ ٹرے اٹھائے آیا اور اس میں کی چیزیں میز پر رکھنے لگا۔ میں نے نظر دوڑائی تو روٹیاں لانی رہ گئی تھیں۔ سینڈو خالی ٹرے لئے چلا گیا اور میں جلدی سے اُٹھ کر دروازے کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ ریوالور پیٹی سے نکل کر میرے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ سینڈو کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ٹرے تھی۔ اور دوسرا ہاتھ لٹکا ہوا تھا۔

"مسٹر سینڈو—!" میں نے آگے بڑھ کر ریوالور کی نال اس کی گردن سے لگا دی۔ اس نے مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن موقع کی نزاکت دیکھ کر ساکت کھڑا ہو گیا۔ میں اس سے دو فٹ پیچھے تھا اور اس کے حملے کا جواب دینے کے لئے پوری طرح تیار تھا۔

"میں ایتھلیٹک کا چیمپئن ہوں، سینڈو صاحب!" میں نے کہا۔ "بے شمار انعام اور سرٹیفکیٹ لے چکا ہوں اور اس کے علاوہ۔ باکسنگ اور جوڈو کا بھی ماہر ہوں، تم نے حرکت کی نہیں اور میں نے تمہاری پسلیاں توڑی نہیں۔ چپ چاپ ٹرے میز پر رکھ دو اور میرے حکم پر خاموشی سے عمل کرو ورنہ یہ میرا چودھواں قتل ہوگا۔ پروفیسر سے میں آپ نمٹ لوں گا۔" میری اس دھمکی کا کارگر ہونا لازمی تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ٹرے میز پر رکھ دی—!

"کمرے سے باہر چلو—" میں نے ریوالور اسی طرح اس کی گردن سے پیوست رکھا۔ اور اس کی ایک کلائی پکڑ کر ہاتھ پیچھے کی طرف موڑ لیا۔ اس کے منہ سے تکلیف کے مارے ہلکی سی سسکی نکل گئی۔ میں اسے کمرے سے باہر لے آیا اور باورچی خانے کی طرف بڑھا۔ اسی وقت ڈینیل باورچی خانے سے باہر آیا۔ اور میں نے اس سے ڈپٹ کر کہا— "خبردار! ہاتھ اُوپر اُٹھا لو—" ڈینیل نے بے بسی سے سینڈو کی طرف دیکھا اور دونوں ہاتھ اُوپر اٹھا لیئے۔ آگے آگے وہ اور پیچھے میں سینڈو کو لئے باورچی خانے میں داخل ہوا۔ میں کچھ گھبرایا بھی۔ کیونکہ باورچی خانے کے اندرونی حصّے سے ناواقف تھا۔ بڑا لمبا چوڑا کمرہ تھا جس کا سارا ساز و سامان مغربی طرز کا تھا۔ ایک طرف ککر تھا جس کے سامنے ایپرن باندھے ایک ادھیڑ عمر کی گوری چٹّی گول مٹول عورت کھڑی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ چیخ مارتی یا کوئی حرکت کرتی میں نے گرج کر کہا— "گولی مار دوں گا۔ آواز نہ نکلے۔ ہاتھ اُوپر اٹھا لو۔" اس نے لرزتے ہوئے دونوں ہاتھ اُوپر اٹھا دیئے۔ میں نے نظریں دوڑا کر کمرے کا جائزہ لیا۔ دوسرے سرے پر دروازہ تھا۔ غالباً باہر جانے کے لیئے تھا۔ بغل میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ شاید اسٹور روم تھا۔ میں نے تینوں کو اس میں چلنے کو کہا۔ اس میں صرف کھڑے رہنے کی گنجائش تھی۔

"بتاؤ نادیا کہاں ہے—؟" میں نے بیک وقت سینڈو اور ڈینیل سے پوچھا۔ دونوں خاموش رہے۔

"اب یہ گونگے بہرے کا ڈرامہ چھوڑ دو، دوستو! میں سب کچھ جان چکا ہوں۔ اگر میرا ساتھ دو گے تو ٹھیک رہو گے ورنہ کتے کی موت مارے جاؤ گے—" بظاہر میں دونوں سے مخاطب تھا لیکن دراصل سینڈو سے کہہ رہا تھا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ سینڈو میاں بیوی کی موجودگی میں بات نہیں کرے گا۔ میں نے اسے اسٹور سے باہر آنے کو کہا اور ڈینیل کو متنبہ کیا۔ "اگر بھاگ نکلنے کی کوشش کی تو اس کے نتیجے ذمّہ داری مجھ پر نہ ہوگی—" یہ کہہ کر میں نے اسٹور کا دروازہ بند کر دیا اسے بند کرنے سے پہلے میں نے سینڈو کی نظر بچا کر ڈینیل کو آنکھ ماری۔

باہر کمرے میں آکر میں نے سینڈو سے اسٹول پر بیٹھ جانے کو کہا وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔ میں اس کے سامنے کوئی چار فٹ دُور دروازے کی طرف رُخ کر کے کھڑا ہو گیا تاکہ پروفیسر آئے تو دیکھ سکوں۔

"اب تم اپنے بارے میں سب کچھ صحیح بتا دو—" میں نے کہا "کچھ باتیں تو مجھے معلوم ہیں۔ اگر تم نے جھوٹ بولا تو بخشوں گا نہیں"

سینڈو ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نے چند لمحے انتظار کر کے اپنی بات دُہرائی تو وہ ہنسنے لگا اور دیر تک ہنستا رہا۔ پھر اس نے زور سے زمین پر تھوک دیا۔ اس کی نظروں میں بے خوفی اور نفرت تھی۔ اور ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ان لوگوں میں سے نہیں جو ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ اس کی جان لینا مجھے مطلوب نہیں تھا۔ میں اس کی طرف سے مایوس ہو گیا۔ اب اس کا انتظام کرنا ضروری تھا۔ میں نے اٹھ کر اسٹور کا دروازہ کھولا اور ڈینیل کو حکم دیا کہ کہیں سے رسّی تلاش کرے۔ وہ باورچی خانے سے باہر نکلنے لگا تو میں نے اسے روک دیا۔ پھر میں نے سینڈو کو اسٹور روم میں جانے کو کہا وہ اُٹھا اور اطمینان سے ہاتھ ہلاتا ہوا اس طرف بڑھا اس کی لاپرواہی میرے لئے تشویشناک تھی۔ جب وہ اسٹور روم میں داخل ہونے لگا تو میں نے اس کی گردن پر ایک بھرپور ہاتھ مارا۔ سینڈو لڑکھڑا گیا۔ میں نے ایک اور آڑا ہاتھ مارا اور وہ اوندھے منہ دروازے میں گر گیا۔ اب مجھے اطمینان تھا کہ وہ گھنٹہ بھر سے پہلے مجھے پریشان نہیں کرے گا۔ میں نے اسے گھسیٹ کر اوندھا لٹایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ دروازہ توڑ دے گا۔ تم اسے نہیں جانتے—" ڈینیل نے کہا— "اسے باندھ دو، میں رسّی لاتا ہوں—" یہ کہہ کر وہ تیزی سے

چلا گیا۔ اس کی بیوی متوحش نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی غالباً ڈینیل نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔

"کیا نام ہے تمھارا۔؟" میں نے اس سے مسکرا کر پوچھا۔

"ماریا ۔۔۔!" اس نے لرزتی ہوئی آواز سے کہا۔

"تمھیں کچھ معلوم ہے نادیا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اتنے میں ڈینیل ایک زنجیر لے آیا۔

"یہی مل سکی ہے۔" اس نے کہا۔ میں نے سینڈو کے دونوں ہاتھ پیچھے کئے اور انھیں زنجیر سے باندھ دیا۔ پھر اس کا باقی حصّہ اس کی گردن کے گرد لپیٹ کر اسے پیچ در پیچ کر دیا۔ پھر اسٹور کا دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دی۔

"اب تم میرے آگے آگے چلو۔ شاید تمھاری مدد کی ضرورت پڑ جائے۔" میں نے ڈینیل سے کہا۔ وہ یہ سُن کر گھبرا گیا۔ لیکن میں نے اسے دلاسا دیا اور اس کی پُشت سے ریوالور کی نالی لگا کر اس کے پیچھے چلا ہم پروفیسر کے کمرے کے سامنے رُک گئے اور میں ڈینیل کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اس نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور سر کے اشارے سے کہا۔ کہ پروفیسر نہیں ہے۔

"نادیا ۔۔؟" میں نے پوچھا۔ اس نے پھر نفی میں سر ہلا دیا میں اسے لئے لیبارٹری کی طرف چلا۔ معاً خیال آیا کہ پروفیسر نے اپنی حفاظت کا ضرور انتظام کر رکھا ہوگا۔ وہ اتنا احمق نہیں ہو سکتا۔ اس خیال سے میں نے ڈینیل سے کہا کہ وہ لیبارٹری سے باہر ہی کہیں رہے اگر میں چلّا کر کہوں "ہائے مر گیا۔" تو تم سمجھ جانا کہ تمھاری مدد کی ضرورت ہے۔

ڈینیل کو وہیں چھوڑ کر میں ڈرائنگ روم کے راستے باہر نکلا اور لیبارٹری کی پشت پر گیا۔ روشندان تقریباً بیس فٹ اونچا تھا اس سے کچھ فاصلے پر پانی کی ٹنکی تک پہنچنے کے لئے لوہے کی سیڑھی دیوار سے پیوست تھی میں اس کے ذریعے چھت پر چڑھ گیا اور سرکتا سرکتا روشندان کے قریب گیا۔ اب میں چھت پر اوندھا لیٹا ہوا تھا اور جھک کر لیبارٹری کے اندر دیکھ رہا تھا۔ لیبارٹری کیا تھی ایک ورکشاپ تھا۔ سائنسی آلات میں نے بے شمار دیکھے تھے لیکن یہاں کچھ عجیب قسم کی چیزیں تھیں۔ میری نظروں نے کیمرے کی آنکھ کی طرح گھوم کر پروفیسر کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ میری طرف اس کی پشت تھی اور وہ ایک میز پر جھکا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ وہاں سے ہٹ کر ایک شیشے کے سلنڈر کے پاس گیا تو میں نے دیکھا کہ میز پر نادیا چت لیٹی ہوئی تھی۔ وہ بالکل بے حس و حرکت تھی۔ میز کے سرہانے ایک بڑا سا پہیّہ تھا جس میں ایک طرف گھمانے کا ہینڈل تھا۔ میز کی پائنتی پر کوئی دس فٹ اونچا اور چھ فٹ چوڑا لوہے کا کھوکھا سا کھڑا تھا۔ اس کے ایک طرف کی چوڑی دیوار میری طرف تھی اس لئے میں دیکھ نہ سکتا تھا کہ اس میں کیا ہے ۔۔۔!

پروفیسر اب شیشے کے سلنڈر کے پاس سے ہٹ کر دوبارہ میز کے پاس گیا اور جُھک گیا۔ اس کی پشت پھر میری طرف تھی اور وہ شاید جھک کر نادیا کو دیکھ رہا تھا۔ چند سیکنڈ تک اسے دیکھنے کے بعد وہ پہیّے کے قریب کھڑے ہوئے ایک ستون کے پاس گیا۔ پروفیسر کے سر کی سیدھ میں ستون پر تقریباً دو مربع فٹ سیاہ رنگ کا پردہ تھا۔ اس نے پردہ ہٹایا تو ستون میں میٹر جیسی کوئی چیز گڑی ہوئی تھی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے خانوں کے اوپر جو غالباً نمبروں کے تھے تین بٹن لگے ہوئے تھے اور ان میں سے روشنی نکل رہی تھی یا وہ بہت چمک رہے تھے۔ ایک سُرخ دوسرا سبز اور ان کے درمیان کالا بٹن تھا۔ اتنے میں پروفیسر جیبیں ٹٹولنے لگا جیسے کوئی چیز بھول گیا ہے۔ اور دروازے کی طرف بڑھا۔

اس سے زیادہ سنہری موقع ہاتھ نہیں آ سکتا تھا۔ کیونکہ میں ان آلات اور مشینری کو قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔ میں اپنی جگہ سے جلدی سے اٹھا اور بھاگ کر لوہے کے زینے کے پاس آیا۔ مجھ سے جتنی جلد ہو سکا۔ نیچے اترا اور بے تحاشہ پورٹیکو کی طرف بھاگا۔ دو تین منٹ میں میں لیبارٹری کے دروازے پر تھا۔ ایک نظر خالی راہداری پر ڈال کر میں اندر گھس گیا اور چھپنے کی ایسی جگہ تلاش کرنے لگا جہاں سے میز کا منظر صاف دیکھ سکے۔ ایک طرف شیشے کے سلنڈروں اور موٹی پتلی نلکیوں کا کاؤنٹر نظر آیا جس پر اور بھی بے شمار چیزیں رکھی تھیں۔ میں لپک کر اس کے پیچھے جا چھپا۔ اگر میں چھپنے میں آدھ منٹ بھی دیر کرتا تو پکڑا گیا ہوتا کیونکہ پروفیسر لیبارٹری میں داخل ہو چکا تھا اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی اور وہ سیدھا میز کے پاس گیا میں صاف دیکھ نہ سکا کہ وہ اس چیز کے ساتھ نادیا پر جھک کر کیا کرتا رہا۔ بہرحال وہ ہٹ کر پہیّے کے پاس آیا اور انگلی سبز بٹن پر رکھ دی اس کے بعد اس نے ہینڈل پکڑا اور اسے بائیں طرف گھمانے لگا۔ اس سے پہیّہ دائیں طرف گھومنے لگا اور نادیا آہستہ آہستہ لوہے کے کھوکھے کی طرف کھسکنے لگی۔ اب تک میرا دھیان کھوکھے کی طرف نہیں گیا تھا۔ میں نے جو غور سے دیکھا تو اس میں سامنے کی دیوار پر چند انچ چوڑی پٹی سی تھی جس پر سبز اور سُرخ رنگ کے کئی چھوٹے بلب اور ٹیوب لگے تھے ان کی شکل ریڈیو کے والو کی طرح تھی کھوکھے میں باقی سارا خلا تھا۔

اتنی دیر میں نادیا کا بے جان جسم اس کھوکھے میں داخل ہو چکا تھا۔ پروفیسر نے بڑی پھرتی سے ستون میں گڑے ہوئے میٹر کا سیاہ

بٹن دبایا اور کھوکھے کے پاس گیا۔ نادیا کا سارا جسم میز کے آگے نکلی ہوئی سطح پر تھا جو کھوکھے کے اندر پٹ تک چلی گئی تھی۔ پروفیسر گھوم کر نادیا کی دوسری طرف آیا اور رہ رہ کر یوں دیکھنے لگا جیسے اطمینان کر رہا ہو کہ سب کچھ ٹھیک ہے یا نہیں مجھے اس کے ماتھے پر پسینے کی چمکتی ہوئی بوندیں صاف نظر آرہی تھیں جنھیں پونچھنا بھی وہ ضروری نہیں سمجھ رہا تھا چند سیکنڈ تک وہ اسی طرح کھڑا رہا۔ پھر اس نے میز کے پاس جاکر سرخ رنگ کا بٹن دبایا۔ اس کے ساتھ ہی نادیا کا جسم آہستہ آہستہ نیچے ہونے لگا اور میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ پروفیسر نے کھوکھے میں لگے ہوئے بلبوں اور ٹیوبوں کو غور سے دیکھا اور وہاں سے ہٹ کر پہیئے پر لگے ہوئے ہینڈل کو دائیں طرف گھمانے لگا جس سے پہیہ بائیں طرف گھومنے لگا۔ آگے نکلی ہوئی میز کی سطح پر جو کھوکھے میں جاکر نیچے ہوگئی تھی۔ اوپر اٹھنے لگی۔ اور پھر پیچھے سرکنے لگی اب اس پر نادیا نہیں تھی......،

وہ کہاں گئی ـــ؟ بجلی کی طرح میرے ذہن میں یہ سوال کوندا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے شدت سے احساس ہوا کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ اب میں زیادہ دیر تک تماشائی بن کر پروفیسر کا فن نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے چاروں طرف نظریں دوڑا کر لیبارٹری کا جائزہ لیا۔ کہ پروفیسر کہاں سے اور کس چیز کے ذریعے مجھ پر وار کرسکتا ہے لیکن وہاں اتنی ساری مشینیں اور آلات تھے کہ میں کوئی رائے قائم نہ کرسکا۔ خدا نام لے کر میں نے ریوالور کو مضبوطی سے پکڑا اور اپنی کمین گاہ سے جھکتا ہوا چل کر باہر نکلا۔ میں پروفیسر کو بے خبری میں جالینا چاہتا تھا تاکہ اسے سنبھلنے کا موقع نہ ملے۔ چنانچہ میں نے اپنی جگہ سے جست لگائی اور میز کے قریب جاکر گرتے گرتے بچا۔ پروفیسر چونک کر اچھل پڑا۔

"نادیا کہاں ہے ـــ؟" میں نے میز کی اس طرف سے ریوالور کی نالی بالکل اس کے سینے سے لگادی۔ اس نے دو تین بار پلک جھپکا کر میری طرف دیکھا۔ پھر بڑے اعتماد سے بولا۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو۔ تمھیں لیبارٹری میں آنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ معاہدے کی رُو سے......"

"جہنم میں جائے تمھارا معاہدہ اور اس کے ساتھ تم بھی ـــ یہ بتاؤ کہ نادیا کو کہاں غائب کردیا ہے ـــ؟"

اس نے مجھے غور سے دیکھا اور بولا۔ "وہ چلی گئی ـــ میں اسے روک نہ سکتا تھا۔ تمھارے لئے دوسری لڑکی......"

"بکواس بند کر بڈھے!" میں گرجا۔ "تم نے نادیا کو اس مشین میں کہاں غائب کردیا ہے ـــ" یہ کہہ کر میں نے ریوالور والے ہاتھ سے کھوکھے نما مشین کی طرف اشارہ کیا۔ بس یہی ہاتھ کی معمولی جنبش مجھے لے ڈوبی۔ پروفیسر کی ذہانت اور حاضر دماغی کی داد دینی پڑتی ہے کہ اس نے اس چند ثانیے کی مہلت سے فائدہ اٹھالیا میرے ریوالور کا رُخ کھوکھے کی طرف ہوا ہی تھا کہ وہ جست لگا کر پہیئے کے پیچھے ہوگیا۔ میں چاہتا تو اس پر گولی چلا سکتا تھا۔ لیکن اسے مار دینے سے نہ نادیا کا معمہ حل ہوسکتا تھا نہ گھاس کا۔ میں نے دانت پیس کر اسے للکارا۔ "میں گولی مار دوں گا ـــ خبیث، جلدی بتا کہ نادیا کہاں ہے؟"

"کہہ جو دیا ہے کہ......" میں نے اس کی بات ہوائی فائر سے کاٹ دی۔ گولی کی "بنگ" سے لیبارٹری گونج اٹھی۔ ابھی میرا اوپر اٹھا ہوا ہاتھ نیچے آہی رہا تھا کہ میری کلائی پر کوئی نوک دار چیز آلگی اور ریوالور چھوٹ کر دروازے کے قریب جاگرا۔ کلائی پر چوٹ لگنے سے میں بلبلا اٹھا اور میرے منہ سے چیخ نکل گئی میں درد کو سہہ کر ریوالور اٹھانے کے لئے لپکا لیکن اسی لمحے ایک اور سخت چیز میرے سر پر آلگی اور مجھے چکر آگیا۔ آنکھوں کے سامنے سرخ قمقمے سے جھلملا گئے ایک گھٹنا خود بخود فرش سے جا لگا تھا اور میں دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر اٹھنے ہی لگا تھا کہ پروفیسر چھلانگ لگا کر میرے سر پر پہنچ گیا۔ معاً میرا ذہن تیزی سے کام کرگیا اور شدید تکلیف کے باوجود میں نے پوری طاقت سے قلابازی کھائی اور پروفیسر لڑکھڑا کر میرے اوپر آرہا۔ مجھے فوراً ڈینیل کا خیال آیا اور میں اپنے کوڈ کے لفظ میں چلایا "ہائے مرگیا"۔ اسی وقت میری نظروں کے سامنے ایک نوکدار چیز چمکی۔ پروفیسر کے ہاتھ میں ایک لمبی اور موٹی سوئی سی تھی۔ میں نے پلٹا کھا کر اس کا وار خالی دیا اور وہ مجھ سے چمٹا ہوا میرے پہلو میں آگیا اس کا سوئی والا ہاتھ اوپر اٹھا اور اس سے پہلے کہ وہ سوئی میرے گلے میں یا چہرے پر مارتا یکے بعد دیگرے دو گولیاں چلیں اور اس کا ہاتھ نیچے گرگیا ـــ وہ ٹھنڈا ہوگیا۔ میں نے خود کو اس سے چھڑایا اور سر اٹھا کر دیکھا۔ ڈینیل دروازے کے قریب ریوالور لئے کھڑا تھا۔ پروفیسر کا قصہ پاک دیکھ کر وہ آگے بڑھا اور میں اس کا سہارا لیکر اٹھ کھڑا ہوا۔ میری کلائی سے خون بہہ رہا تھا اور اس میں اور سر میں شدید درد تھا۔ میں کھڑا تو تھا لیکن میری ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ میں نے پروفیسر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور سینے کے نیچے فرش پر گاڑھا گاڑھا سرخ خون پھیلا ہوا تھا۔ میں بے دم سا فرش پر بیٹھ گیا۔

"ڈینیل ـــ!" میں نے درد کی شدت سے کراہتے ہوئے کہا۔ "یہ تم نے اچھا بھی کیا اور بُرا بھی۔ تم نے میری جان تو بچالی لیکن۔

ایک راز ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا۔ کاش یہ راز ظاہر ہو جاتا خواہ میری جان ہی چلی جاتی ـ ! “

ڈینیل ریوالور ہاتھ میں لئے گم سم کھڑا تھا ۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔ معاً وہ مڑا اور دروازہ کھول کر چلا گیا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا اور میز کا سہارا لیکر کھڑا ہو گیا۔ مختلف خیالات میرے ذہن میں گڈمڈ ہو رہے تھے پولیس کو اطلاع دینی ضروری تھی لیکن اس صورت میں ڈینیل قانون کی زد سے بچ نہیں سکتا تھا۔ اگر وہ بچ نکلتا تو میں پھنس جاتا۔ میری کہانی پر اعتبار کون کرتا۔ کسی انسان کے یوں غائب ہو جانے پر کون یقین کر لیتا۔ اس لیبارٹری میں جو کچھ ہوا تھا اسے سمجھنے کے لئے سائنسدان کے علاوہ انجینئر کی بھی ضرورت تھی۔ پروفیسر نہ صرف سائنسدان تھا بلکہ اعلیٰ پائے کا انجینئر بھی تھا۔

میں انہی تفکرات میں ڈوبا ہوا تھا کہ پیچھے آہٹ ہوئی میں نے مڑ کر دیکھا تو ڈینیل اور سینڈو کھڑے تھے۔ خوف کی ایک سرد لہر میرے سارے جسم میں دوڑ گئی میں ڈینیل کی شخصیت کو سمجھنے میں ناکام ہو چکا تھا۔ اس نے ایک طرف تو میری جان بچائی تھی اور دوسری طرف میرے جانی دشمن کو میرے سر پہ لے آیا تھا۔ میں بے چارگی سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ اور وہ میری طرف بڑھے۔ میرے مضبوط اعصاب کی ساری طاقت سلب ہو چکی تھی کشتی، باکسنگ اور جوڈو کے داؤ پیچ حرف غلط ثابت ہو رہے تھے۔ وہ دونوں میرے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔ اور میرے دونوں بازو تھام لئے میں مجرموں کی طرح سر جھکائے اپنی قسمت کے فیصلے کا منتظر تھا ـــ !

” دوست ـــ ! “ ڈینیل کی آواز کسی گہرے کنوئیں سے سنائی دی ـــ ” تم نے کہا تھا کہ اگر میرا ساتھ دو گے تو میں مالا مال کر دونگا اور شاید یہ بھی کہا تھا کہ گھاس کے نیچے کوئی خزانہ وزانہ چھپا ہوا ہے تمہارے کہنے پر میں نے پروفیسر سے غداری کی اور اس کی جان بھی لے لی اب تم اپنا وعدہ پورا کرو۔ آؤ ہم تینوں مل کر کوٹھی کو چھان ماریں پروفیسر کے پاس بے حساب دولت ہے۔ اب وہ تو دنیا سے چلا گیا۔ اگر پولیس آ گئی تو ہمارے ہاتھ کچھ نہ آئے گا اور تم پروفیسر کا راز بھی معلوم نہ کر سکو گے۔ میں نے تمہارے ساتھ پورا تعاون کیا ہے۔ اب تمہارے تعاون کی ضرورت ہے سینڈو کو میں نے سب کچھ سمجھا دیا ہے۔ اب یہ بھی ہمارا ساتھی ہے ـ “

میرے لئے یہ ندائے غیبی تھی۔ میں نے سینڈو کی طرف دیکھا اور اس نے سر ہلا کر ڈینیل کی بات کی تصدیق کی۔ مجھے اپنی کلائی اور سر کی تکلیف میں بے حد کمی محسوس ہوئی۔ اس کے برعکس اپنے جسم میں توانائی محسوس ہوئی۔ میں ان دونوں کے سہارے اس کھوکھے نما مشین کی طرف بڑھا جس میں نادیا غائب ہوئی تھی۔ اس کی نچلی سطح خاصی گہری لگ رہی تھی۔ میں نے اس میں لگے ہوئے بلبوں اور ٹیوبوں کو دبایا ـــ گھمانے پھرانے کی کوشش کی لیکن اس سے کچھ نہ ہوا۔ پھر میں نے پہیئے کے ہینڈل کو گھمایا ستون کے سارے بٹن دبائے اس سے صرف یہ ہوا کہ میز کی سطح کھسک کر کھوکھے میں گئی اور آ گئی۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہ ہوا۔ پھر ہم نے ساری لیبارٹری چھان ماری کہ کوئی ایسی چیز ہاتھ لگے جس سے مشین کا معمہ حل ہو۔ دو گھنٹے کی تھکا دینے والی کوشش کے باوجود۔ ہمیں صرف مایوسی ہی ملی۔

” ہمیں اس کے کمرے میں چلنا چاہیئے ـــ “ آخر میں نے رائے دی ـــ ” ہو سکتا ہے وہاں ایسی کوئی چیز یا مواد مل جائے جس سے کوئی سراغ مل جائے ـ “

” میں نے اسے اکثر ایک بڑی سی سرخ رنگ کی ڈائری میں لکھتے دیکھا ہے ـــ “ سینڈو نے پہلی بار زبان کھولی ” شاید اس سے کچھ پتہ چلے ـ “

” چلو ـــ “ ڈائری کا نام سنتے ہی میں نے جلدی سے کہا ـ اور وہ مجھے سہارا دیکر پروفیسر کے کمرے میں لے گئے۔

” ڈینیل ـــ ! “ میں نے کہا ” بھائی پہلے مجھے ایک پیالی گرم گرم کافی پلا دو ـــ تاکہ میرے حواس قابو میں آئیں ـ “

” ابھی لایا ـــ “ ڈینیل یہ کہہ کر چلا گیا۔ میں نے کمرے پر طائرانہ نظر ڈالی۔ بالکل ویسا ہی تھا جیسا میرا کمرہ۔ صرف ایک بڑی سی میز اور کتابوں کے شیلف کا فرق تھا۔ میز پر کتابیں، چارٹ، جومیٹری اور کاربنیٹری ـــ اور سائنس کے بڑے بڑے آلات وغیرہ الم غلم چیزیں بکھری پڑی تھیں۔

” ڈائری اس دراز میں ہے ـ “ سینڈو بولا۔ دراز پر خودکار تالہ لگا تھا۔ لیکن سینڈو نے ایک بڑے سے پرکار اور ہتھوڑی کی مدد سے چند سیکنڈ میں تالہ توڑ دیا۔ میں نے دراز کھولی تو کاغذات کے نیچے سرخ رنگ کی ایک بڑی سی ڈائری مل گئی۔ میں اسے کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور سینڈو اپنے مطلب کی چیز تلاش کرنے لگا۔ ڈائری میں بے شمار فارمولے اور پروگرام لکھے تھے جن سے مجھے کوئی غرض نہیں تھی۔ اکتا کر میں نے ڈائری کو الٹی طرف سے پلٹا۔ پہلے ہی صفحے پر پانچ کالم بنے تھے۔ اور میری نظریں ان پر جم گئیں۔ کالموں کی ترتیب یہ تھی ـ نام تاریخ آمد، تاریخ استعمال دوا، تاریخ روانگی، نتیجہ ـ

ساتویں قسط

سابقہ قسطوں کے خلاصے کے ساتھ

اقلیم علیم

میری اِس کہانی کا مقام مشرق کے وہ فسوں کار صحرا اور نخلستان ہیں جہاں کے مشقت آزما شب و روز پر نادیدہ اسرار کی دُھندلائی ہوئی چادریں چھائی رہتی ہیں اور جہاں ہر طرف قرونِ اولیٰ و وسطیٰ کی پُرجلال اور ماورائی طاقتیں حکمراں ہیں۔ اس کہانی نے جس قبیلے سے جنم لیا وہ جبرین کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اس قبیلے کے بسنے والے صحرائی قزاق، عقیدے کے اعتبار سے آتش پرست اور اپنی صدیوں پُرانی روایات کو سینوں میں چھپائے مقدس آگ کے سائے میں روپوشی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ بیرونی دنیا سے اُن کا کوئی تعلق نہیں اور اسی سبب سے ان کی رسوم و روایات میں اوہام پرستی کے نت نئے رنگ نظر آتے ہیں۔

اس کہانی کے اہم کرداروں میں جبرین کا طویل قامت، کشادہ بدن، ہیبت صورت، پُرعزم، سخت گیر اور توانا سردار جوبا بھی شامل ہے اور نخلستان میں رہنے والا پُرہول بوڑھا مانیتی بھی۔

مانیتی جبرین کے واحد آتش کدے کا مقدس پروہت تھا اور عموماً بستی سے باہر لہلہاتے ہوئے نخلستان میں تنہا رہتا تھا۔ وہ جسمانی اعتبار سے نحیف مگر ذہنی اعتبار سے بلا کا تیز تھا۔ بینائی کمزور رہنے کے باوجود وہ جسموں سے اُٹھنے والی مخصوص بُو کے ذریعے ہر انسان اور جانور کو بخوبی پہچان لیتا تھا۔ جبرین والے اور اُن کا سردار جوبا تک مانیتی اور اُس کی پُراسرار قوتوں سے بُری طرح خائف رہتا تھا۔ وہ بستی میں جدھر کو بھی نکل جاتا لوگوں کی گردنوں کا نخوت آمیز تناؤ مُردنی میں ڈھل جاتا۔ قہر بھری آوازوں میں دھاڑنے والے بے رحم لٹیرا کا منمناتی ہوئی آوازوں میں نحیف و ناتوان بوڑھے کو تعظیم پیش کرتے نظر آتے جیسے اُن کی رُوحیں ہمیشہ سے مانیتی کی غلام ہوں۔

میں مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لئے ایک کارواں کے ہمراہ اِس صحرا سے گزرتے ہوئے قزاقوں کا شکار ہوگیا۔ سارا قافلہ خاک و خون میں نہلا دیا گیا اور مجھے جبرین کے ایک لاولد چرواہے نے جوبا کی اجازت سے منہ بولا بیٹا بنا لیا۔

جبرین کے قزاقوں میں پروان چڑھنے کے باوجود میں کبھی اس پیشے کو پسند نہ کر سکا میرے دل و دماغ میں اپنے آبائی پیشے، سنگتراشی کی محبت رچی ہوئی تھی۔ میں نے کسی نہ کسی طرح جوبا سے نخلستان میں رہنے کی اجازت حاصل کرلی اور وہاں چوری چھپے سنگتراشی کی مشق کرنے لگا۔ جو جبرین والوں کے نزدیک گناہ تھی۔

پھر مانیتی کو اپنی پُراسرار قوتوں کے ذریعے میرے شوق کا علم ہوگیا اور اُس نے مجھے نوید دی کہ آسمانوں سے مجھے سرِعام سنگتراشی کی اجازت مل چکی ہے۔ میں نے نخلستان میں پہلا مجسمہ تراشا جو غیرارادی طور پر سردار جوبا کی جوان لڑکی زینو سے مشابہہ تھا۔ زینو بچپن سے میرے ساتھ کھیلی تھی اور میں اُسے پسند بھی کرتا تھا مگر مانیتی نے جوبا کی برہمی کے اندیشے سے وہ مجسمہ ریت میں دفن کرادیا۔ اُس کی دانست میں اپنی بیٹی کے لئے پانچسو قیراط سونے کی اُمید رکھنے والا جوبا یہ پسند نہ کرتا کہ جبرین کے ایک مفلوک الحال چرواہے کا بیٹا زینو سے چپکے چپکے محبت کرتا ہے۔

پھر ایک روز میں نے مانیتی کے خیمے پر قرونِ اولیٰ کی طرز کی شہزادیوں کے لباس اور طلائی تاج میں ملبوس ایک حسین اور پُرشکوہ شہزادی کو دیکھا۔ مانیتی نے مجھے للکارا اور میں بدحواس ہوکر بستی میں جا پہنچا۔ مجھ پر تیز بخار اور ہذیان کی کیفیت کئی دن طاری رہی۔ اس دوران میں میرا منہ بولا باپ اونٹ کی پشت سے گر کر ہلاک ہوگیا۔

جوبا نے مجھے بستی میں سنگتراشی کی اجازت دینے سے سختی سے انکار کردیا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں نخلستان ہی میں اپنا شوق پُورا کرسکتا ہوں۔ مگر مجھے مانیتی کے تصور ہی سے وحشت ہونے لگی تھی۔ میں نخلستان کا رُخ نہ کرسکا۔

اسی کرب کے دوران میں مجھے علم ہوا کہ جوبا کی بیٹی زینو میری محبت میں گرفتار ہے لیکن میں اپنے دل میں اس کے لئے پسند سے بڑھ کر کوئی جذبہ محسوس نہ کرسکا۔ اسی روز بستی میں مالِ غنیمت کے ساتھ لائی لڑکیوں کی آبرو پر ہاتھ ڈالنے کے وحشیانہ مظاہروں سے میں بل کھا کر رہ گیا میری ماں نے جب روایات کے خلاف میرے منہ سے جوبا کے خلاف باغیانہ باتیں سنیں تو فرطِ خوف سے اُس کے دل کی دھڑکنیں خاموش ہوگئیں۔

اسی رات خواب میں مجھے مانیتی کے خیمے والی حسین شہزادی نظر آئی۔ میں عالمِ خواب میں بنتِ نیل سے محوِ تکلم ہی تھا کہ اذیت سے آنکھ کھُل گئی۔ نیم اندھا مانیتی اپنی آہنی شام والی چھڑی سے مجھے پیٹ رہا تھا۔

وہ بنتِ نیل کی بُو سونگھتا نخلستان سے میرے خیمے تک پہنچا تھا اور مجھے اس جرم کی سزا دینا چاہتا تھا کہ میں نے اُس کی ایک باندی کو خواب میں دیکھنے کی جسارت کی تھی۔

مجھے خاصا زدوکوب کرنے کے بعد وہ بنتِ نیل کے بارے میں زبان بند رکھنے کا دھمکی آمیز حکم دیتا واپس لوٹ گیا۔

اس کے چلے جانے کے بعد مجھے علم ہوا کہ میری منہ بولی ماں پچھلی شب مرچکی ہے جھونپڑے پر سُرخ پرچم بلند ہوتے ہی جبرین والے تعزیت کے لئے میرے جھونپڑے پر آنے لگے۔ اسی ہجوم کے عقب میں بنتِ نیل کا مسکراتا ہوا دعوت انگیز چہرہ نظر آیا اور میں دیوانہ وار اس کے پیچھے ہولیا۔

میں محبت کے لازوال جذبے سے سرشار ہانپتا کانپتا اُس کے تعاقب میں نخلستان تک پہنچا اور درختوں کے کنج میں اُس نے اپنی کہانی سنائی۔

وہ وادئ نیل کے ایک حکمراں کی اکلوتی بیٹی تھی، طوسیہ اُس کا نام تھا اور وہ مسلک کے اعتبار سے صنم پرست تھی۔ اُس کے جری باپ نے دُور دُور کے علاقے قوت کے زور سے سر کئے اور آگ کو پُوجنے والوں کو دل کھول کر خون میں نہلایا۔ اس کا یقین تھا کہ آگ بدی ہے اور اُس کے پجاری ہرگز نیک نہیں ہوسکتے اس کے خوف سے بہت سے قبیلے بے سروسامانی کے عالم میں صحرا کی بے کراں وسعتوں میں روپوش ہوگئے۔ ان ہی میں جبرین والوں کا قبیلہ تھا۔ جبرین والوں کے پروہت نے روپوشی کے بعد اپنی ذلت کا انتقام لینے کے لئے پُراسرار قوتوں کے سہارے وادئ نیل کے اس حکمراں کی عزت پر وار کیا۔ طوسیہ کی رُوح اُس کے بدن سے نکل کر اس مجوسی پروہت کی قید میں آگئی اور اُس کا بے جان بدن ایک دیوہیکل صندلی معبد میں رکھ دیا گیا۔ اس طرح طوسیہ کی رُوح صدیوں سے نسل در نسل جبرین کے پروہتوں کی قید میں چلی آرہی تھی۔ اس کی رہائی اسی روز ممکن تھی جب اس کا راز عام ہوکر پروہت کے علاوہ جبرین کے ہر باسی کو معلوم ہوجاتا۔ ایسی صورت میں وہ دوبارہ اپنے جسم میں لوٹ سکتی تھی۔ میں نے اس کی کہانی عام کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ گھبرا گئی۔ اس طرح وہ تو ضرور آزاد ہوجاتی لیکن مانیتی شکست کے بعد مجھے زندہ نہ چھوڑتا۔ جبکہ وہ میری محبت میں گرفتار ہوچکی تھی۔

وہ صنم پرست تھی اور میں صنم تراش۔ میں نے اپنے دل کی گہرائیوں میں طوسیہ کے لئے محبت محسوس کی۔ اس روز مجھے اندازہ ہوا کہ سردار جوبا کی لڑکی زینو مجھے پسند ضرور تھی لیکن مجھے اس سے محبت ہرگز نہیں تھی۔ نخلستان کی رُومان افروز تنہائی میں میں نے طوسیہ کے کاکلی رخسار میں عجب طمانیت محسوس کی۔ وہ خود صرف ایک روح تھی اور مجھ سے ملاپ کے لئے اُس نے سردار جوبا کی اکلوتی لڑکی، زینو کا پیکر چرایا ہوا تھا۔ زینو کے خدوخال وقتی طور پر طوسیہ کے نقوش میں ڈھل چکے تھے اور زینو اس سے لاعلم تھی۔

پھر اچانک مانیتی اور جوبا وہاں آپہنچے اور مجھے طوسیہ کی جگہ زینو لیٹی ہوئی نظر آئی

مانینی اپنی پُراسرار قوتوں کے سہارے فضاؤں میں رچی ہوئی بُو سونگھ کر ساری کہانی سمجھ گیا لیکن حقیقت کا نام نہ لے سکا۔ ادھر جوبا کو یقین ہو گیا کہ میں نے زینو کو گمراہ کر دیا ہے

جوبا نے طیش کے عالم میں زینو کو عاق کر دیا، میں نے اسے اپنی زر خرید کنیز بنا لیا اور پھر جوبا کے ایک غلام کی نگرانی میں قید کر دیا گیا تاکہ چاند کی آخری شب کو اُس کی کنیزیں مجھے مقدس الاؤ پر الٹا لٹکا کر ہلاک کر سکیں

زینو جوبا کی چہیتی بیٹی تھی۔ شام کو جوبا نے مجھے فرار کی سنسنی خیز پیشکش کی۔ اس کے اور مانینی کے درمیان نفرتوں کی خلیج حائل تھی۔ جوبا کا منصوبہ یہ تھا کہ میں عاطیس دیوتا کا ایک بُت تراشوں جسے کسی طرح مانینی کے خیمے پر پہنچا دیا جائے پھر جبرین والوں کو بھڑکا دیا جائے کہ مانینی چھپ چھپ کر پتھر کو پوجتا ہے، لوگ مشتعل ہو کر مانینی کے ٹکڑے اُڑا دیتے اور جبرین پر جوبا کی گرفت مضبوط ہو جاتی۔ اس خدمت کے صلے میں وہ مجھے اپنی بیٹی زینو اور زادِ راہ سمیت رہا کرنے کو تیار تھا جبکہ مجھے مانینی کی موت میں طوسیہ کی نجات نظر آ رہی تھی۔

میں نے اپنے خیمے میں عاطیس دیوتا کا بُت تراشنا شروع کر دیا اُدھر خبیث مانینی کے چند حربوں نے سردار جوبا کو بوکھلا کر رکھ دیا اور وہ اپنی سازش سے کنارہ کش ہو گیا مگر میں نے جان پر کھیل کر مجسمہ تیار کر ہی لیا۔ اس دوران میں گونگا اور بہرا غلام، طالیس انتہائی اذیت کے عالم میں یہاں آ پہنچا اُس کی آنکھوں میں لرزا دینے والی ویرانی ناچ رہی تھی، اس کا داہنا ہاتھ کہنی کے جوڑ سے ٹوٹا ہوا تھا اُس کے زخم سے خون کے فوارے بہہ رہے تھے اور وہ بائیں ہاتھ میں اپنی داہنی کلائی اٹھائے چیخ چیخ کر ہذیانی قہقہے لگا رہا تھا۔

پھر میری نگرانی پر مامور جوبا کا گونگا اور بہرا غلام طالیس میری مدد پر آمادہ ہو گیا وہ تحفہ کا بُت لے کر مانینی کے مسکن کی طرف گیا لیکن مانینی نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا اور اس کا داہنا ہاتھ کہنی کے جوڑ سے توڑ کر اُس پر اپنی مہر ثبت کر دی۔

طالیس کرب و اذیت سے پاگل ہو کر میرے قید خانے میں پہنچا تو جوبا پہلے سے میرے پاس موجود تھا جو اپنے غلام کا حشر دیکھ کر لرز اُٹھا اور مجھ پر بد عہدی کا الزام لگانے لگا۔ مانینی کی مہر کو پہچان کر وہ اصل صورتِ حال سمجھ چکا تھا۔

پھر مانینی نے میری موجودگی میں طنز و تشنیع کے تیروں سے جوبا کا سینہ چھلنی کر دیا۔ اُسے ایک ڈرامائی حربے سے مجبور کر کے مجھے اپنی غلامی میں لے لیا۔ اس ٹکراؤ میں یہ بات واضح ہو گئی کہ جوبا سردار ہونے کے باوجود وہم پرست اور مانینی کی پُراسرار قوتوں سے بُری طرح خائف ہے۔

میری موت کی سزا اس ٹکراؤ کے نتیجے میں ٹل گئی اور مانینی جوئے میں جیتی ہوئی تیس کنیزوں کا کارواں لے کر جبل نامی ایک صحرائی بستی کی طرف چل دیا جہاں کے امرا کنیزوں کی اونچی بولیاں لگانے کے عادی تھے۔ میں نے راستے میں فرار کی کوشش کی لیکن میرا اونٹ مانینی کی مرضی کا غلام تھا۔ موقع پاتے ہی وہ مجھے اپنے منہ میں دبوچ کر مانینی کے پاس لے بھاگا۔

مانینی کا کارواں ایک جگہ کھنڈرات میں خیمہ زن تھا۔ وہاں مانینی نے میری نگاہوں کے سامنے چابک کی ضربوں سے ایک دراز قامت کنیز کو بے رحمی سے ختم کر ڈالا تاکہ موت کی دہشت سے دوسری کنیزیں مسکراتی رہنے پر مجبور ہو جائیں۔ مانینی کی دانست میں اُداس صورت کنیزوں کے دام لگنے مشکل تھے۔

صحرا میں سفر کرتے جب رات کے وقت ہم ایک غنودہ بستی کے قریب پہنچے تو مانینی چونک پڑا بستی سے باہر جمع ہو جانے والوں کے درمیان مانینی تحیّر آمیز آواز میں بولا

"ارے یہ کیا...... ہم شاید غلط جگہ آ گئے ہیں"

وہ بستی جبل والوں کی تھی، اُن کے مکانوں پر کالے علم لہرا رہے تھے، ایک نوجوان نے بتایا کہ جبل والوں کو ایک سنگتراش کی سخت ضرورت ہے، اور جب اُسے پتہ چلا کہ میں سنگتراش ہوں تو وہ سردار کے پاس دوڑا چلا گیا، مانینی، اُس کی کنیزیں اور میں ایک سرائے میں ٹھہر گئے۔ تھوڑی دیر بعد جبل کے سردار کی فوج کا سپہ سالار سرائے میں پہنچا اور ہم دونوں کو اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ مانینی اور میں باہر کھڑی ہوئی رتھ پر سوار ہو گئے جبل کے سردار نے ہمارا پُرجوش خیر مقدم کیا، اُس نے بتایا کہ جبل والے عاطیس دیوتا کے پجاری ہیں

پچھلے دنوں جبل میں بڑی سخت بارش ہوئی اور بجلی گرنے سے عاطبس دیوتا کا سنگی مجسمہ ٹوٹ پھوٹ گیا، یہی وجہ ہے کہ مکانوں پر کالے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ مانینی نے پہلے تو مجھے منحوس قرار دیا، اس طرح بات نہیں بنی تو دھمکیاں دینے لگا، وہ کسی صورت میں مجھے جبل والوں کے حوالے کرنے پر تیار نہیں تھا لیکن مانینی کو اپنے ارادے میں کامیابی نہیں ہوئی، اُسے مجھے جبل والوں کے حوالے کرنے کی حامی بھرنی پڑی، سرائے پہنچ کر مانینی نے مجھے طوسیہ کی کہانی عام نہ کرنے کا حکم دیا اور کہا کہ میں جبرین کی بستی کا ذکر بھی جبل والوں سے نہ کروں، دوسرے دن مانینی نے اپنی انیس کنیزوں کو جبل والوں میں نیلام کر دیا اسی شام جبل کی فوج کا سردار افراہیم مجھے لینے سرائے آ پہنچا، وہ مجھے رتھ میں بستی سے دُور ایک میدان میں لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد سردار ایک کاہن کے ساتھ وہاں آن پہنچا کاہن کے ساتھ میرے اوزار بھی تھے، اس نے کچھ پُراسرار تجربات کئے اور ہاتھ اٹھا کر ایسی باتیں کہیں جس سے مجھے پتہ چلا کہ جبل والوں کا طوسیہ سے بڑا گہرا تعلق ہے، اتنے میں وہاں طوسیہ آن پہنچی، اُس نے مجھے بتایا کہ مانینی نے اسے آتشی غاروں میں قید کر دیا تھا، طوسیہ کی خوشبو سونگھ کر مانینی بھی وہاں پہنچ گیا اور جبل والوں سے اُلجھ پڑا، کچھ نوجوانوں نے مانینی کے کپڑے اتار کر اُس کی خوب مرمت کی اور اُسے ایک پاگل اونٹ پر بٹھا کر بھگا دیا پھر جبل والے وہاں سے چلے گئے اور میں ایک چٹان سے عاطبس دیوتا کا بُت تراشنے لگا کاہن نے مجھے بتایا تھا کہ مجسمہ بنانے میں عاطبس دیوتا خود میری مدد کرے گا۔ میں تیسرے دن شام تک مجسمہ تراشتا رہا۔ چوتھے دن شام کو ایک سراسیمہ نوجوان اونٹ پر سوار میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ جبل پر نقاب پوش لوگوں کی ایک فوج نے حملہ کر دیا ہے۔ میں فوراً قاصد کے پیچھے بیٹھ گیا، اُس کا اونٹ بڑی طرح بڑکا اور وحشیانہ رفتار سے بستی کی طرف دوڑنے لگا

جبل کی دھرتی خوفناک جنگی نعروں سے لرز رہی تھی۔ انسانی لہو کی بُو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اونٹ تیزی سے بھاگا۔ میں غیر متوقع طور پر گر گیا۔ میری چیخ کی آواز سُن کر ایک جوان لڑکی نے مجھے اٹھایا اور مجھے بتایا کہ حملہ آور اپنے چہرے سیاہ نقابوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔ جنگ عروج پر تھی حملہ آور پسپا ہو رہے تھے۔ مانینی کے الفاظ میرے ذہن میں گونج رہے تھے۔ اُس نے جبل کے سردار کے سامنے جبل کی سرزمین پر خون کی ہولی کی باتیں کی تھیں فصیل کے باہر سے آنے والے تیر سے جبل کا سردار زخمی ہو گیا۔ سردار کے زخمی ہونے کی خبر پا کر جبل والوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ قدیم قبائلی رسم کے مطابق جس کا سردار پہلے مارا جائے وہ اپنے ہتھیار پھینک کر جیتنے والے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔ افراہیم میری باتوں میں آکر سردار کی موت کا راز چھپانے پر آمادہ ہو گیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ جبل پر حملہ آور مجوسی قزاق ہیں۔ میں نے یہ سازش جبل والوں کی بہتری کے لئے کی تھی۔ سردار کی لاش ٹھکانے لگانے کے بعد ہم نے تہہ خانہ کا دروازہ بند کر دیا۔ کمرے میں ہلکی سی آہٹ پر گھوم کر دیکھا جبرین کا خبیث فطرت مانینی وہاں موجود تھا۔ جنگ میں شکست جبرین والوں کا مقدر بن چکی ہے۔ وہ بند دروازے کی جانب بڑھا۔ دروازہ خود بخود کھُل گیا جبل والوں کا جوش و خروش عروج پر تھا۔ باہر والوں کے حوصلے پست ہوتے جا رہے تھے۔ میدان میں گنتی کے چند سیاہ پوش سوار رہ گئے تھے۔ اچانک آندھی اور طوفان کی رفتار سے جبرین کا خبیث بوڑھا مانینی میدان جنگ میں آ گیا۔ اُس نے اپنے ہاتھ سے نیزہ بلند کیا جس میں جبل کے سردار کی کھوپڑی نظر آ رہی تھی۔ جبل والوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ مانینی کے کہنے پر جبل والے افراہیم پر ٹوٹ پڑے۔ میرے لئے فرار بہتر تھا۔ مانینی کی چیخیں میرے تعاقب میں تھیں۔ جذبات کی شدت سے میں نے طوسیہ کو یاد کیا۔ بے شمار گھنٹیوں کے دھیمے دھیمے ترنم کے شور میں طوسیہ آ گئی۔ اُس نے بتایا مانینی کی قید میرا مقدر ہے۔ تھکن سے چور میں طوسیہ کی پُرسکون آغوش میں سو گیا۔ جب آنکھ کھُلی تو اونٹ پر سوار تھا۔ وفادار جانور مجھے آئل فیلڈ پر لے آیا تھا۔ آئل فیلڈ پر خوابناک سکوت طاری تھا۔ ورکشاپ کے قریب میری ملاقات برجر سے ہوئی۔ میں نے ٹوٹی پھوٹی عربی میں اس سے پناہ مانگی۔ برجر بڑے کھُلے دل کا انسان تھا۔ ایک بنگلے پر پہنچ کر برجر نے میرا تعارف خوبصورت سلوانا سے کرایا۔ تنہائی پاتے ہی اُس کی آنکھوں میں ہوس کی بجلیاں کوند رہی تھیں۔ میں نے جوں ہی سلوانا کے لبوں کی حرارت چرانی چاہی۔ سلوانا کا خونخوار کتا غرا کر لپکا اور اپنے دہشتناک جبڑے میں اس کا گلا دبوچ لیا۔ آنے والوں میں برجر سب سے آگے تھا سلوانا کی خون میں نہائی ہوئی ادھڑی لاش فرش پر پڑی تھی۔ سلوانا کا کتا رحم انگیز آوازیں نکالتا ہوا تڑپ رہا تھا۔ برجر غصے اور انتقام کے جذبے کے زیر اثر میرا گریبان پکڑے مجھے بُری طرح پیٹ رہا تھا۔ حالات مایوس کن تھے

اچانک ایک جانی پہچانی کرخت آواز سُن کر میرا دل بیٹھنے لگا۔ کوئی تحکمانہ آواز میں کہہ رہا تھا۔ ایک بستی کو خون کا غسل دے کر معصوم اور بے گناہ بن کر وہ تمہارے درمیان آ چھپا ہے۔ وہ ہمارا مجرم ہے۔ اُسے ہمارے حوالے کر دو۔ برجر نے مجھے خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے اونچی آواز میں جواب دیا۔ تم جو کوئی بھی ہو اندر آ سکتے ہو۔ تمہارا خونی مجرم ایک لاش سمیت یہاں موجود ہے۔ باہر کئی آدمیوں کے آہٹ سُنائی دی اور میں آنے والے واقعات کے لئے تن بہ تقدیر ہو گیا۔

وہ آواز مانینی کی تھی جو میری بُو کے سہارے صحرا کے سینے کو روندتا اپنے رفیقوں سمیت آئل فیلڈ تک آ پہنچا تھا، اس کے ساتھ سردار جوبا بھی تھا۔ مانینی نے میرے عوض برجر کو چند حسین و جمیل کنیزوں کی پیشکش کی جسے عیاش برجر نے منظور کر لیا۔ مانینی نے سردار جوبا اور اپنے آدمیوں کو کنیزیں لینے بھیج دیا لیکن اُس نے اپنی باتوں سے برجر کو سخت خوفزدہ کر دیا۔ برجر مجھے اپنے چوبی بنگلے میں لے گیا اور سارے دروازے کھڑکیاں بند کر دیں، اس نے کہا کہ وہ مجھے مانینی کے حوالے کرنے کا ارادہ ملتوی کر چکا ہے۔ چند ہی لمحوں میں مانینی پُراسرار طریقے سے وہاں پہنچ گیا، پھر نہ جانے کیا ہوا کہ میں تیورا کر فرش پر گر گیا۔ گرتے گرتے میں نے برجر کی غراہٹ سُنی، وہ کچھ کہتا ہوا مانینی کی جانب لپکا تھا۔ ہوش میں آنے پر میں نے برجر کو فرش پر بے ہوش پڑے ہوئے پایا۔ اُسے مانینی نے زخمی کر دیا تھا۔ برجر نے بتایا کہ آئل فیلڈ میں دو ہیلی کاپٹر ہیں۔ ہم دونوں آج رات موقع پاتے ہی فرار ہو جائیں گے۔ پھر برجر وہاں سے رخصت ہو گیا، کچھ دیر بعد طوسیہ وہاں پہنچ گئی، اُس نے بتایا کہ مانینی میرے فرار کی وجہ سے پریشان ہے کیونکہ میں طوسیہ کی قید کا راز جان چکا ہوں اور اُسے ڈر ہے کہ اس کے طلسم سے رہائی پاتے ہی میں مانینی کے جدّی انتقام اور طوسیہ کی قید کی کہانیاں عام کر دوں گا اور وہ ذلیل و رسوا ہو کر مارا جائے گا۔ طوسیہ نے مجھے اپنی محبت کا یقین دلایا۔ کچھ دیر بعد طوسیہ چلی گئی اور برجر واپس آ گیا، وہ خاصا بوکھلایا ہوا تھا، ہم دونوں اس جگہ پہنچے جہاں دو ہیلی کاپٹر کھڑے ہوئے تھے، ہم دونوں ایک ہیلی کاپٹر میں بیٹھ گئے، ہمارا ہیلی کاپٹر ابھی کچھ ہی اوپر پہنچا تھا کہ نیچے سے ہم پر فائرنگ ہونے لگی مگر ہم صاف بچ نکلے۔ ہیلی کاپٹر اڑتا رہا اور پھر پٹرول ختم ہو جانے کے باعث برجر نے اُسے صحرا میں اُتار دیا۔ ہم اسے چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ چلتے چلتے میں بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو ایک خوفناک چہرہ میرے سامنے آیا "اسے یہاں لے آؤ" ایک پاٹ دار آواز گونجی اور میں بے اختیار اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔

اب آگے پڑھیئے

میرے گرد جمع ہونے والے سب ہی لوگ میرے شناسا تھے۔ اُن میں سب سے پیش پیش صحرائی قزاقوں کی بستی، جبرین کا سردار جوبا تھا۔ اُس کے زخم خوردہ چوڑے چکلے چہرے پر غیض و غضب کی پرچھائیاں ناچ رہی تھیں اور اس کی قہر بار نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"گھسیٹ لاؤ اسے ادھر!" وہی پہلے والی سرد اور کرخت آواز دوبارہ اُبھری!

میرے گرد جمع ہونے والے لوگوں کے چہروں پر خوف دہشت اور تذبذب کی علامات نمایاں تھیں۔ حکم ملنے کے باوجود وہ اپنی

اپنی جگہ پر ٹھٹکے ہوئے تھے اور دزدیدہ نظروں سے اپنے سردار جوبا کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے اُس کی اجازت کے طلب گار ہوں!

"کیا فہر ہے" وہی آواز جھلّائے ہوئے لہجے میں سُنائی دی "صحرائی ہوائیں اور ریت کے بگولے تک مانینی کے غلام ہیں، اُس کے اشاروں پر ناچتے ہیں لیکن آج اسی کی بستی کے لوگ اُس کے حکم سے جان چُرا رہے ہیں۔!"

"مقدس مانینی!" جوبا نے مُڑ کر نرم آواز میں کہا اور پھر اتنی قوت سے اپنے جبڑے بھینچے کہ اُس کے چہرے کی تمام وریدیں جلد پر اُبھر آئیں۔

"کہہ دے... آج تجھے بھی کُھلی چھوٹ ہے جو چاہے کہہ دے!" مانینی نے جوبا کے دوبارہ بولنے سے قبل ہی غصیلی آواز میں غرّا کر کہا۔ "حسین کی پیشانی پر نحوست کی مُہر ثبت ہے۔" جوبا کا لہجہ اس بار بھی پُرسکون تھا لیکن اُس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اندر ہی اندر غیض و غضب سے کھول رہا ہے۔ "اور یہ تیرا غلام ہے، تو جانتا ہے کہ حسین کی خاطر ہم نے جبل کی بستی کو تاراج کر ڈالا، مردوں کی گردنیں اُڑا ڈالیں، بچّوں اور بوڑھیوں کو کنوؤں میں غرق کر دیا اور وہاں کی کنواریوں کو ہم اپنی کنیزیں بنا کر ہانکتے ہوئے جبرین میں لے آئے۔ اب ہم ڈرتے ہیں کہ اس کی وجہ سے کہیں جبرین پر بھی قحط اور بربادی کے سائے نہ منڈلانے لگیں!"

"مانینی پہیلیوں سے چڑتا ہے جوبا۔" وہ خبیث بوڑھا طنزیہ لہجے میں بولا۔ "تو اپنے دل کی بات صاف صاف کہنے سے کیوں ڈرتا ہے۔!" "محترم اور مقدس مانینی!" جوبا کے وجود میں دہکتا ہوا آتش فشاں اب بھی پُرسکون رہا اور وہ صلح جویانہ لہجے میں بولا۔ "یہ تیرا اور تیرے غلام کا معاملہ ہے، کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تو جبرین والوں کو اس سے دُور ہی رکھے، تو اس سے تنہا بھی خوب نمٹ سکتا ہے!"

مانینی نے پُرشور آواز میں ایک بھیانک قہقہہ لگایا۔ "ہاں ہاں، میں تنہا بھی اس سے نمٹ سکتا ہوں اور وہی کیا مانینی تجھے بھی مَسل ڈالنے کی قدرت رکھتا ہے!"

جوبا نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا اور میرے گرد جمع ہونے والی بھیڑ تیزی کے ساتھ چھٹ گئی۔

اِس وقت معاً مجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے گہری نیند کے عالم میں میرے سر پر وزنی ڈنڈا دے مارا ہو۔ میں بوکھلائے ہوئے انداز میں ریتیلی زمین پر سے اُٹھتا چلا گیا۔

جبرین کے بسنے والے مجوسی قزّاقوں کا مسلّح کارواں اپنے سردار جوبا کی قیادت میں تیزی کے ساتھ بستی کی جانب چلا جا رہا تھا۔ میں اس وقت بستی سے چند سو گز باہر ریتیلے صحرا میں موجود تھا۔ صحرا کی رات دم توڑ چکی تھی اور مشرقی اُفق سے طلائی کرنوں کے جال میں لپٹا ہوا سورج طلوع ہو چکا تھا۔ اُس کی روشنی میں استخوانی بدن، چندھیائی ہوئی آنکھوں اور خوفناک خدوخال والا مانینی مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر دونوں ہاتھ اپنے کولہوں پر جمائے فاتحانہ شان سے کھڑا ہوا تھا۔ اُس کی نگاہیں اپنے مقابل کھڑے ہوئے سفید فام، بر جریر مرکوز تھیں جس کے ہمراہ آئل فیلڈ سے فرار ہونے کے بعد میں ایک ریتیلے گرداب کا شکار ہو گیا تھا!

بر جریر کا لباس تار تار ہو رہا تھا جیسے بہت سے بھوکے بھیڑیوں نے اُس پر یلغار کی ہو۔ اُس کے چہرے کا رنگ دھواں ہو رہا تھا اور آنکھوں میں دہشت رچی ہوئی تھی۔ اس کی حالت کسی خونی باز کے پنجوں میں پھنسے ہوئے خوفزدہ پرندے سے مشابہ تھی اور وہ رحم طلب نگاہوں سے بوڑھے مانینی کے چہرے کی جانب تکے جا رہا تھا جیسے اُسے وہاں سے نجات کا اشارہ ملنے کی اُمید ہو۔

"حسین!" مانینی نے خلا میں کسی نامعلوم نقطے پر نگاہیں جما کر مجھے پکارا۔ بے اختیار میرے قدموں کو جنبش ہوئی اور میں کسی سہمے ہوئے چوہے کی طرح اُس کے سامنے پہنچ گیا۔

"اسے کہیں لکھ کر رکھ لے" مانینی کی کرخت اور بھونڈی آواز گونجی "صحرا کے ذرّے ذرّے پر میری گرفت بہت مضبوط ہے، تو اتنی آسانی سے مجھ سے نجات نہ پا سکے گا۔ میری رسائی صحرا کے ہر گوشے میں ہے اور مجھے فریب دے کر صحرا سے فرار ہونا بہت دشوار ہے۔ تیرا بہکایا ہوا جوبا کا غلام، طالیس آج بھی ایک ہاتھ سے معذور جبرین کی فضاؤں میں منہ اُٹھائے روتا پھرتا ہے لیکن اُس پر جبرین کے ہر گھر کے دروازے بند ہیں اور وہ آوارہ کتّوں کے منہ سے بچی ہوئی ہڈیوں پر گزارا کرتا ہے، وہ گونگا تیرے لئے عبرت ہے اور آج سے میں اسی کو تیرا اوپر مامور کرتا ہوں!"

جوبا کے گونگے شہہ زور طالیس کا نام سنتے ہی میرا رواں رواں کانپ اُٹھا۔ اور مجھے جبرین کے سردار کی قید میں گزارے ہوئے وہ دن یاد آگئے جب میں نے اپنی راتوں کا خون کر کے تھرکتے کلیجے کو چھلنی کر کے عاطیس دیوتا کا پیکر تراشا تھا لیکن مانینی کی شب بیدار نگاہوں کو فریب دے کر طالیس وہ مجسمہ نخلستان تک نہ پہنچا سکا اور مانینی نے بے رحمی سے اُس کا داہنا ہاتھ توڑ ڈالا۔

ابھی میں اُس مخلص گونگے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ فضا ہولناک چیخوں اور قہقہوں سے گونج اُٹھی۔ اِن آوازوں میں بلا کا کرب رچا ہوا تھا۔

"سُن رہا ہے" مانینی نے مسرّت آمیز آواز میں مجھ سے کہا۔ "یہ تیرے ہمدرد، طالیس کی کربناک صدائیں ہیں لیکن یہاں کوئی نہیں جو اُس کی مدد کر سکے"

"میں کہاں آپھنسا ہوں.. میرے خدا!" بربر مجھ سے مخاطب ہو کر دہشت زدہ آواز میں کراہا۔

"یہ مانینی کا مسکن ہے او گوری چمڑے والے!" مانینی اپنی چندھیائی ہوئی آنکھیں بربر کے چہرے پر گاڑ کر آہستہ سے بولا۔

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو.. خدا کے لئے مجھے واپس جانے دو، میں تمہارا ہر مطالبہ پورا کرنے پر تیار ہوں"۔ بربر تقریباً رو دینے والی آواز میں بولا۔ "تیری آزادی اب ایک خواب بن کر رہ جائے گی"۔ مانینی اُس کی حالت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ "جبرین ایک راز ہے اور اس راز کے جاننے والوں کو باہر کی دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔"

اسی اثنا میں جوبا کا گونگا اور بہرا غلام، طالیس وہاں آپہنچا آوارہ کتّوں کی ایک جماعت اُس پر بھونکتی ہوئی وہاں تک آئی تھی ۔ وہ کتّے اپنے دانت چمکاتے طالیس پر غرّا رہے تھے اور وہ مکّے لہرا لہرا کر انہیں خود سے دُور رکھ رہا تھا۔ اُس کے بدن پر لباس کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا تھا اور صحرائی دھوپ میں آوارہ پھرنے کے باعث اُس کی سیاہ رنگت اور بھی جھلس کر رہ گئی تھی۔ اُس کے پورے بدن اور چہرے پر لمبی لمبی پُرانی اور تازہ خراشوں کے نشانات تھے جن میں سے جابجا گاڑھا گاڑھا خون رِس رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر وحشت اور دیوانگی کے ہولناک سائے ناچ رہے تھے اور وہ اپنی بے رونق آنکھوں میں اجنبیت کا احساس لئے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

"یہ آوارہ کتّوں سے لڑ کر اپنی خوراک حاصل کرتا ہے"۔ مانینی کا لہجہ اِس بار آسودہ تھا" اور ان مقابلوں میں اکثر یہ لہولہان ہو جاتا ہے مگر پیٹ کا جہنم اُسے مجبور کر دیتا ہے۔ یہ میرے خلاف سازش کرنے والے ایک مجرم کا حشر ہے اور میں تم دونوں پر بھی رحم نہیں کروں گا"۔

"بابا! مجھے معاف کر دو!" بربر کانپتی ہوئی آواز میں بولا اس کا چہرہ دہشت سے تاریک پڑ چکا تھا" میں اب بھول کر بھی صحرا کا رُخ نہیں کروں گا اور ہمیشہ میری زبان بند رہے گی!"

"خاموش!" مانینی پوری قوّت سے دہاڑا۔ پھر اُس نے جنبشِ ابرو سے طالیس کو اشارہ کیا اور وہ دیوانہ کتّوں کو بھول کر میری طرف بڑھنے لگا، مانینی کے اشارے پر سارے کتّے خوف زدہ آوازیں نکالتے اِدھر اُدھر بھاگ نکلے۔ اِس سے قبل کہ میں طالیس کا عندیہ سمجھ پاتا اُس نے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر مجھے اپنی پشت پر لاد لیا۔ پھر اُس نے بربر کا بھی یہی حشر کیا اور ہم دونوں کو اپنی پشت پر لاد کر بستی کی جانب لے چلا۔ مانینی اس کے چلنے کا اِنتظار کئے بغیر ہی بستی کی جانب روانہ ہو چکا تھا۔!

طالیس اپنی دیوانگی کو بھول کر کسی وفادار کتّے کی طرح ہمیں اپنی پشت پر لادے بے تکان مانینی کے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ اُس کے غلیظ بدن سے پھوٹنے والی بو سے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا اور بربر تو اس سیاہ فام وحشی کی بے رحم گرفت میں آتے ہی بے ہوش ہو چکا تھا۔

ہم بستی میں داخل ہوئے تو جبرین والوں کی اونچی آوازیں یک بیک ماند پڑ گئیں۔ راستوں سے گزرنے والے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر اپنی اپنی جگہ رُک گئے، شتر سواروں کے اونٹ بلبلاتے ہوئے زمین پر بیٹھ گئے، جیسے مانینی کے سامنے اُن کے قدموں کی سکت دم توڑ چکی ہو، راستے کے دونوں جانب بنے ہوئے خیموں اور جھونپڑوں میں رہنے والے ادب اور احترام کے ساتھ اپنے دروازوں پر نکل آئے تھے اور سر جھکا جھکا کر اپنی بستی کے مقدّس پروہت کو تعظیم دے رہے تھے!۔ مانینی پُروقار انداز میں سر کی جنبش سے ان کی تعظیم قبول کرتا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اُس کے گزر جانے کے بعد جبرین والوں کی متحیرانہ نگاہیں دور تک ہمارا تعاقب کر رہی تھیں!

سردار جوبا کے خیمے کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے تند خو اور بدمزاج سردار کو دست بستہ سر جھکا کر مانینی کو تعظیم دیتے دیکھا پھر ہم جبرین کی اس چوپال کے نزدیک پہنچے جہاں جبرین کی بے یار و مددگار اور روایات شکن عورتیں اور لڑکیاں بٹھا دی جاتی تھیں اور اُن کے جسموں پر رشتوں کے امتیاز کے بغیر جبرین کے ہر مرد کا مساوی حق ہوتا تھا۔! مانینی کے گزرنے کی خبر پا کر چوپال والیاں بھی احترام کے ساتھ باہر آ چکی تھیں!

اُن ہی میں سردار جوبا کی جواں سال لڑکی زیتو بھی نظر آئی جس کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اُس کی بڑی بڑی غزالی آنکھوں میں اس شراب کا خمار تیر رہا تھا جو جبرین کے ہوس پرست بھیڑیئے اُس کے دہانے میں اُنڈیل دیتے تھے۔ اُس کے سارے چہرے اور جسم کے برہنہ حصوّں پر جبرین والوں کے دانتوں کے نیلے نیلے نشانات دُور ہی سے چمک رہے تھے!

زیتو۔۔ جو میری محبّت کا دم بھرتی تھی اور جس کا روپ چُرا کر میری پیاری طوسیہ مجھ سے ملتی رہتی تھی، اب بہت ہی جانگسل اور آبرو ریز حالات سے دوچار تھی۔ اُس کا سگا باپ اُس سے قطع تعلّق کر چکا تھا اور وہ اپنا نوشتۂ تقدیر پورا کرنے کے لئے چوپال میں پھینک دی گئی تھی! زیتو سمیت اِن تمام لڑکیوں نے دہشت اور خوف کے ملے جُلے تاثرات کے ساتھ سر جھکا کر مانینی کو تعظیم دی اور جب میں طالیس کی

پُشت پر لہرا آن کے قریب سے گزرا تو زنیو یکبارگی زور سے چیخ پڑی۔

"حسین... بیٹے سنگتراش کیا تو اب بھی زندہ ہے؟"

لیکن میں اُس کے جواب میں کچھ نہ کہہ سکا اور طالیس مجھے لئے تیزی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ خاصی دیر تک چلتے رہنے کے بعد آخر کار نخلستان کے پُرفضا مقام پر ہمارے سفر کا اختتام ہوا۔ مانینی کے حکم پر طالیس نے مجھے اور برجر کو درختوں کے ایک کنج میں نم آلود زمین پر ڈال دیا اور مانینی لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے خیمے میں جا گھسا!

تنہائی پاتے ہی میں نے طالیس کو جھنجھوڑ کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ مجھے پہچانتا ہے یا نہیں لیکن وہ اجنبی اور وحشتناک نظروں سے میری جانب دیکھتا رہا۔ جب میں نے کئی مرتبہ اُسے چھیڑا تو اُس نے غرّا کر غصیلے انداز میں میرے سر کے بال اپنی مٹھی میں بھینچ کر دو تین زوردار جھٹکے دیئے اور میرے سینے پر گھونسہ مار کر مجھے نیچے پھینک دیا۔

میرے حلق سے دبی دبی چیخ نکلی لیکن برجر نے مجھے سہارا تک نہیں دیا۔ وہ سہمے ہوئے انداز میں دُور کھڑا مجھے اس طرح گھورے جا رہا تھا جیسے میں کوئی ہولناک آسیب ہوں!

"میں کہاں پھنس گیا، نہ جانے یہ جادوگروں کی کون سی بستی ہے" دہشت سے میرا سینہ پھٹا جا رہا ہے... اوہ خدا! میں کیا کروں!"

برجر کراہتا ہوا ایک درخت کے تنے سے ٹک گیا۔ اسی اثنا میں مانینی اپنے خیمے سے برآمد ہوا! اُس کے داہنے ہاتھ میں زیتون کے تیل میں بھیگا ہوا ایک چرمی چابک تھا جسے وہ زور زور سے فضا میں گردش دے رہا تھا۔ برجر مانینی کو دیکھتے ہی کسی ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چلّانے لگا۔ اُس کی حالت بہت زیادہ ابتر تھی۔ اُس کی دہشت سے پھٹی ہوئی نگاہیں مانینی کے چابک کے ساتھ ساتھ گردش کر رہی تھیں۔

قریب آ کر مانینی نے وہ چرمی چابک طالیس کی طرف بڑھا دیا۔

طالیس نے قرونِ اولیٰ کے کسی خون آشام جلاد کی طرح اپنے دانت چمکا کر پھرتی کے ساتھ وہ چابک لے لیا اور مانینی کا اشارہ پا کر بے رحمانہ انداز میں برجر پر ٹوٹ پڑا!

طالیس اِس وقت دیوانے کے بجائے مانینی کا زرخرید غلام نظر آ رہا تھا۔ سیاہ فام غلام کو اپنی جانب آتا دیکھ کر برجر تیز چیخیں مارتا ہوا میری آڑ لینے کے لئے لپکا لیکن میں اس چابک کی دہشت کے باعث ایک طرف ہٹ گیا۔

وہ لمبا چابک فضا میں لہراتا ہوا برجر کی پنڈلیوں سے لپٹ گیا اور وہ دلدوز چیخ مار کر منہ کے بل زمین پر گر گیا اور اُس کے ہونٹوں سے خون کی دھاریں بہہ نکلیں!۔ طالیس اپنی جگہ پر چابک سنبھالے اُس کے اُٹھنے کا انتظار کرتا رہا۔!

"چل او نابکار... تیرا مقدر تجھے پھر اس نخلستان میں کھینچ لایا ہے!" مانینی نے سرد اور کرخت آواز میں مجھے للکار کر کہا۔

میں نے دل ہی دل میں اطمینان کا گہرا سانس لیا کہ چابک سے نجات ملتی نظر آ رہی تھی۔

مانینی مجھے ہمراہ لے کر خاموشی کے ساتھ نخلستان کے اُس کنوئیں کی طرف چل دیا جہاں سے نخلستان کی آبیاری کے لئے پانی حاصل کیا جاتا تھا۔ ہمارے عقب میں رہ رہ کر برجر کی جگر شگاف چیخیں سُنائی دے رہی تھیں۔ میں نے ایک بار پلٹ کر دیکھا تو لرز کر رہ گیا۔ برجر زخموں سے چور وحشت کے عالم میں ایک طرف دوڑ رہا تھا اور طالیس چرمی چابک اس پر برساتا اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس کے سیاہ چہرے پر اِس وقت دیوانگی کے بجائے گہرا سکون نمایاں تھا!

"مانینی کو فریب دینے کی سزا اس سے بھی مہیب ہو سکتی ہے حسین!" مانینی میری جانب دیکھے بغیر سرد آواز میں بولا۔ "تیرا گورا ساتھی اب سسکا سسکا کر اسی نخلستان میں مار ڈالا جائے گا اور کوئی اُس کی مدد کو نہ پہنچ سکے گا۔ پھر اُس کی اُدھڑی ہوئی لاش پر صحرائی گدھ رقص کرتے اُڑ جائیں گے۔!"

"مجھے رہا کر دے مقدس مانینی، تیرا راز امانت بن کر میرے سینے میں دفن ہے!" میں نے ڈرتے ڈرتے پہلی بار اس خونخوار بڈھے کو مخاطب کیا۔ "رہائی!" وہ بھیانک انداز میں ہنسا پھر سرگوشیانہ آواز میں بولا "طوسبہ کا راز تیرے سینے میں دفن ہے اور جب تک تو خود منوں مٹی تلے دفن نہیں ہو جاتا، مانینی تیرا پیچھا نہیں چھوڑ سکتا۔"

"مقدس مانینی! میری مظلومیت پر رحم کر دے اس نخلستان سے مجھے خوف آتا ہے۔ یہ سبزہ زار مجھ سے میری نیندیں چھین لے گا! مجھے جبرین میں واپس جانے دے۔"

"تو اس رعایت کا مستحق ہرگز نہیں ہے!" مانینی کا لہجہ کرخت ہو گیا "میں تجھے سازشوں کے لئے آزاد نہیں چھوڑ سکتا۔ اب تو اسی نخلستان میں رہے گا۔"

میں ایک گہرا سانس لے کر خاموش ہو گیا۔!

کنوئیں پر پہنچ کر وہ نحیف و نزار بڈھا ٹھہر گیا۔ میری نگاہیں پتھر کے ان دو بڑے ٹکڑوں پر پڑیں جو کنوئیں کی منڈیر کے قریب ہی گھاس کے قطعہ پر پڑے ہوئے تھے۔ ان پتھروں کے پاس میرے اوزاروں کا صندوق بھی تھا!

"تو نے ایک بار جویا سے مل کر میرے خلاف سازش کی تھی نا!" مانینی نے عجیب و غریب تائید طلب لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔ میں فیصلہ نہ کر سکا کہ اُس کی بات کا کیا جواب دوں!

آپ کا بہترین دوست...

جب آپ کو اپنی بیٹی کے بیاہ کی فکر ہو

کہیں ایسا نہ ہو کہ مالی مشکلات راستے کی رکاوٹ بن جائیں۔
کل کی سوچئے اور اسٹیٹ لائف کے نمائندے سے مشورہ کیجئے۔ وہ آپ کے لئے موزوں بیمہ پالیسی کا انتخاب کریگا۔
اپنی لاڈلی کے شاندار مستقبل کا تحفظ آپ کی ذمہ داری ہے، اور یقینی تحفظ کی راہ دکھانا اسٹیٹ لائف کے نمائندے کا خوشگوار فرض۔

اسٹیٹ لائف کا نمائندہ وقت پڑنے پر ہی نہیں،
وقت سے پہلے آپ کے کام آتا ہے
آپ کا ہمدرد، آپ کا بہی خواہ، آپ کا بہترین دوست!

قومی مستقبل کے لئے قومی ادارہ

اسٹیٹ لائف

انشورنس کارپوریشن آف پاکستان

IAL-SL-14-73

"بول حسین! مانینی نے تجھے ہی مخاطب کیا ہے۔" چند ثانیوں کے سکوت کے بعد وہ پھر بولا۔

"تو خود ہی سب کچھ جانتا ہے مقدس مانینی!" میں نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"ہاں میں جانتا ہوں" وہ تیز آواز میں بولا "اور تو نے جوبا کے ساتھ مانینی کے خلاف سازش کر کے تو نے ذلت اور رسوائی کا سامنا کیا تھا اور آج میں تجھے ایک سازش کی دعوت دیتا ہوں۔ جوبا کو ہماری بستی میں بہت طاقت مل گئی ہے۔ وہ میری پُراسرار قوتوں سے ڈر کر میرے سامنے جھکتا ہے ورنہ اُس کے دل میں میری عزت نہیں وہ مجھ سے باغی ہو چکا ہے اور اب اُس کی سزا یہی ہے کہ جبرین کے جن باسیوں کے بل پر وہ اکڑتا ہے اُن ہی کے ہاتھوں اُس کی بوٹیاں نچوا دی جائیں اور اس کا سر اُن ہی کے نیزوں پر بلند کیا جائے!"

ایک سازش کی سزا میں ابھی تک بھگت رہا تھا اور اب دوسری سازش کے تذکرے سے میرا رواں رواں کانپ اُٹھا جوبا کو گو غیر مرئی اور پُراسرار قوتوں کی حمایت حاصل نہیں تھی لیکن وہ کینہ پرور اور بے رحم شخص تھا۔ اُس نے اپنی جان کے خوف سے جس طرح اپنی بیٹی زینو سے دستبرداری اختیار کی تھی اس کے بعد ہی سے میں جوبا سے نفرت کرنے لگا تھا!

"مقدس مانینی تو مجھے مار کیوں نہیں دیتا!" میں نے شدید اندرونی اضطراب کے ساتھ کہا۔

وہ معنی خیز انداز میں ہنسا "کیا تو زندگی سے اتنا ہی بیزار ہو گیا ہے؟" اس سے پیشتر کہ میں کچھ کہتا بربر کی ہولناک چیخیں نخلستان میں چکراتی ہمارے قریب آ پہنچیں۔ اس کی سفید جلد پر جابجا نیلی دھاریاں اُبھری ہوئی تھیں۔ جلد پھٹ جانے کے باعث خون کی دھاریں بہہ رہی تھیں اور وہ نقاہت سے لڑکھڑاتا ہوا پناہ کی تلاش میں دوڑ رہا تھا لیکن طالیس فرشتۂ اجل کی صورت میں چابک پھٹکارتا اُس کے سر پر سوار تھا۔

مانینی کو دیکھتے ہی بربر کی نگاہوں سے قہر اور نفرت کی چنگاریاں برسنے لگیں۔ اُس نے اپنی پوری قوت سے کام لے کر دوڑ لگائی اور طالیس کے چابک کی زد سے نکل کر مانینی پر آ پڑا۔

بربر خاصا تندرست اور بھاری بھر کم شخص تھا لیکن مانینی کے قدم نہ لڑکھڑائے۔ بس اُس کے حلق سے ایک تحیر زدہ سی آواز نکلی اور پھر بربر نے اُس کا گلا دبوچ لیا۔

"تو اس صحرا کی بدروح ہے ۔۔۔ میں تجھے مار ڈالوں گا' تجھے فنا کر دوں گا۔" وہ مانینی کا گلا دبوچتے ہوئے ہذیانی انداز میں چلائے جا رہا تھا۔ اس سے پیشتر کہ بربر مانینی کو بے بس کر پاتا طالیس اُس کے سر پر آ پہنچا۔ اُس نے چابک ایک طرف پھینکا اور بائیں ہاتھ سے بربر کی گردن پکڑ کر اُسے زمین سے اوپر اُٹھاتا چلا گیا۔ مانینی اُچھل کر الگ ہٹ گیا اور اپنی گردن سہلانے لگا۔ اِدھر طالیس نے بربر کو کافی بلندی تک اُٹھا کر زمین پر دے مارا اور اُس کے اُٹھنے سے قبل ہی دوبارہ اُس کے سینے پر سوار ہو گیا۔

بربر اس کے نیچے بُری طرح تڑپا لیکن طالیس نے اپنا گھٹنا اس کے سینے پر رکھ دیا اور بائیں ہاتھ سے اُس کا گلا گھونٹنے لگا۔ بربر کے حلق سے ڈراؤنی آوازیں نکلنے لگیں۔ اُس کا بدن بُری طرح مچل رہا تھا' سانس رک جانے کے باعث اس کا سفید فام چہرہ سیاہی مائل رنگت اختیار کرتا جا رہا تھا!

چند ہی منٹ میں زندگی اور موت کا یہ معرکہ طے ہو گیا۔ بربر نہایت بے رحمی کے ساتھ موت کے گھاٹ اُتارا جا چکا تھا۔ بربر کا بدن پوری طرح ساکت ہونے کے بعد طالیس اُس کی لاش پر سے اُٹھ گیا۔ اِس وقت وہ اپنے بشرے ہی سے خونی نظر آ رہا تھا۔

جذبات سے عاری نگاہوں سے بربر کی لاش کو گھورنے کے بعد طالیس تیزی سے نیچے جُھکا اور ایک جھٹکے کے ساتھ اُسے اپنے کندھے پر لاد کر بستی کی طرف چل دیا۔

"تجھے اِن پتھروں پر عالیس کے پیکر تراشنے ہیں" طالیس کے چلے جانے کے بعد مانینی نے سرد اور جذبات سے عاری آواز میں مجھ سے کہا۔ اِس وقت مانینی کے تیور بہت خراب تھے اور میرے لئے اس سے بحث کی کوئی گنجائش نہیں تھی لہٰذا میں سر جُھکا کر ان پتھروں کی جانب بڑھ گیا۔! "میری نگاہیں ہر وقت تیرا پیچھا کرتی رہیں گی۔" مانینی اپنے خیمے کی جانب لوٹتے ہوئے تادیبی لہجے میں بولا "اور میں تیری بو پا کر پاتال تک پہنچ جاؤں گا۔ قسم اُس مقدس آگ کی جو ازل سے روشن ہے' اگر تو نے اس بار مجھ سے فریب کیا تو تیری زندگی کو عبرت کا یادگار نمونہ بنا دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ اپنی آہنی شام والی چھڑی ٹیکتا اپنے خیمے کی جانب چل دیا۔

میں نے بے بسی اور نا اُمیدی کے عالم میں اُن دونوں پتھروں کو دیکھا اور پھر اپنے اوزاروں کا صندوق کھولنے لگا۔ اس وقت تک سورج کافی بلندی پر آ چکا تھا۔ کرنوں کی تمازت سے زمین جھلسنے لگی تھی اور نگاہوں کو اس جھلسی ہوئی دوپہر کی تاب نہ تھی۔ لیکن میں اپنے کام کے لئے مجبور تھا۔

میں نے نیم دلی اور پژمردگی کے ساتھ اپنے کام کا آغاز کیا۔ ہلکے ہلکے ہاتھوں سے پتھر پر آہنی ضربیں لگائیں اور میرے ارد گرد سنگریزوں کی برسات ہونے لگی۔ اپنے کام کے ساتھ ہی غیر ارادی طور پر میری نگاہیں مانینی کے خیمے کا بھی طواف کر رہی تھیں۔ لیکن مانینی

اندر گھُسا نہ جانے کس کام میں مصروف تھا کہ دوبارہ باہر نکلتا نظر نہیں آیا
دن آہستہ آہستہ ڈھلتا رہا اور جب سورج تھکے تھکے قدموں سے مغربی وادیوں میں اُتر رہا تھا تو مجھے اپنے عقبی کنج میں ہلکی سی آہٹ سُنائی دی میں نے سرسری طور پر سر گھما کر پیچھے دیکھا لیکن وہاں کوئی نظر نہ آیا اور میں اس آہٹ کو اپنا وہم سمجھ کر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

ذرا ہی دیر میں سورج غروب ہو گیا اور وہاں ہر طرف سُرمئی اندھیرا پھیلنے لگا۔

جب تک میری نگاہیں کام کرتی رہیں میں سنگ و آہن میں اُلجھا رہا لیکن جب بڑھتا ہوا اندھیرا میرے لیے دشواریاں پیدا کرنے لگا تو میں نے ہاتھ روک لیا۔

اندھیرا پھیل جانے کے باوجود مانینی کے خیمے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا اور اس کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا اُس نے مجھے کام کے بارے میں تو بتا دیا تھا لیکن اندھیرا پھیل جانے کے بعد کے لیے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہوگا۔

اتنا عرصہ جبرین میں گزارنے کے باوجود مانینی کا خیمہ میرے لیے ایک راز تھا۔ مجھے کچھ علم نہ تھا کہ وہاں کیا کچھ ہے اور مانینی فرصت کے لمحات میں وہاں گھُسا کیا کرتا رہتا ہے۔

میرے لیے یہ ایک سُنہری موقع تھا۔ میں مانینی کے کسی حکم کی خلاف ورزی کیے بغیر اس خیمے میں گھُس سکتا تھا۔ اگر مانینی وہاں موجود ہوتا تو اُس سے اگلی ہدایات لے کر لوٹ آتا اور اُس کی غیر موجودگی کی صورت میں میں اس خیمے کا بھر پور جائزہ لے سکتا تھا!

میں خیمے کی طرف جانے کا ارادہ کر کے کنوئیں کی منڈیر سے ذرا ہی آگے بڑھا تھا کہ اچانک عقب سے کسی نے دھیمی آواز میں پکارا۔

وہ آواز اپنی کرختگی اور لہجے کے باعث مردانہ معلوم ہوتی تھی۔ میں کسی چیتے کی سی پھُرتی سے واپس پلٹا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا کھجور کے اونچے اونچے درخت ہوا کے جھونکوں کے ساتھ سرسرا رہے تھے اور میں اُن کے درمیان تنہا کھڑا ہوا تھا!

"کون ہے؟" میں نے سرگوشیانہ آواز میں سوال کیا۔

"اپنے سامنے والے درختوں کے کنج میں چلے آؤ۔ میں تمہارا دوست ہوں۔" وہی آواز دوبارہ اُبھری۔ اس بار میں آواز پہچان گیا وہ جبرین کے سردار جوبا کی آواز تھی!

میں سمجھ گیا کہ جوبا میرے لیے کوئی خاص پیغام لے کر آیا ہے۔ میں تیزی کے ساتھ درختوں کے درمیان جا گھُسا۔ چند ہی منٹ کی کوششوں کے بعد میں جوبا کے سامنے پہنچ گیا۔

وہ ایک درخت کے تنے سے پُشت ٹکائے چوکنے انداز میں کھڑا ہوا تھا۔

"حسین! کیا تو مانینی کا وفادار ہو چکا ہے؟" جوبا نے مجھ پر نظر پڑتے ہی سپاٹ لہجے میں اپنا پہلا سوال کیا۔ ایک ثانیے کے لیے مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں مانینی بھی آس پاس ہی موجود نہ ہو اور میرا جواب سنتے ہی سامنے آجائے لیکن میں جوبا کے ساتھ اپنے تعلقات کی تجدید میں کوئی خطرہ بھی مول لینا نہیں چاہ رہا تھا۔

"مانینی کی وفاداری بھی ایک عذاب سے کم نہیں ہے سردار" میں نے طویل سانس لے کر سرگوشیانہ لہجے میں اپنے دل کی بات کہہ ڈالی

"تو جانتا ہے کہ مانینی اس وقت کہاں ہے؟" جوبا نے دریافت کیا۔

"نہیں۔ لیکن دوپہر میں آخری بار میں نے اسے اپنے خیمے میں گھُستے دیکھا تھا۔"

"وہ اِس وقت خیمے میں نہیں ہے۔ وہ چوروں کی طرح یہاں سے نکلا ہوگا۔ اِس وقت وہ میرے خیمے پر شراب کے نشے میں دھت پڑا ہوا ہے۔ وہ میرے پاس جبل سے لوٹی ہوئی کنیزوں میں سے حصّہ طلب کرنے آیا تھا اور اُن میں سے ایک خوبصورت لڑکی پر نظر پڑتے ہی وہ دیوانہ ہو گیا۔ اپنے تقدّس کے ظاہری خول کے باعث وہ اور کچھ تو نہ کر سکا لیکن وہ لڑکی اُس کی ساقی گری پر مامور کر دی گئی اور وہ اس کے ہاتھوں اِس وقت تک پیتا رہا جب تک کہ اُس کے حواس اُس کا ساتھ نہ چھوڑ گئے۔"

"وہ تمہارے خیمے میں بے ہوش ہوا ہے۔" میں نے اپنے وجود میں مسرّت کی لہر دوڑتی محسوس کی۔

"یہ اُسے ہلاک کرنے کا سنہرا موقع ہے حسین!" جوبا تیر شلنے پکڑ کر پُرجوش آواز میں بولا۔ "یہ پہلا موقع ہے کہ مکّار مانینی سے غفلت ہوئی ہے ورنہ وہ بڈھا ہمیشہ محتاط رہتا ہے۔ ہم جبرین والے تو شاید اب بھی اُس پر یوں غفلت میں ہتھیار نہ اُٹھا سکیں کیونکہ ہم سب اُس کے سحر میں ہیں۔ ہاں تو اس کو ہلاک کر سکتا ہے، تو جانتا ہے کہ وہ کس قدر بدطینت اور مکّار ہے۔!"

"ہاں۔ میں راضی ہوں۔"

"تو آؤ ویران راستوں سے ہم بہت جلد بستی میں جا نکلیں گے!"

پھر ہم دونوں جیسے ہی درختوں کے کنج سے باہر نکلے کچھ فاصلے پر مانینی کی سرد آواز سُنائی دی۔

"میرے نخلستان میں جوبا کی بو آرہی ہے، میری اجازت کے بغیر ادھر آنے والے میرے قہر کو دعوت دیتے ہیں۔ آخر جوبا کو یہ جرأت کیسے ہوئی" پھر اُس نے غصیلی آواز میں پکارا "جوبا... جوبا"

میں تیری بو سونگھ چکا ہوں۔"
تاریکی میں ہم دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں اور میں پلٹ کر دوبارہ درختوں کے کنج میں جاگھسا۔

"ہاں مقدس مانیتی!" چند ثانیوں کے سکوت کے بعد جوبا کی مٹھاس میں ڈوبی ہوئی آواز اُبھری "میں یہاں موجود ہوں۔"

"تو جہاں ہے، وہیں ٹھہر۔ میں خود تیرے پاس آرہا ہوں۔" مانیتی کا لہجہ اس بار اشتعال آمیز تھا۔ جوبا کی نخلستان میں موجودگی شاید اُسے ناگوار گزری تھی۔ چند ہی ثانیوں میں مانیتی شاید جوبا کے قریب آ پہنچا۔ "تو میری اجازت کے بغیر اس وقت یہاں کیوں آیا ہے؟" مانیتی کی آواز قہر بداماں تھی۔

"میں روشن سر والے ایک کتے کے تعاقب میں تیرے غلام حسین تک پہنچا تھا" سردار جوبا نے پورے اعتماد کے ساتھ ایک فرضی کہانی چھیڑ دی "وہ کتا مجھے اپنے خیمے کے عقب میں نظر آیا تھا میرے لیئے وہ عجیب چیز تھی اس لیئے میں اس کا پیچھا کرنے لگا لیکن وہ یہاں پہنچ کر غائب ہوگیا۔ تیرا غلام کنوئیں کی منڈیر سے ٹیک لگائے لیٹا ہوا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ اُسے روشن سر والے کتے کے بارے میں کچھ علم نہیں۔"

"روشن سر والا کتا!" مانیتی نے متحیرانہ لہجے میں دوہرایا "جوبا کیا میں تیری اس کہانی پر یقین کر لوں؟"

"اس وقت میری یہاں موجودگی بھی ایک کہانی ہی کہلائے گی مقدس مانیتی!" جوبا اپنے لہجے میں قدرے تلخی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ میں یہیں رُکتا ہوں، تو اپنے غلام سے میری باتوں کی صداقت دریافت کر لے۔!" "غلام آقاؤں کی سچائی کی گواہی نہیں دے سکتے جوبا!" مانیتی بھیانک انداز میں ہنس پڑا۔ "مجھے تیری بات کا یقین تو ہے لیکن پریشانی کی بات یہ ہے کہ نخلستان کی فضاؤں میں مجھے کسی کتے کی بو نہیں محسوس ہو رہی!" "مانیتی!" سردار جوبا کی آواز غراہٹ میں بدل گئی "تو مجھے جھوٹا کہہ رہا ہے۔!"

"نہیں جوبا" مانیتی کا لہجہ نرم پڑ گیا "اس صحرا میں ہر طرف ایسے ہزاروں راز بکھرے پڑے ہیں جن پر سے آج تک کوئی پردہ نہیں اُٹھا سکا۔ ہاں تو یہ بتا کہ بستی میں کس کس نے تجھے اس طرف آتے دیکھا ہے؟" مانیتی کے لہجے پر میں کانپ اُٹھا۔ وہ جوبا کو لفظوں کے جال میں پھانس کر یہ معلوم کرنا چاہ رہا تھا کہ اُسے کسی نے نخلستان کی طرف آتے نہیں دیکھا اس بات کی تصدیق کر لینے کے بعد وہ جوبا کو ہرگز زندہ نہ نکلنے دیتا۔

"بہت سے لوگوں نے دیکھا ہے!" یہ کہتے ہوئے جوبا کی آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ نمایاں تھی۔ شاید وہ بھی مانیتی کے عزائم بھانپ چکا تھا۔

"تو اس وقت خوفزدہ ہے جوبا" مانیتی پھر ہنس پڑا "جا اب بستی میں لوٹ جا۔ تجھے یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ تیری حکومت نخلستان کے اُس پار تک ہے۔ مانیتی کی قلمرو میں آنے والے بڑی مشکل میں پڑ جاتے ہیں لیکن میں رحم دل ہوں۔ جا واپس لوٹ جا!"

جوبا کے قدموں کی چاپ دُور ہونے لگی۔!

چند ثانیوں بعد مانیتی میرے پاس آیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ پر تشدد کر کے جوبا کی آمد کا راز اگلوانے کی کوشش کرے گا لیکن اُس نے جوبا کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

"مجھے تیار ہونے تک تجھے اپنی راتیں اسی نخلستان میں کھلے آسمان کے نیچے بسر کرنی ہوں گی حسین!" وہ میرے سامنے آ کر پُرسکون لہجے میں بولا۔ "اگر تو نے میرے خیمے کا رُخ کرنے کی کوشش کی تو آسمانوں سے اترنے والی بلائیں جونک بن کر تیرا بدن چاٹ جائیں گی۔"

"میں جانتا ہوں مانیتی بابا" میں نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "لیکن میں بھوکا ہوں۔!"

"تیری سزا تو یہی ہونی چاہیئے کہ گونگے طالبس کی طرح آوارہ کتوں سے لڑ کر اپنا رزق حاصل کرے لیکن میں رحم دل ہوں۔ لے اِس وقت یہ کھا لے۔"

یہ کہہ کر مانیتی نے اونٹنی کے دودھ سے بنے ہوئے پنیر کے چند ٹکڑے میری طرف بڑھا دیئے اور لاپرواہانہ انداز میں اپنی چھڑی لہراتا اپنے تاریک خیمے کی طرف چل دیا۔

میں شدید بھوک کا شکار تھا اس لیئے بے صبری کے ساتھ پنیر کے نمکین ٹکڑے کھانے لگا۔

پنیر کھانے کے بعد تکان کا احساس کچھ اور بڑھ گیا۔ میں نے زمین پر لیٹ کر سو جانا چاہا لیکن پچھلی شب آئل فیلڈ سے فرار کے بعد کے واقعات یکے بعد دیگرے ذہن میں ناچتے رہے۔ برجر کا عبرتناک انجام رہ رہ کر مجھے اپنا حشر یاد دلا رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ مانیتی کسی نہ کسی موقع پر میرا بھی وہی حشر کرے گا۔

تھوڑی دیر بعد مانیتی کا خیمہ روشن ہوگیا اور اس جانب سے بہت سی ملی جلی آوازیں ابھرنے لگیں۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر دیکھنے لگا لیکن مجھے وہاں کچھ نظر نہ آسکا۔ ان آوازوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ خیمے میں مانیتی کے علاوہ غیر انسانی قوتیں بھی موجود ہیں!

تھوڑی دیر بعد وہ شور تھم گیا اور میں پریشان خیالی کے عالم میں دوبارہ نرم نرم گھاس پر لیٹ گیا۔ تمام تر اندیشوں کے باوجود ذرا ہی دیر میں مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

اندر گھسا نہ جانے کس کام میں مصروف تھا کہ دوبارہ باہر نکلتا نظر نہیں آیا۔

دن آہستہ آہستہ ڈھلتا رہا اور جب سورج تھکے قدموں سے مغربی وادیوں میں اتر رہا تھا تو مجھے اپنے عقبی کنج میں ہلکی سی آہٹ سنائی دی میں نے سرسری طور پر سر گھما کر پیچھے دیکھا لیکن وہاں کوئی نظر نہ آیا اور میں اس آہٹ کو اپنا وہم سمجھ کر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

ذرا ہی دیر میں سورج غروب ہو گیا اور وہاں ہر طرف سرمئی اندھیرا پھیلنے لگا۔

جب تک میری نگاہیں کام کرتی رہیں میں سنگ و آہن میں الجھا رہا لیکن جب بڑھتا ہوا اندھیرا میرے لئے دشواریاں پیدا کرنے لگا تو میں نے ہاتھ روک لیا۔

اندھیرا پھیل جانے کے باوجود مانیتی کے خیمے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا اور اس کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ اس نے مجھے کام کے بارے میں تو بتا دیا تھا لیکن اندھیرا پھیل جانے کے بعد کے لئے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہو گا۔

اتنا عرصہ جبرین میں گزارنے کے باوجود مانیتی کا خیمہ میرے لئے ایک راز تھا۔ مجھے کچھ علم نہ تھا کہ وہاں کیا کچھ ہے اور مانیتی فرصت کے لمحات میں وہاں گھسا کیا کرتا رہتا ہے۔

میرے لئے یہ ایک سنہری موقع تھا۔ میں مانیتی کے کسی حکم کی خلاف ورزی کئے بغیر اس خیمے میں گھس سکتا تھا۔ اگر مانیتی وہاں موجود ہوتا تو اس سے اگلی ہدایات لے کر لوٹ آتا اور اس کی غیر موجودگی کی صورت میں میں اس خیمے کا بھرپور جائزہ لے سکتا تھا!

میں خیمے کی طرف جانے کا ارادہ کر کے کنوئیں کی منڈیر سے ذرا ہی آگے بڑھا تھا کہ اچانک عقب سے کسی نے دھیمی آواز میں پکارا۔

وہ آواز اپنی کرختگی اور لہجے کے باعث مردانہ معلوم ہوتی تھی۔ میں کسی چیتے کی سی پھرتی سے واپس پلٹا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا کھجور کے اونچے اونچے درخت ہوا کے جھونکوں کے ساتھ سرسرا رہے تھے اور میں ان کے درمیان تنہا کھڑا ہوا تھا!

"کون ہے؟" میں نے سرگوشیانہ آواز میں سوال کیا۔

"اپنے سامنے والے درختوں کے کنج میں چلے آؤ۔ میں تمہارا دوست ہوں۔" وہی آواز دوبارہ ابھری۔ اس بار میں آواز پہچان گیا وہ جبرین کے سردار جوبا کی آواز تھی!

میں سمجھ گیا کہ جوبا میرے لئے کوئی خاص پیغام لے کر آیا ہے۔ میں تیزی کے ساتھ درختوں کے درمیان جا گھسا۔ چند ہی منٹ کی کوششوں کے بعد میں جوبا کے سامنے پہنچ گیا۔

وہ ایک درخت کے تنے سے پشت ٹکائے چوکنے انداز میں کھڑا ہوا تھا۔

"حسین! کیا تو مانیتی کا وفادار ہو چکا ہے؟" جوبا نے مجھ پر نظر پڑتے ہی سپاٹ لہجے میں اپنا پہلا سوال کیا۔ ایک ثانیے کے لئے مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں مانیتی بھی آس پاس ہی موجود نہ ہو اور میرا جواب سنتے ہی سامنے آ جائے لیکن میں جوبا کے ساتھ اپنے تعلقات کی تجدید میں کوئی خطرہ بھی مول لینا نہیں چاہ رہا تھا۔

"مانیتی کی وفاداری بھی ایک عذاب سے کم نہیں ہے سردار!" میں نے طویل سانس لے کر سرگوشیانہ لہجے میں اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

"تو جانتا ہے کہ مانیتی اس وقت کہاں ہے؟" جوبا نے دریافت کیا۔

"نہیں۔ لیکن دوپہر میں آخری بار میں نے اسے اپنے خیمے میں گھستے دیکھا تھا۔"

"وہ اس وقت خیمے میں نہیں ہے۔ وہ چوروں کی طرح یہاں سے نکلا ہو گا۔ اس وقت وہ میرے خیمے میں شراب کے نشے میں دھت پڑا ہوا ہے۔ وہ میرے پاس جبل سے لوٹی ہوئی کنیزوں میں سے حصہ طلب کرنے آیا تھا اور ان میں سے ایک خوبصورت لڑکی پر نظر پڑتے ہی وہ دیوانہ ہو گیا۔ اپنے تقدس کے ظاہری خول کے باعث وہ اور کچھ تو نہ کر سکا لیکن وہ لڑکی اس کی ساقی گری پر مامور کر دی گئی اور وہ اس کے ہاتھوں اس وقت تک پیتا رہا جب تک کہ اس کے حواس اس کا ساتھ نہ چھوڑ گئے۔"

"وہ تمہارے خیمے میں بے ہوش ہوا ہے۔" میں نے اپنے وجود میں مسرت کی لہر دوڑتی محسوس کی۔

"یہ اسے ہلاک کرنے کا سنہرا موقع ہے حسین!" جوبا میرے شانے پکڑ کر پرجوش آواز میں بولا۔ "یہ پہلا موقع ہے کہ مکار مانیتی سے غفلت ہوئی ہے ورنہ وہ بڈھا ہمیشہ محتاط رہتا ہے۔ ہم جبرین والے تو شاید اب بھی اس پر یوں غفلت میں ہتھیار نہ اٹھا سکیں کیونکہ ہم سب اس کے سحر میں ہیں۔ ہاں تو اس کو ہلاک کر سکتا ہے، تو جانتا ہے کہ وہ کس قدر بدطینت اور مکار ہے۔!"

"ہاں۔ میں راضی ہوں۔"

"تو آ ویران راستوں سے ہم بہت جلد بستی میں جا نکلیں گے!"

پھر ہم دونوں جیسے ہی درختوں کے کنج سے باہر نکلے کچھ فاصلے پر مانیتی کی سرد آواز سنائی دی۔

"میرے نخلستان میں جوبا کی بو آ رہی ہے، میری اجازت کے بغیر ادھر آنے والے میرے قہر کو دعوت دیتے ہیں۔ آخر جوبا کو یہ جرأت کیسے ہوئی" پھر اس نے غضبیلی آواز میں پکارا "جوبا... جوبا"

میں تیری بو سونگھ چکا ہوں۔"

تاریکی میں ہم دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں اور میں پلٹ کر دوبارہ درختوں کے کنج میں جا گھسا۔

"ہاں مقدس مانینی!" چند ثانیوں کے سکوت کے بعد جوبا کی مٹھاس میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری "میں یہاں موجود ہوں۔"

"تو جہاں ہے، وہیں ٹھہر۔ میں خود تیرے پاس آ رہا ہوں۔"

مانینی کا لہجہ اس بار اشتعال آمیز تھا۔ جوبا کی نخلستان میں موجودگی شاید اُسے ناگوار گزری تھی۔ چند ہی ثانیوں میں مانینی شاید جوبا کے قریب آ پہنچا "تو میری اجازت کے بغیر اس وقت یہاں کیوں آیا ہے؟"

مانینی کی آواز قہر بداماں تھی۔

"میں روشن سر والے ایک کتے کے تعاقب میں تیرے غلام حسین تک پہنچا تھا" سردار جوبا نے پورے اعتماد کے ساتھ ایک فرضی کہانی چھیڑ دی "وہ کتا مجھے اپنے خیمے کے عقب میں نظر آیا تھا میرے لئے وہ عجیب چیز تھی اس لئے میں اس کا پیچھا کرنے لگا لیکن وہ یہاں پہنچ کر غائب ہو گیا۔ تیرا غلام کنویں کی منڈیر سے ٹیک لگائے لیٹا ہوا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ اُسے روشن سر والے کتے کے بارے میں کچھ علم نہیں۔"

"روشن سر والا کتا!" مانینی نے متحیرانہ لہجے میں دُہرایا "جوبا کیا میں تیری اس کہانی پر یقین کر لوں؟"

"اس وقت میری یہاں موجودگی بھی ایک کہانی ہی کہلائے گی مقدس مانینی!" جوبا اپنے لہجے میں قدرے تلخی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ میں یہیں رکتا ہوں، تو اپنے غلام سے میری باتوں کی صداقت دریافت کر لے۔!" "غلام آقاؤں کی سچائی کی گواہی نہیں دے سکتے جوبا!" مانینی بھیانک انداز میں ہنس پڑا۔ "مجھے تیری بات کا یقین تو ہے لیکن پریشانی کی بات یہ ہے کہ نخلستان کی فضاؤں میں مجھے کسی کتے کی بو نہیں محسوس ہو رہی!" "مانینی!" سردار جوبا کی آواز غرّاہٹ میں بدل گئی "تو مجھے جھوٹا کہہ رہا ہے۔!"

"نہیں جوبا" مانینی کا لہجہ نرم پڑ گیا "اس صحرا میں ہر طرف ایسے ہزاروں راز بکھرے پڑے ہیں جن پر سے آج تک کوئی پردہ نہیں اٹھا سکا۔ ہاں تو یہ بتا کہ بستی میں کس کس نے تجھے اس طرف آتے دیکھا ہے؟"

مانینی کے لہجے پر میں کانپ اُٹھا۔ وہ جوبا کو لفظوں کے جال میں پھانس کر یہ معلوم کرنا چاہ رہا تھا کہ اُسے کسی نے نخلستان کی طرف آتے نہیں دیکھا اس بات کی تصدیق کر لینے کے بعد وہ جوبا کو ہرگز زندہ نہ نکلنے دیتا۔

"بہت سے لوگوں نے دیکھا ہے!" یہ کہتے ہوئے جوبا کی آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ نمایاں تھی۔ شاید وہ بھی مانینی کے عزائم بھانپ چکا تھا۔

"تو اس وقت خوفزدہ ہے جوبا!" مانینی پھر ہنس پڑا "جا اب بستی میں لوٹ جا۔ تجھے یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ تیری حکومت نخلستان کے اُس پار تک ہے۔ مانینی کی قلمرو میں آنے والے بڑی مشکل میں پڑ جاتے ہیں لیکن میں رحم دل ہوں۔ جا واپس لوٹ جا!"

جوبا کے قدموں کی چاپ دُور ہونے لگی۔!

چند ثانیوں بعد مانینی میرے پاس آیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ پر تشدد کر کے جوبا کی آمد کا راز اگلوانے کی کوشش کرے گا لیکن اُس نے جوبا کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

"مجسمے تیار ہونے تک تجھے اپنی راتیں اسی نخلستان میں کھلے آسمان کے نیچے بسر کرنی ہوں گی حسین!" وہ میرے سامنے آ کر پُرسکون لہجے میں بولا۔ "اگر تو نے میرے خیمے کا رُخ کرنے کی کوشش کی تو آسمانوں سے اترنے والی بلائیں جونک بن کر تیرا بدن چاٹ جائیں گی۔"

"میں جانتا ہوں مانینی بابا" میں نے سہمی ہوئی آواز میں کہا "لیکن میں بھوکا ہوں۔!"

"تیری سزا تو یہی ہونی چاہیئے کہ گونگے طالیس کی طرح آوارہ کتوں سے لڑ کر اپنا رزق حاصل کرے لیکن میں رحم دل ہوں۔ لے اس وقت یہ کھا لے۔"

یہ کہہ کر مانینی نے اونٹنی کے دودھ سے بنے ہوئے پنیر کے چند ٹکڑے میری طرف بڑھا دیئے اور لاپرواہانہ انداز میں اپنی چھڑی لہراتا اپنے تاریک خیمے کی طرف چل دیا۔

میں شدید بھوک کا شکار تھا اس لئے بے صبری کے ساتھ پنیر کے نمکین ٹکڑے کھانے لگا۔

پنیر کھانے کے بعد تکان کا احساس کچھ اور بڑھ گیا۔ میں نے زمین پر لیٹ کر سو جانا چاہا لیکن پچھلی شب آئل فیلڈ سے فرار کے بعد کے واقعات یکے بعد دیگرے ذہن میں ناچتے رہے۔ برجر کا عبرتناک انجام رہ رہ کر مجھے اپنا حشر یاد دلا رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ مانینی کسی نہ کسی موقع پر میرا بھی وہی حشر کرے گا۔

تھوڑی دیر بعد مانینی کا خیمہ روشن ہو گیا اور اس جانب سے بہت سی ملی جلی آوازیں ابھرنے لگیں۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر دیکھنے لگا لیکن مجھے وہاں کچھ نظر نہ آ سکا۔ ان آوازوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ خیمے میں مانینی کے علاوہ غیر انسانی قوتیں بھی موجود ہیں!

تھوڑی دیر بعد وہ شور تھم گیا اور میں پریشان خیالی کے عالم میں دوبارہ نرم نرم گھاس پر لیٹ گیا۔ تمام تر اندیشوں کے باوجود ذرا ہی دیر میں مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

رات کے کسی پہر میں میرے کانوں میں دھیما دھیما ترنم گونجنے لگا۔ اس لاہوتی ترنم کی گونج میں مٹھاس اور حلاوت کے سمندر انگڑائیاں لے رہے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ آہنگ بلند ہوتا چلا گیا اور میں بے چین ہو کر بیدار ہو گیا۔ میرے اردگرد ہر طرف تاریکی کا راج تھا۔ نخلستان کے دوسرے سرے پر بنا ہوا مانینی کا خیمہ مدھم سی روشنی میں لپٹا کھڑا تھا۔

گو وہاں کوئی نہیں تھا لیکن وہ ترنم ریز موسیقی بتدریج بڑھتی ہی رہی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے صحرا میں گھومنے والے خانہ بدوش نغمہ خوانوں کا کوئی طائفہ اپنے ساز بجاتا تیزی کے ساتھ میرے قریب چلا آ رہا ہو۔ پھر اس موسیقی میں یک بیک بے شمار نقرئی گھنٹیوں کا سرور بخش آہنگ شامل ہو گیا اور میں اضطراب کا شکار ہو گیا۔ یہ سب آوازیں اب میں جان چکا تھا!

میری طوسیہ۔ بنت نیل میرے پاس آ رہی تھی۔

ابدی مسرت کے ان لازوال لمحوں میں بھی مانینی کا خوف میرے لاشعور کی گہرائیوں میں چھپا ہوا تھا اور میری نظریں بار بار اس خوفناک بڈھے کے روشن خیمے کا طواف کر رہی تھیں۔ مجھے ہر آن یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ وہ موسیقی کا شور سن کر اپنے خیمے سے باہر آنے والا ہے۔

پھر فضا میں ہر طرف خوشبوئیں پھیلنے لگیں۔ مجھے اپنا وجود ہلکا ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ ترنم اور خوشبوؤں کے اس سیلاب میں گھرا میں خود کو بادلوں سے بھی اوپر اڑتا محسوس کر رہا تھا۔ سرور کے ناقابل بیان احساس کے ساتھ میرے پپوٹے بوجھل ہو کر آنکھوں پر جھکے پڑ رہے تھے!

پھر یک بیک موسیقی کا وہ شور رک گیا۔ میں نے دہشت کے عالم میں آنکھیں کھولیں تو خوشبوؤں سے معطر فضا میں میری پیاری طوسیہ کا مسکراتا ہوا پُر وقار چہرہ میرے سامنے تھا۔

"طوسیہ!" میں دنیا و مافیہا کو بھول کر دیوانہ وار اس کی طرف بڑھا اور وہ خود آگے بڑھ کر میرے پھیلے ہوئے بازوؤں میں سما گئی۔ اس کے ڈھیلے ڈھالے سفید لبادے اور اس کے سیمیں بدن سے خوشبوؤں کی مہکار پھوٹ رہی تھی۔ اس کے سر پر سجے ہوئے طلائی تاج میں سے جھانکتی ہوئی ریشمی زلفیں میرے بدن سے ٹکرا ٹکرا کر لذت و انبساط کے نت نئے راز آشکار کر رہی تھیں۔

"حسین!" وہ دھیمے سے کسمسا کر میرے بازوؤں سے نکلتے ہوئے بولی "یہ تمہارے لئے عمل کا وقت ہے، مانینی کا مقدر اس وقت سویا ہوا ہے۔ تم اس پر فیصلہ کن وار کر سکتے ہو۔ جاؤ اور چیخ چیخ کر جبرین والوں کو میری کہانی سنا دو۔!"

"مانینی کہاں ہے طوسیہ؟" میں نے حیران و پریشان لہجے میں پوچھا "وہ بہت ظالم ہے، مجھے زندہ نہ چھوڑے گا۔ اس کی دہشت نے مجھے برباد کیا ہوا ہے!"

"تمہیں یاد ہے کہ جوبا نے تمہیں مقدس مانینی کے گھناؤنے کردار کی کچھ کہانیاں سنائی تھیں!"

"ہاں۔۔ جوبا کہتا تھا کہ مانینی راتوں کی سیاہی میں جبرین کی کنواریوں کے بستر آلودہ کرتا ہے اور انہیں صنم پرستوں کے عاطیس دیوتا کا فریب دیتا ہے اور وہ کنواریاں صبح بیدار ہو کر اپنی ہمجولیوں کو بڑے فخر و عقیدت کے ساتھ بتاتی ہیں کہ کس طرح پچھلی شب کی سیاہی میں عاطیس دیوتا نے انسانی روپ میں آ کر ان کی کوکھ میں زرخیزی کے جوہر بکھیرے ہیں!"

"تم ٹھیک سمجھے!" طوسیہ جلدی سے بولی "مانینی درندوں سے بھی بدتر ہے۔ اس وقت وہ جبرین کے سب سے بڑے چرواہے راعون کی اکلوتی بیٹی کی خوابگاہ میں گھسا اس معصوم لڑکی کی آبرو کو اپنی درندگی کی بھینٹ چڑھا رہا ہے۔ جب تک مانینی گہرے پانی کے تالاب میں نہ نہائے اس کی پُراسرار قوتیں اس کا ساتھ نہیں دیں گی۔ اس وقت وہ محض ایک مجہول اور چالاک بوڑھا ہے۔ اس سے قبل کہ وہ پاک ہو کر اپنی قوتیں دوبارہ حاصل کرے، تم بستی میں میری کہانی عام کر دو!"

"طوسیہ!" میں نے بے اختیار اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

"جاؤ۔۔ یہ وقت قیمتی ہے" طوسیہ پر بے چینی طاری ہونے لگی "مانینی پر گناہ اور ذلت کا یہ شوق مدتوں میں سوار ہوتا ہے اگر یہ وقت گزر گیا تو نہ جانے تمہیں کب تک انتظار کرنا پڑے!"

"جا رہا ہوں۔۔ طوسیہ میں جا رہا ہوں!" اس کے لبوں کی حرارت چرا کر میں درختوں کے کنج سے نکلا اور دیوانہ وار بستی کی طرف دوڑ پڑا۔ "حسین! میں یہیں تمہاری منتظر ہوں!" مجھے اپنے عقب میں طوسیہ کی آواز سنائی دی۔

"میں وہیں آؤں گا طوسیہ!"

اس وقت میرے بدن میں نہ جانے کہاں کی پھرتی سما چکی تھی کہ میں برق رفتاری سے بستی کی جانب چلا جا رہا تھا۔ جوں جوں بستی قریب آ رہی تھی، آوارہ کتوں کا تیز شور واضح ہوتا جا رہا تھا۔

دوڑنے کے ساتھ ہی ساتھ میرا دماغ بھی تیزی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ راعون کا مکان سردار جوبا کے خیموں کے نزدیک ہی ہے اور اگر میں طوسیہ کی کہانی کا سرِعام اعلان کرنے کے بجائے صرف جوبا کو پوری تفصیل بتانے کے ساتھ ہی راعون

سانپوں کو جنم دینے والی
دشتامادی کی
جیون کہانی
شائع ہوگئی ہے
قیمت: چھ روپے
جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول
پراسرار سلسلہ کتابی شکل میں
قریبی بکسٹال سے خریدیں
کراچی بک ڈپو ۴۸- اردو بازار کراچی

کر یہ کہانی عام کردو... ہاں سنو! میں اجنبی نہیں ہوں، میرا نام حسین ہے حسین!" وہ غلام ہکا بکا کھڑا میرا منہ تکتا رہا۔ یوں لگ رہا تھا، جیسے وہ مجھے مجذوب سمجھ رہا ہو۔ پھر جوں ہی میں خاموش ہوا مجھے اپنے عقب میں مانینی کی غضبناک غراہٹ سنائی دی۔ "ہاں میں جانتا ہوں کہ تیرا نام حسین ہے!"

ٹھیک اسی وقت راعون کے مکان سے شور و غوغا بلند ہوا اور کئی مرد ہتھیار سنبھالتے باہر نکل آئے۔ مانینی کی آواز سن کر میں اس کی جانب پلٹا ہی تھا کہ اس نے میری گردن دبوچ لی۔

"میں کافی دیر سے تیری بو سونگھ رہا تھا مگر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تو کس نیت سے بستی میں آیا ہے!"

راعون کے مکان سے نکلنے والے اس کے جوان بیٹے تھے غصے کے باعث ان کے بدن کانپ رہے تھے وہ غیض و غضب کے عالم میں دہاڑتے ہوئے ہم لوگوں کی طرف آئے۔ سب سے پہلے انہوں نے بے رحمی کے ساتھ جوبا کے غلام کو زمین پر گرا کر گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے اس کا بدن سونگھا۔

"یہ نہیں ہو سکتا" ان میں سے ایک نے کسی بھیڑیے کی طرح غرا کر کہا۔ پھر راعون کے لڑکوں نے مانینی کا رخ کیا۔

"مقدس مانینی ذرا اسے کچھ دیر کے لئے ہمارے حوالے کردے۔" ان میں سے ایک نے اپنے غصے پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "کیا بات ہے؟" مانینی نے اپنی آواز میں رعب پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سوال کیا۔

"کسی نے ہماری بہن کی آبرو لوٹی ہے۔ ہم سو رہے تھے" غصے کے باعث بولنے والے کے منہ سے الفاظ اٹک اٹک کر ادا ہو رہے تھے "کہ کوئی اس کی خواب گاہ سے نکل کر گھبرائے ہوئے انداز میں بھاگا اور ہم بیدار ہو گئے۔ وہ بدنصیب دو دن بعد بیاہی جانے والی تھی۔ اس کی ماں نے اس کے جسم پر خوشبوئیں ملی ہوئی تھیں اور اب جبرین کے جس مرد کے بدن سے وہ خوشبو آئے گی ہم اس کی بوٹیاں اڑا دیں گے۔ ہماری بہن اپنی ماں کی چھاتیوں میں منہ چھپائے بلک بلک کر رو رہی ہے!"

"یہ تمہارے حوالے ہے!" مانینی نے غیر ارادی طور پر پیچھے کے یہاں مانینی کی موجودگی کا راز افشا کردوں تو جوبا مانینی کو عین موقع پر رنگے ہاتھوں گرفتار کرلے گا اور پھر اس بڈھے کا حشر ہمارے ہاتھوں ہوگا میں بستی میں داخل ہوا تو ایک کوڑے کے ڈھیر پر پندرہ بیس کتوں کے درمیان طالیس کو موجود پایا۔ وہ دیوہیکل سیاہ فام اپنے اکلوتے گھونسے اور دونوں لاتوں سے کتوں کو مار رہا تھا لیکن وہ اس کے گرد دائرہ باندھ کر اسے بھنبھوڑ کھانے پر تلے ہوئے تھے!

میں اس وحشیانہ معرکے سے بچتا ہوا تیزی کے ساتھ آگے دوڑتا رہا۔ تھوڑی ہی دیر میں جوبا کے خیمے کے سامنے نظر آنے لگے ان کے قریب ہی بنے ہوتے راعون کے مکان پر خوابناک خاموشی مسلط تھی!

میں راعون کے مکان کے قریب سے گزر کر سردار جوبا کے خیمے پر پہنچا تو اندر گہرا سکوت چھایا ہوا تھا اور دروازے پر ایک پہریدار بیٹھا اونگھ رہا تھا!

فیصلہ کن لمحات قریب آچکے تھے۔ مانینی اس وقت مجھ سے چند قدم دور راعون کی بیٹی کی خواب گاہ میں دادِ عیش دے رہا تھا جوش اور ہیجان کے سبب میرے اعصاب پر انتشار چھایا ہوا تھا اور دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا، دورانِ خون کی شدت سے شریانیں پھٹتی محسوس ہو رہی تھیں!

میں نے جوبا کے خیمے پر رک کر اونگھتے ہوئے غلام کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ "کون ہے!" وہ ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔

"سردار جوبا کہاں ہے؟" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ مار کر پوچھا تاریکی کے باعث وہ مجھے نہ پہچان سکا اور جھلا کر مجھے پیچھے دھکیل دیا۔

"سردار جوبا اس وقت آرام میں ہے، وہ اجنبیوں کا غلام نہیں ہے۔"

مجھے اس غلام پر سخت طیش آیا لیکن میں خود پر قابو پاکر اس کے قریب پہنچ گیا اور سرگوشیانہ لہجے میں بولا "تم مانینی کو جانتے ہونا، اس نے نیل کے ایک حکمران کی بیٹی طوسیہ کو قید کیا ہوا ہے، طوسیہ کی روح مانینی کی قیدی ہے اور اس کا جسم صحرا کے کسی گوشے میں بنے ہوئے صندلی معبد میں بند ہے" طوسیہ کا راز بیان کرتے ہوئے سنسنی کے باعث میری زبان پر لکنت طاری ہونے لگی "اور مانینی مقدس پروہت نہیں، وہ کمینہ ہے۔ اس وقت بھی وہ راعون کی بیٹی کی خواب گاہ میں ہے، میں جوبا کو یہی سب بتانے آیا ہوں، جاؤ میں جوبا کو بتاتا ہوں تم بستی میں چیخ چیخ سر کتے ہوتے مجھے ان چاروں کے آگے دھکیل دیا۔

اس وقت تک آس پاس کے مکانوں سے بہت سے لوگ ہتھیار سنبھال کر باہر آچکے تھے۔ جبرین کا سردار جوبا بھی اپنے خیمے سے باہر آگیا تھا! سورج کی روشنی غروب ہو جانے کے باعث لوگ ڈرتے ڈرتے گھروں سے نکل رہے تھے!

"کیا بات ہے؟" جوبا کی آواز پر نشے کے اثرات ابھی تک باقی تھے!

"محترم سردار" نگہبان نے اپنے سر کو خم دے کر کہا "حسین تیرے لئے ایک چھوٹی کہانی لے کر..."

اُس کی بات پوری ہونے سے قبل ہی مانیتی پوری قوت سے دہاڑتا ہوا اُس غلام کی طرف لپکا "خاموش ــ ورنہ ابھی یہاں تیری لاش تڑپے گی!"

راعون کے لڑکے مجھے کسی جانور کی طرح زمین پر اُلٹ پُلٹ کر میرا بدن سونگھ رہے تھے۔ جوں ہی مانیتی جوبا کے غلام کی طرف لپکتے ہوئے اُن کے نزدیک سے گزرا، اُن میں سے ایک نے مانیتی کی طرف منہ کر کے گہرا سانس لیا اور پھر مجھے چھوڑ دیا۔

"اسے چھوڑ دو ــ یہ نہیں ہے!" اُس نے اپنے بھائیوں سے یہ کہتے ہوئے آنکھ سے مانیتی کی جانب اشارہ کیا جو اب بھی جوبا کے غلام کی طرف متوجہ تھا۔

راعون کے لڑکوں نے مجھے چھوڑ دیا اور گرد و پیش کے ماحول کو بھول کر کینہ توز نظروں سے مانیتی کی جانب گھورنے لگے۔ لیکن وہ ابھی تک اِس سنسنی خیز موڑ سے بے خبر تھا!

"مقدس مانیتی!" جوبا نے آگے بڑھ کر ناخوشگوار لہجے میں کہا "تو اکثر اپنی حدود سے تجاوز کرنے لگا ہے۔ میرے غلاموں کی زباں بندی تیرا حق تو نہیں ہے!"

"مانیتی اس صحرا کا حکمراں ہے اور یہاں وہی قانون بنے گا جو مانیتی چاہے گا" مانیتی اپنی آہنی شام والی چھڑی سے جوبا کی پیشانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "مانیتی اچھی طرح جانتا ہے کہ اِس بستی پر اور بستی والوں پر اس کا کیا حق ہے۔ کسی کو یہ سبق دینے کی ضرورت نہیں۔"

میں اس وقت شدید اعصابی اختلال میں مبتلا تھا، میرے پورے بدن میں بے شمار چیونٹیاں سنسنا رہی تھیں۔ میں نے مانیتی کے خلاف زبان کھولنی چاہی لیکن الفاظ حلق ہی میں پھنس کر رہ گئے۔ طوسیہ سے مانیتی کی کمزوری کا علم ہو جانے کے باوجود اس وقت میں مانیتی سے بُری طرح خائف تھا۔ وہ سخت نامساعد حالات میں گھرا ہونے کے باوجود جس طرح جوبا کو للکار رہا تھا اُس کے پیشِ نظر مجھے یہ یقین کرنا دشوار ہو رہا تھا کہ مانیتی اپنی پُراسرار قوتوں سے محروم ہو کر اب ایک کمزور اور ناتواں بوڑھا ہو کر رہ گیا ہے!

"مانیتی!" اچانک راعون کا ایک لڑکا اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا اور توہین آمیز لہجے میں مانیتی کو للکار کر اُس کی طرف لپکا۔ ایک ثانیے کے لئے وہاں جمع ہونے والوں کو سانپ سونگھ گیا۔ مانیتی بجلی کی سی پھرتی سے پیچھے پلٹا۔ اُس کا چہرہ اس اندازِ تخاطب پر دھواں ہو گیا تھا!

اِس سے پیشتر کہ راعون کا لڑکا مانیتی سے لپٹ پڑتا، مجمع میں سے کسی کی مذہبی عقیدت نے جوش مارا اور سنسناتی ہوئی آواز کے ساتھ ایک تیر اُس کی گردن میں ترازو ہو گیا!

وہ کڑیل جوان دلدوز چیخ مار کر زمین پر ڈھیر ہو گیا اور اِس سے قبل کہ اُس کی نبضیں ٹٹولی جاتیں اُس کا بدن کانپ کر ہمیشہ کے لئے ساکن ہو گیا۔

اِس حادثے کی وجہ سے چند سیکنڈ کے لئے لوگوں کی توجہ مانیتی کی جانب سے ہٹی اور وہ اِس مہلت سے فائدہ اُٹھا کر کسی طرف کھسک گیا!

اپنے بھائی کی موت کا یقین ہونے کے بعد راعون کے لڑکوں نے سر اوپر اُٹھایا اور غصے سے ناچ اُٹھے۔

"وہ فرار ہو گیا۔ دیکھو تمہارا مقدس پرہیز مجرموں کی طرح منہ چھپا کر بھاگا ہے، پھیل جاؤ پوری بستی میں اور اُسے تلاش کر کے اُس کے ٹکڑے اُڑا دو!" اُن میں سے ایک مٹھیاں بھینچ بھینچ کر بولا۔ فرطِ غضب سے اُس کے منہ سے کف جاری ہو گیا تھا۔

"اور سنو!" میں نے بھی زبان کھولی "اُس نے طوسیہ کو قید کیا ہوا ہے۔ صنم پرستوں کی شہزادی کی روح اُس کے صنم کا شکار ہے!" میں مجمع کے درمیان کھڑا ہو کر کسی مقرر کی طرح ان سب کو طوسیہ کی رحم انگیز سرگزشت سنانے لگا۔

راعون کے لڑکوں کی شوریدہ سری اور الزام تراشی نے جبرین والوں پر اتنا اثر نہیں کیا تھا لیکن جوں ہی میں نے بانگِ دہل طوسیہ کی داستان چھیڑی تو جبرین والوں کا خون جوش مارنے لگا۔ ان قزاقوں کے چہروں سے خون کی پیاس نمایاں ہونے لگی اور وہ ٹولیاں بنا بنا کر جبرین کے گلی کوچوں میں پھیلنے لگے۔ اِن میں راعون کے لڑکے پیش پیش تھے جو مانیتی کے سبب اپنے ایک جوان بھائی کی موت اور بہن کی آبرو کا تازہ داغ کھا چکے تھے!

"حسین! میرے دوست!" جوبا دونوں بانہیں پھیلا کر مجھ سے بغل گیر ہو گیا "اب مانیتی اسی سرزمین پر ذلیل و رسوا کیا جائے گا جہاں اُسکے نام کا سکہ چلتا تھا۔"

اُسی وقت آس پاس سے آوارہ کتوں کا شور سنائی دیا پھر فضا طالیس کے بھیانک قہقہے سے لرز اُٹھی۔ رات کی سیاہی میں اُبھرنے والی ان آسیبی آوازوں کے درمیان مانیتی کی دہشت زدہ چیخیں

بھی اُبھریں، جیسے وہ کسی چیز سے خوفزدہ ہو کر اپنا بچاؤ کر رہا ہو!
پھر کتّوں کا وہ شور قیامت کا سماں باندھنے لگا۔ وہ آوازیں مختلف سمتوں میں بھٹکتی آہستہ آہستہ جوبا کے خیموں کے نزدیک آ رہی تھیں!

اس وقت وہاں بیس اور جوبا کے سوا دس بارہ آدمی اور رہے ہوں گے۔ یہ وہ لوگ تھے جو شور اور ہنگامے کی آوازیں سُن کر بستی کے اندرونی حصّوں سے قدرے تاخیر سے وہاں پہنچے تھے اور ابھی تک پوری صورت حال سے واقفیت حاصل نہیں کر سکے تھے!
ہم لوگ سانس روکے آنے والے لمحات کے منتظر رہے پھر سامنے والے میدان میں ایک عبرتناک منظر نظر آیا۔
تاروں کی چھاؤں میں بستی کے تمام آوارہ کتّے ایک دائرے کی صورت میں مائینی کو اپنے نرغے میں لئے ہوتے تھے اور طالیس کے اشاروں پر اس خبیث بڈھے کو جوبا کے خیموں کی جانب ہانک رہے تھے۔ جب بھی مائینی ٹھٹکتا، کتّے اُس پر ٹوٹ پڑتے اور مائینی بُری طرح چیخنے لگتا۔ ان کتّوں کے تیوروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اگر طالیس اُن پر قابو نہ پائے رکھتا تو وہ بے رحمی کے ساتھ اُس کی بوٹیاں اُڑا ڈالتے!
مائینی کے اس شایانِ شان جلوس کے پیچھے جبرین کے بے رحم لٹاکا اور قزاق اپنی کمانیں کھینچے اور نیزوں کا رُخ مائینی کی جانب کئے چلے آ رہے تھے کہ وہ کتّوں سے بچ کر اگر کسی طرف بھاگنے کی کوشش کرے تو چشم زدن میں اُسے زمین پر ڈھیر کر دیں!
راعون کے لڑکے بھی آنے والوں میں شامل تھے۔ وہ بار بار کتّوں کے نرغے میں پھنسے ہوئے مائینی کی طرف لپکتے تھے مگر گونگا طالیس بڑی پھرتی اور مہارت کے ساتھ اپنے ایک ہاتھ کے سہارے انہیں واپس دھکیل دیتا تھا!
طالیس کی دیوانگی رخصت ہو چکی تھی۔ مائینی کے یوں زیر ہونے پر وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اسی کے ساتھ اس کی پھرتی اور چالاکی بھی واپس آ چکی تھی۔
طالیس نے اپنی زندگی کا جو حصّہ ذلّت کے عالم میں گذارا اور وہ اپنے رزق کے لئے کتّوں کا ہم نوالہ رہا وہ ضائع نہیں ہوا تھا۔ طالیس نے ان ہی کتّوں کے ذریعے مائینی کو گھیرا تھا اور اس وقت وہ کتّے یوں اس کے اشارے پر چل رہے تھے۔ جیسے طالیس ان کا آقا ہو۔

آخر کار مائینی جوبا کے سامنے آ پہنچا۔ جوبا نے اپنے پرانے غلام طالیس کو اشارہ کیا کہ وہ کتّوں کو وہاں سے ہٹا دے۔ طالیس نے فرماں بردار غلام کی طرح حلق سے چند بے معنی آوازیں نکال کر اپنا ہاتھ لہرایا اور وہ تمام کتّے دبی دبی آوازیں نکالتے بستی میں بھاگ گئے۔
مائینی کا پورا بدن کتّوں کے دانتوں اور پنجوں کے زخموں سے لہولہان ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا کر زمین پر بیٹھ گیا تھا۔ سردار جوبا کے خیمے کے سامنے دور دور تک جبرین والوں کا مشتعل اور بے چین ہجوم جمع تھا۔ وہ سب ہی جوبا کی زبان سے پوری کہانی سننے کے لئے بے تاب تھے۔ قریبی خیموں اور مکانوں میں سے عورتوں کے ہجوم جھانک رہے تھے۔ ہر ایک اس انقلاب کا راز جاننا چاہتا تھا جس نے پل بھر میں مائینی کے تقدس کے مصنوعی خول کو تار تار کر کے اس کے کراہت آمیز کردار کو بے نقاب کر دیا تھا۔ اور جبرین کا وہ معزز پیشوا اب خاک میں بیٹھا ہوا تھا۔
سردار جوبا نے کچھ دیر تک مجمع کا رنگ دیکھا پھر اپنے خیمے کے سامنے بنے ہوئے چبوترے پر چڑھ گیا
اس پر نظر پڑتے ہی سرگوشیاں دم توڑ گئیں اور وہاں مہیب سناٹا چھا گیا جس میں لوگوں کے چڑھتے ہوئے سانسوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔
"تم لوگ اب اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ، مائینی کے مقدّر کا فیصلہ سورج کی روشنی میں کیا جائے گا۔" جوبا نے اُونچی آواز میں کہا۔
"نہیں ہمیں مائینی کا سر چاہئے ــــ!"۔ مجمع میں سے بہت سی آوازیں آئیں۔
"تم سب جانتے ہو"۔ جوبا انہیں خاموش کرانے کے بعد بولا "کہ جبرین میں سورج غروب ہونے کے بعد گھروں سے نکلنا نحوست کی نشانی ہے۔ رات کی سیاہی میں گھروں سے کھلے آسمان کے نیچے نکلنے والوں کو نادیدہ بلائیں چاٹ جاتی ہیں۔ مائینی راتوں کی سیاہی میں نخلستان سے بستی میں آ کر گناہوں کی تخم ریزی کرتا رہا اور آج یہ اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں ذلت کی انتہا کو پہنچا دیا گیا۔ اب ہمیں اس وقت کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ یہ غلطیوں اور غلط فیصلوں کا وقت ہے، ہم صبح کا اُجالا پھیلتے ہی مائینی سے اپنا برسوں کا حساب بے باق کریں گے"۔
جوبا کے خاموش ہوتے ہی مجمع میں ملی جلی سرگوشیاں پھیلیں اور لوگ واپس لوٹنے لگے۔

"لیکن سردار! یہ بہت مکار ہے، کہیں موقع پاکر فرار نہ ہو جائے!" راعون کا ایک لڑکا جوبا کے قریب آکر بولا۔

"تم فکر نہ کرو۔ صبح تک مانینی میرے پاس بستی والوں کی امانت ہے" سردار جوبا نے پرعزم لہجے میں یہ کہہ کر اسے مطمئن کر دیا۔

طالبیس تماشائیوں کے ہجوم سے نکل کر خود بخود سردار جوبا کے غلاموں کی صف میں آ کھڑا ہوا تھا۔ مانینی کے بےبس ہوتے ہی طالبیس اس کے سحر سے آزاد ہو چکا تھا۔

"اس کے ہاتھوں اور پیروں میں آہنی بیڑیاں ڈال کر اسے مویشی خانے کے برابر والی کوٹھری میں بند کر دو۔ یہ بہت مکار ہے اس کا خیال رکھنا کہ فرار نہ ہونے پائے" سردار جوبا نے اپنے غلاموں سے مخاطب ہو کر کہا۔ پھر طالبیس کو خاص اشاروں کی مدد سے مانینی کی نگرانی کی ہدایات دینے لگا۔

سردار جوبا کی موجودگی میں ہی مانینی کو طوق اور بیڑیاں پہنا دی گئیں اور طالبیس اسے ہانکتا ہوا مویشی خانے کی طرف لے چلا جو سردار جوبا کے رہائشی خیموں کے عقب میں تھوڑی دور پر واقع تھا۔ میرا تو ارادہ تھا کہ مانینی کو وہاں بند کر کے ہی واپس آئیں لیکن جوبا اپنے غلاموں اور خاص طور پر گونگے طالبیس کی وجہ سے بہت زیادہ مطمئن نظر آ رہا تھا۔

سردار جوبا نے مجھے اپنے ہمراہ خیمے میں چلنے کی دعوت دی جسے میں نے خوشی سے قبول کر لیا

جب جوبا نشست گاہ سے گزر کر اپنی خوابگاہ میں جانے لگا تو میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔

"سردار میں یہیں رات بسر کروں گا" میں نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

"کیوں؟" اس نے حیرت سے پوچھا "میری خواب گاہ میں کئی آرام دہ بستر ہیں۔ میں کسی کنیز کو وہاں سے ہٹا دوں گا تجھے آرام کی ضرورت ہے!"

"میں تیرا احسان مند ہوں سردار مگر مجھے یہیں سونے دے"

جوبا نے اپنے سر کو جنبش دی اور اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔

اس وقت نشست گاہ میں صرف ایک موٹی مشعل روشن تھی۔ اپنے لئے جگہ کا انتخاب کرنے کے بعد میں نے وہ مشعل بھی گل کر دی اور اپنی جگہ پر لیٹ گیا۔

مجھے امید تھی کہ بنتِ نیل مانینی کے ستم سے نجات پانے کے بعد اب یہ رات میرے ہی ساتھ گذارے گی۔ میں اس کے انتظار میں بےچینی سے پہلو بدلنے لگا۔

چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ سردار جوبا کا وہ خیمہ مانوس خوشبوؤں سے مہک اٹھا۔

میں نے ہڑبڑا کر اٹھنا چاہا لیکن ایک نرم و نازک نسوانی ہاتھ نے میرے سینے پر دباؤ ڈال کر مجھے دوبارہ لٹا دیا۔

ان ہاتھوں کا لمس میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ رات کی تاریکی میں طوبیہ کا جواہر نگار طلائی تاج جگمگا رہا تھا اور قیمتی پتھروں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ وہ میرے سرہانے بیٹھی ہوئی تھی اور اس کا مسکراتا چہرہ میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔

میں نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا اور پھر اس کے لب و رخسار کی حرارت میری روح کی آسودگی اور فرحت کی نئی کہکشاؤں کی سیر کرانے لگی۔

"مانینی کا انجام مبارک ہو طوبیہ" اپنے وجود کو بہکتے ہوئے جذبات کے بھنور سے نکالنے کے لئے میں نے گفتگو کا سلسلہ چھیڑ دیا۔

"ابھی نہیں پیارے حسین!" وہ میری پیشانی چوم کر بولی۔ "مانینی اپنی غیر انسانی قوتوں سے تو محروم ہو گیا ہے۔ لیکن مجھے اب بھی ڈر ہے!"

"ڈر کس بات کا؟" میں نے حیرت سے کہا "اپنی قوتوں سے محروم ہو جانے کے بعد اب وہ نہ تمہیں پابند کر سکتا ہے، نہ پریشان کر سکتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن میری چھٹی حس کہتی ہے کہ وہ خبیث بڈھا پھر نئے گل کھلائے گا۔ اس کا نام مانینی ہے۔ وہ اتنی آسانی سے شکست نہیں مانے گا۔"

"تم تو مجھے اس سے ڈرا رہی ہو!" میں نے دھیمے سے ہنس کر کہا۔

"سنو حسین!" وہ سنجیدگی کے ساتھ بولی "میرا جسم اب میری روح کو پکار رہا ہے۔ میں اس وقت بھی سردار جوبا کی لڑکی زینو کا بدن چرا کر تمہارے پاس آئی ہوں۔ صدیوں کی یکسانیت سے میں اکتا گئی ہوں۔ اب مجھے میرا جسم چاہئے۔"

"صبح کی روشنی میں مانینی کا فیصلہ ہوتے ہی میں یہ بستی چھوڑ دوں گا طوبیہ!" میں نے اس کے رخسار تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

"صحرائی قزاقوں کی اس بستی سے مجھے وحشت ہونے لگی ہے۔"

"نہ جانے وہ صندلی کلیسا کہاں ہے، تمہیں اسکی تلاش میں بھی بھٹکنا ہوگا۔ میری خاطر تم بڑی دشواریوں میں پڑ گئے ہو حسین!" وہ کرب آمیز لہجہ میں بولی۔

"اگر وہ اسی صحرا میں ہے تو میں اسے تلاش کر لوں گا۔۔۔! طوسیہ میں تمہارے لئے سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہوں۔ اگر ماینی راہ میں حائل نہ ہوتا تو تم اب تک اپنے اصل روپ میں آ چکی ہوتیں۔"

"اب تم سو جاؤ۔۔۔ رات کافی ڈھل چکی ہے اور تم پچھلی شب سے تھکے ہوئے ہو!" وہ میرے بالوں میں اپنی مخروطی انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔

اسی وقت خواب گاہ سے جوبا کی آواز آئی۔ "حسین! کیا تو وہاں تنہا ہے؟"

"ہاں سردار!" میں نے بوکھلا کر جلدی سے جواب دیا "بھلا یہاں کون آئے گا۔" یہ کہہ کر میں نے اپنے سرہانے دیکھا تاکہ طوسیہ کو رخصت کر سکوں لیکن وہ سردار جوبا کی آواز سنتے ہی میری کسی ہدایت کا انتظار کئے بغیر رخصت ہو چکی تھی۔

"میں انجلی کو تیرے پاس بھیج رہا ہوں۔ یہ جیل سے لوٹی ہوئی بہت حسین کنیز ہے۔ تو اس کی آغوش میں آرام سے سو سکے گا۔" جوبا نے وہیں سے کہا۔

پھر تاریکی میں قدموں کی آہٹ سنائی دی اور میں نے چڑھتے ہوئے نسوانی سانسوں کی دھمک اپنے قریب محسوس کی۔

"انجلی!" میں نے آہستہ سے اسے پکارا۔

"کنیز حاضر ہے میرے آقا!" افسردگی میں لپٹی ہوئی مترنم آواز ابھری۔

مجھے اس کی آواز سے اس کی مظلومیت کا احساس ہوا پھر طوسیہ سے وفا کا عہد یاد آیا اور میں نے منہ پھیر کر کروٹ لے لی۔

"تم میرا سر سہلاتی رہو!" میں نے محتاط لہجے میں اس سے کہا اور آنکھیں موند لیں۔

آہستہ آہستہ مجھ پر غنودگی چھانے لگی اور پھر میں نیند کی آغوش میں کھو گیا۔

صبح میری آنکھ کھلنے کا سبب تیز شور تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو وہ خیمہ سورج کی کرنوں سے منور ہو رہا تھا اور میں وہاں تنہا تھا۔ خیمے سے باہر بے شمار آدمیوں کے شور کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں جن کے باعث صورتحال کا اندازہ لگانا دشوار تھا۔

میں باہر جا کر صورتحال کا جائزہ لینے کی نیت سے اُٹھا ہی تھا کہ سردار جوبا آندھی کی سی رفتار سے خیمے میں داخل ہوا اور میرے شانے دبوچ کر گھبرائی ہوئی آواز میں بولا "غضب ہو گیا حسین! ماینی طالیس اور دوسرے غلاموں کو فریب دے کر کوٹھری کی کھڑکی گرا کر طوق اور بیڑیوں سمیت فرار ہو گیا۔ طالیس غصے سے پاگل ہو کر اپنے بال نوچتا صحرا میں نکل گیا ہے۔ بستی کے تمام آوارہ کتے بھی اس کے ساتھ ہیں۔"

یہ خبر سن کر میرے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ طوسیہ کا اندیشہ سو فیصدی درست ثابت ہوا تھا۔

"اور یہ باہر شور کیسا ہے؟" میں نے جوبا سے پوچھا۔

"جبرین والے ماینی کے مقدر کا فیصلہ کرنے کے لئے جوق در جوق چلے آ رہے ہیں۔۔۔۔ انھیں ابھی تک ماینی کے فرار کا علم نہیں ہوا ہے۔" وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سرگوشیانہ آواز میں بولا۔

"راعون کے لڑکے نے پچھلی رات ہی تجھے ہوشیار کیا تھا یہ خبر سن کر بستی والے پاگل ہو جائیں گے۔" میں نے پُر تشویش لہجے میں کہا۔

"اب کیا کرنا چاہیئے؟" جوبا بہت زیادہ مضطرب تھا۔

"جبرین والوں کو پوری بات بتا دو۔ تم ماینی کے فرار کو زیادہ دن نہ چھپا سکو گے!" میں نے سردار جوبا کے لئے اپنے دل میں ہمدردی محسوس کی۔

"لیکن ان کے عتاب سے میں کیسے بچوں گا؟" جوبا کراہا۔

"ہاں۔ یہ بتاؤ کہ ماینی کی تلاش میں کسی کو نخلستان کی طرف بھی بھیجا ہے؟" میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کسی نوری خیال کے تحت پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ وہ ادھر کا رخ بھی نہیں کرے گا۔" جوبا نے لاپرواہی سے میری بات کو نظر انداز کر دیا۔

"اونٹ سنبھالو۔ وہ ادھر ہی گیا ہوگا۔" میں نے جوبا کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتے ہوئے کہا۔

ہم باہر جمع ہونے والوں کی بھیڑ کاٹتے تیزی کے ساتھ مویشی خانے پہنچے اور آناً فاناً میں دو اونٹوں پر سوار ہو کر نخلستان کی

طرف روانہ ہو گئے۔

بستی سے نکل کر ہمیں دور ہی سے نخلستان نظر آنے لگا۔

مانبنی کا خیمہ بھی اپنی جگہ صحیح سالم کھڑا ہوا تھا۔

میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ میرا اندیشہ غلط نکلا مگر میں نے جوبا پر اپنے اس خیال کا اظہار نہیں کیا۔ کیونکہ وہ اس وقت خاصا زود حس ہو رہا تھا۔

جس وقت ہمارے اونٹ پوری رفتار سے دوڑتے ہوئے نخلستان کے لہلہاتے سبزہ زار میں داخل ہوئے مانبنی کے خیمے میں آگ بھڑک اٹھی۔

"وہ وہیں ہے... وہ وہیں ہے" سردار جوبا جوشیلی آواز میں چلایا اور ہمارے اونٹ ہمک کر اور تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔

ہمارے نخلستان کے وسط میں پہنچنے تک مانبنی کے خیمے میں کئی جگہ آگ لگ چکی تھی۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ مانبنی آگ لگانے میں ایسا منہمک ہے کہ ہم اسکے سر پر پہنچ جائیں لیکن تقدیر کو یہ منظور نہیں تھا۔ ہم نے شعلوں کے عقب سے ایک اونٹ نکلتے دیکھا جس کے کوہان سے ایک مختصر سا استخوانی ڈھانچہ لپٹا ہوا تھا۔ آتش زدہ خیمے کی اوٹ سے نکلتے ہی وہ اونٹ بھڑک کر پوری رفتار سے آگے دوڑنے لگا۔ اونٹ کے بھاگنے کے ساتھ ہی آہنی بیڑیوں اور طوق کے بجنے کی مسلسل آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

"وہ جا رہا ہے" سردار جوبا بے تابی کے ساتھ چلایا۔

"اونٹوں کی رفتار اور تیز کرو۔ ہم ذرا ہی دیر میں اسے جا لیں گے"

مانبنی کا اونٹ بجلی کی سی سرعت سے دوڑ رہا تھا۔ ہم اس کا تعاقب کرتے چند ہی منٹ میں لہلہاتے نخلستان سے نکل کر ریگستان میں داخل ہو گئے۔

"مانبنی ٹھہر جا۔ ورنہ تو صحرا میں بھوکا پیاسا مارا جائیگا"

سردار جوبا اپنے اونٹ کی پشت پر اچک کر پوری قوت سے چلایا۔

مانبنی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور چند ہی منٹ بعد صحرا کی فضا میں مانبنی کی حدی کی لے گونج اٹھی۔ وہ پرسوز آواز میں حدی خوانی کر رہا تھا۔

مانبنی کی یہ تدبیر کارگر ہوئی اور اس کا اونٹ ریت کے بگولے اڑاتا لحظہ بہ لحظہ ہم سے دور ہونے لگا "تو بھی حدی گا... خاموش کیوں ہے حسین، دیکھ وہ نکلا جا رہا ہے" جوبا جھلائی ہوئی آواز میں دھاڑا۔

میں نے اپنی زندگی میں کبھی حدی خوانی نہیں کی تھی۔ لیکن اس وقت مانبنی کو جا لینے کی ایسی دھن سوار تھی کہ میں نے اپنی بے ہنگم آواز میں ایک صحرائی نغمہ چھیڑ دیا۔ جوبا جھلائے ہوئے انداز میں چیخ چیخ کر میرا ساتھ دینے لگا۔ اس کے انداز سے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ مانبنی کو گالیاں دینے کا تصور کر کے نغمہ گا رہا ہو

ہمارے اونٹوں کی رفتار میں قدرے اضافہ ہوا لیکن مانبنی اب بھی ہم سے تیز جا رہا تھا۔ صحرا کی انتھاہ وسعتوں میں کسی سمت کا تعین کئے بغیر وہ اپنی موت سے فرار حاصل کر رہا تھا۔

عین اسی وقت بائیں جانب آوارہ کتوں کا شور بلند ہوا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

"طالبس... طالبس" سردار جوبا نے بے قراری کے عالم میں اپنے سیاہ فام غلام کو پکارا اور فوراً ہی اس گونگے نے ایک تیز چیخ کے ساتھ اپنی موجودگی کا اعلان کیا

پھر سردار جوبا پر دورہ سا پڑ گیا۔ وہ چیخ چیخ کر حلق سے بے معنی آوازیں نکال رہا تھا۔ لیکن میں یہ محسوس کر کے حیران رہ گیا کہ طالبس کافی دور ہونے کے باوجود جوبا کا مدعا سمجھ گیا اور جوبا کے خاموش ہونے سے پہلے ہی آوارہ کتوں کا غول ہمارے اونٹوں کے آگے، مانبنی کے تعاقب میں بڑھنے لگا۔

مانبنی کی حدی کی گونج اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ اس کا اونٹ ہم سے بہت دور نکل چکا تھا۔ طالبس کے آوارہ کتے اسکے تعاقب میں تھے اور ہمارے اونٹ پوری رفتار سے اسی جانب میں دوڑے جا رہے تھے۔

میں جوبا اور طالبس کی لایعنی چیخوں کے درمیان خاموش ہو گیا تھا لیکن جوبا نے غضب ناک غراہٹ کے ساتھ مجھے دوبارہ نغمہ گانے کا حکم دیا اور ہم دونوں ایک دوسرے سے آوازیں ملانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے ایک صحرائی گیت گانے لگے۔

اس بار ہمارے اونٹوں کی رفتار میں کوئی فرق نہ آیا۔

مانبنی کے اونٹ کے ساتھ ہی غبار کے طوفان میں چھپے ہوئے کتوں کا شور بھی بتدریج ہم سے دور ہوتا جا رہا تھا۔

سنگتراش کے باقی واقعات

آئندہ ماہ پڑھیے

خوفناک تاخیر

بیرونی

دفتر میں جہاز راں کمپنی کے سپرنٹنڈنٹ کیپٹن فریم کی سیکرٹری اور کسی مرد کے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز ابھری تو کیپٹن فریم نے کام کرتے کرتے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اسی لمحہ دروازہ ایک دھماکے کے ساتھ کھلا اور ایک سنہری بالوں والا نوجوان جس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال نظر آتی تھی اندر داخل ہوا۔ احتجاج کرتی ہوئی سیکرٹری بھی اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔

"کیپٹن میں نے ہر چند ان صاحب سے......"

لیکن قبل اس کے کہ اس کا فقرہ مکمل ہو نوجوان نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا کیپٹن غصّہ کے عالم میں ابھی کرسی سے اُٹھا ہی تھا کہ نوجوان کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر رک گیا۔

"بیٹھ جاؤ" نوجوان نے سخت لہجہ میں کہا کیپٹن کچھ ہچکچاتے ہوئے دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُسے اسٹیلر لائینز کمپنی میں اپنی طویل ملازمت کے دوران ایسا عجیب واقعہ کبھی پیش نہیں آیا تھا۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے نوجوان" اُس نے سنبھلتے ہوئے کہا "یہاں دفتر میں کوئی قیمتی چیز یا نقدی نہیں رہتی"۔

"میں یہاں ڈاکہ ڈالنے نہیں آیا" نوجوان نے جواب دیا

اویس ناصر

"میرا مقصد کچھ اور ہے"۔

اُس نے اپنی سنہری پٹی والی رسٹ واچ کی طرف دیکھا۔ اسی لمحہ قریبی ساحل پر کھڑے ہوئے جہاز کی سیٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔

"یہ سیٹی غالباً جہاز اسٹار لائٹ نے ملاقاتیوں کو اُترنے کے لیے ہدایت کے طور پر دی ہے"۔ نوجوان بولا "اسے ٹھیک دو بجے گویا اب سے پندرہ منٹ بعد یہاں سے روانہ ہونا ہے۔ تم اس کے کیپٹن کو فون کر و کہ جہاز کچھ تاخیر سے چلایا جائے گا"۔

"اور اگر میں انکار کر دوں"۔ کیپٹن فریم نے غصّہ سے سُرخ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"تب پھر میں تمہیں بلاتامّل شوٹ کر دوں گا اور گولیوں سے اپنا راستہ بناتے ہوئے نکل جاؤں گا"۔

کیپٹن فریم نے غور سے نوجوان کی طرف دیکھا۔ اسے اس قسم کے حالات کا کوئی تجربہ نہیں تھا مگر نوجوان کے انداز بتا رہے تھے کہ وہ محض دھمکی نہیں دے رہا ہے بلکہ اُس پر عمل کرنے کا بھی ارادہ رکھتا ہے۔

"مجھے اُمید نہیں کہ تم ایک معمولی بات کے لئے اپنی اور دوسروں کی زندگی خطرے میں ڈالنا پسند کرو گے"۔ نوجوان کہہ رہا تھا "جہاز کی روانگی میں زیادہ سے زیادہ نصف گھنٹہ کی دیر ہوگی اور یہ کوئی بڑی بات نہیں"۔

"لیکن تمہارے لئے اتنی اہم ضرور ہے کہ اس کی خاطر تم اپنی اور دوسروں کی جان سے کھیل سکتے ہو"۔

"یقیناً۔ مگر ہم قیمتی وقت ضائع کر رہے ہیں۔ فون اُٹھاؤ اور اسٹار لائٹ کے کیپٹن سے کہو کہ جب تمام ملاقاتی جہاز سے اُتر جائیں تو وہ پریسر کے ذریعے مسافروں کو اطلاع دے کہ ایف بی آئی کے آدمی سامان کی تلاشی لینے کے لئے آ رہے ہیں۔ شبہ ہے کہ کوئی مسافر قیمتی اور اہم دستاویزات چرا کر لئے جا رہا ہے۔ اس بنا پر جہاز تاخیر سے روانہ ہوگا"۔

کیپٹن فریم نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اُٹھا لیا۔

"گفتگو میں یہاں کے حالات کا کوئی اشارہ نہیں ہونا چاہیئے"۔ اجنبی نوجوان نے تنبیہہ کی "اسی طرح اگر تمہاری سیکرٹری یا کوئی ملاقاتی آ جائے تو اُسے بھی جلد سے جلد ٹالنے کی کوشش کرنا"۔ اُس نے ریوالور جیب میں رکھ لیا مگر اس طرح کہ ایک ہاتھ دستے پر موجود تھا۔

کیپٹن نے آپریٹر سے اسٹار لائٹ کا کنکشن مانگا۔ اور جب رابطہ قائم ہو گیا تو بولا۔

"کون بات کر رہا ہے؟"

"کوارٹر ماسٹر"۔ جواب ملا "آپ کس سے بات کرنا چاہتے ہیں؟"

"میں میرین سپرنٹنڈنٹ بول رہا ہوں۔ ذرا کیپٹن برونسٹن کو بلاؤ۔"

"بہت اچھا۔ ابھی بلاتا ہوں۔" کوارٹر ماسٹر نے جواب دیا۔

کیپٹن فریم کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ عام طور پر کسی جہاز کی روانگی میں تاخیر یا تو مسافروں کی دیر سے آمد کی وجہ سے ہوتی تھی یا پھر سامان کی وجہ سے۔ جو عذر نوجوان نے پیش کیا تھا وہ صاف طور پر بناوٹی معلوم ہوتا تھا۔ اگر ایف بی آئی کے لوگ جہاز کی تلاشی لینا چاہتے تو اپنی آمد کا اس طرح اعلان نہ کرتے۔ اجنبی نوجوان کبھی دیوار پر لٹکی ہوئی تصویر کی طرف دیکھنے لگتا اور کبھی کیپٹن کے چہرے کی جانب۔ لیکن یہ بات ظاہر تھی کہ اسے جہاز راں کمپنی اور اس کے طور طریقوں کے بارے میں خاصی معلومات تھیں۔ مثلاً وہ جانتا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ ہی جہاز کے کپتان کو روانگی ملتوی کرنے کا حکم دے سکتا ہے۔ یا پھر یہ کہ روانگی میں تاخیر کی اطلاع جہاز کے پرسر کے ذریعہ ہی مسافروں تک پہنچائی جاتی ہے۔

"کیا معاملہ ہے ہیری" کیپٹن برونسٹن کی آواز ابھری۔

"جیسے ہی تمام ملاقاتی عرشے سے اتر جائیں جہاز کی روانگی اس وقت تک کے لئے ملتوی کر دی جائے جب تک میری جانب سے کوئی دوسری ہدایت نہ ملے۔" کیپٹن فریم نے کہا۔

"کیوں؟" برونسٹن نے جلدی سے پوچھا "کیا جہاز پر کسی بم کی موجودگی کا شبہ ہے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں" کیپٹن فریم نے جواب دیا "بر سر ے کہو کہ وہ مسافروں کو اطلاع دے کہ ایف بی آئی کے لوگ کچھ اہم دستاویزات کی تلاشی کے سلسلے میں جہاز کا سامان چیک کرنا چاہتے ہیں۔"

"کیا وہ پاگل ہو گئے ہیں۔ یہ اطلاع دینے کا مطلب تو یہ ہوگا کہ چور کو دستاویزات چھپانے کا موقع فراہم کر دیا جائے۔"

بالکل وہی بات جو میں سوچ رہا تھا۔ کیپٹن نے دل میں کہا مگر بظاہر بولا "مجھے یہی ہدایت دی گئی ہے اور ہمیں اس کی پابندی کرنا ہے۔"

"بہت اچھا۔" برونسٹن نے جواب دیا "ظاہر ہے ایف بی آئی والے اپنے معاملات ہم سے بہتر سمجھتے ہیں۔"

کیپٹن فریم نے ریسیور کریڈل پر ڈالتے ہوئے نوجوان کی طرف دیکھا اور کہا "اب کیا کرنا ہوگا؟"

"اگر تمہیں کوئی فون کرے تو اس سے کہو کہ کچھ دیر بعد بات کرے۔" نوجوان نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ تمہاری فون لائن کھلی رہے۔"

کیپٹن فریم نے اپنے سامنے رکھے ہوئے فائلوں کو دیکھا "اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں اپنا کام کرتا رہوں؟" اس نے نوجوان سے پوچھا۔

اجنبی نوجوان صرف شانے اچکا کر رہ گیا۔ کیپٹن قلم اٹھا کر مختلف خطوط اور کاغذات پر دستخط کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اپنا کام ختم کر کے اس نے پھر نوجوان کی طرف دیکھا "میری سیکریٹری ان کاغذات کی منتظر ہوگی کیا میں اسے بلا کر انہیں اس کے حوالے کر دوں؟"

اسے توقع تھی کہ نوجوان اس پر معترض ہوگا۔ یا کم سے کم ان کاغذات کو ایک نظر ضرور دیکھنا چاہے گا کہ کہیں اس نے دستخط کرنے

کے بہانے کچھ اور تو نہیں لکھ دیا ہے۔ مگر نوجوان اس مرتبہ بھی کندھے ہلا کر رہ گیا۔ کیپٹن نے بٹن دبا کر سیکریٹری مس بارتھ کو بلایا۔ وہ اندر داخل ہوئی تو نوجوان نے اس کے سراپا پر پسندیدہ نظریں ڈالیں مس بارتھ خوبصورت تھی۔ اگرچہ کیپٹن فریم کو لباس کے معاملے میں اس کے ذوق سے اختلاف تھا۔ وہ پتلون پہن کر دفتر آتی تھی۔ مگر وہ اس کی مرضی کے خلاف کوئی خاص لباس پہننے پر اسے مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ اس کی اپنی سیکریٹری ایک ماہ کی رخصت پر تھی اور مس بارتھ کو پرسنل ڈپارٹمنٹ کی جانب سے عارضی طور پر اس کی جگہ کام کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔

مس بارتھ نے خشمگیں نگاہوں سے نوجوان کی طرف دیکھا اور میز پر سے تمام کاغذات سمیٹ کر چلی گئی۔ اس کے انداز سے کیپٹن فریم کو اس بات کا اندازہ نہیں ہو سکا کہ آیا اس نے نوجوان کی موجودگی کی وجہ سے کوئی غیر معمولی بات محسوس کی تھی یا نہیں۔ ابھی سیکریٹری کو گئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ کیپٹن نے ریسیور اٹھا لیا۔

"کوئی شخص اس نوجوان سے بات کرنا چاہتا ہے جو آپ کے دفتر میں بیٹھا ہے۔" مس بارتھ کی آواز ابھری۔

"تمہارا فون ہے۔" کیپٹن فریم نے ریسیور نوجوان کی طرف بڑھایا۔ اجنبی نوجوان نے جلدی سے ریسیور لے کر کان سے لگا لیا۔

"ہیلو آرٹ" وہ بولا "کیا خبریں ہیں۔" پھر وہ خاموش ہو کر دوسری طرف سے کی جانے والی گفتگو سنتا رہا۔

"ٹھیک ہے۔" آخر میں اس نے کہا "تم کار تک چلو، میں ابھی آ رہا ہوں۔"

نوجوان نے ریسیور کریڈل پر ڈالتے ہوئے کیپٹن فریم کو مخاطب کیا۔ "اپنی سیکریٹری کو اندر بلاؤ۔ اسے ہدایت کرو کہ وہ ایک خط لینے کے لئے میرے ساتھ نیچے میری کار تک چلے۔ اور اگر تم اسے بخیر و عافیت دیکھنا چاہتے ہو تو اس کی واپسی تک کوئی غلط حرکت مت کرنا۔"

کیپٹن فریم نے ہدایت کے مطابق عمل کیا۔ اجنبی نوجوان مس بارتھ کو ساتھ لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ کیپٹن نے اتنی دیر توقف کیا کہ وہ دونوں نیچے اتر جائیں اور پھر خود بھی اپنے دفتر سے نکل کر ایک ایسے کمرے میں پہنچا جس کی کھڑکی سے نیچے سڑک کا منظر دیکھ سکے۔ اس نے نوجوان اور مس بارتھ کو بلڈنگ کے صدر دروازے سے نکلتے دیکھا۔ وہ پارکنگ پلاٹ کی طرف جا رہے تھے۔ کیپٹن نے دیکھا کہ ایک اور شخص گھاٹ کے دروازے سے نکل کر تیز تیز قدموں سے ایک نیلے رنگ کی اسپورٹ کار کی جانب بڑھ رہا ہے۔ جیسے ہی وہ اندر بیٹھا اجنبی نوجوان اور مس بارتھ بھی کار کے نزدیک پہنچ گئے۔ نوجوان نے مس بارتھ سے کوئی بات کہے بغیر اچھل کر کار میں بیٹھتے ہوئے ڈرائیونگ وہیل سنبھالا اور دوسرے لمحہ کار ایک جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ کیپٹن فریم نے اس کا پلیٹ نمبر دیکھنے کی کوشش کی مگر اسی لمحہ ایک ٹیکسی کی آڑ ہو جانے کی وجہ سے وہ نمبر نوٹ نہیں کر سکا۔ نیلی کار جلد ہی ٹریفک کے ہجوم میں غائب ہو گئی۔

کیپٹن فریم جلدی سے اپنے دفتر واپس آیا اور ٹیلیفون پر جہاز اسٹار لائٹ سے رابطہ قائم کیا۔ اس مرتبہ ریسیور جہاز کے تھرڈ میٹ نے اٹھایا۔ کیپٹن فریم نے اس سے کہا کہ وہ فوراً کیپٹن برونسٹن کو بلائے۔

اس دوران مس بارتھ چہرے پر ناگواری کے تاثرات لئے اندر داخل ہوئی۔ "اس نے مجھے کوئی خط نہیں دیا اور ایک دوسرے آدمی کے ساتھ کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔" اس نے بتایا۔

"کیا تم نے اس کی کار کا نمبر نوٹ کیا" کیپٹن فریم نے پوچھا

"نہیں تو۔ کیا مجھے دیکھنا چاہیئے تھا؟"

"خیر کوئی بات نہیں۔ تم جاؤ۔" کیپٹن نے کہا۔ ظاہر تھا کہ اس کی سیکریٹری کو ابھی تک کسی قسم کا شبہ پیدا نہیں ہوا تھا۔

مس بارتھ کمرے سے باہر گئی تو دوسری جانب برونسٹن کی آواز سنائی دی۔

"جہاز پر کیا ہو رہا ہے" کیپٹن فریم نے اس سے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ ایف بی آئی والے ابھی تک نہیں آئے ہیں۔ مسافر جہاز کی روانگی کے منتظر ہیں۔"

"میں جو کچھ بتانے والا ہوں اسے ابھی اپنی ذات تک رکھنا" کیپٹن فریم نے کہا۔ "دراصل مجھے ریوالور کے زور پر حکم دیا گیا تھا کہ میں جہاز کو روانہ ہونے سے روک دوں اور وجہ یہ بیان کروں کہ ایف بی آئی والے جہاز کے سامان کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔ پھر اس آدمی کو جس نے مجھے ریوالور دکھا کر یہ سب کچھ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ایک فون کال موصول ہوئی۔ اس نے مس بارتھ کو بطور یرغمال اپنے ساتھ لیا اور نیچے چلا گیا۔ جہاں غالباً اس سے وہ آدمی ملا جس نے اسے فون کیا تھا اور وہ دونوں مس بارتھ کو چھوڑ کر رفوچکر ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے بہرحال میں ان حالات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں تم جہاز کے لنگر اٹھا دو اور روانہ ہو جاؤ۔"

"ایک مسافر اخبار لینے گیا ہوا ہے۔" برونسٹن نے جواب دیا "کہہ رہا تھا کہ اسے اسٹاک مارکیٹ کی تازہ خبریں درکار ہیں۔ پرسر نے اسے خبردار کر دیا تھا کہ ممکن ہے کہ تلاشی کے پروگرام کو ملتوی کر دیا جائے

چنانچہ جہاز کسی بھی لمحہ روانہ ہو سکتا ہے۔ مگر وہ پھر بھی چلا گیا میں مزید پانچ منٹ تک اُس کا انتظار کر کے جہاز چلا دوں گا۔"

کیپٹن فریم نے ریسیور رکھ دیا اور پھر یہ سوچتے ہوئے کہ اس کا اگلا قدم پولیس میں رپورٹ کرنا ہونا چاہیئے ۔۔ مقامی تھانے کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسرے لمحہ ڈیسک سارجنٹ کی تھکی تھکی آواز اُبھری۔

"میں اسٹیلر لائینز جہاز راں کمپنی کا سپرنٹنڈنٹ کیپٹن فریم بات کر رہا ہوں" کیپٹن نے بتایا "ابھی کچھ دیر قبل ایک نوجوان میرے دفتر میں داخل ہوا اور ریوالور دکھا کر مجھے حکم دیا کہ میں جہاز اسٹار لائٹ کی روانگی رکوا دوں۔ پھر بعد میں وہ میری سیکریٹری کو یرغمال بنا کر اپنے ساتھ پارکنگ پلاٹ تک لے گیا جہاں ایک اور آدمی اس کی کار میں آبیٹھا اور وہ دونوں سیکریٹری کو وہیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔"

"آپ نے اس کی کار کا نمبر نوٹ کیا؟"

"نہیں۔ میں نے کوشش کی تھی مگر ایک ٹیکسی سامنے آجانے کی وجہ سے نمبر پلیٹ چھپ گئی" کیپٹن فریم نے جواب دیا "ویسے وہ ایک نیلے رنگ کی اسپورٹ کار تھی"

"وہ شخص جہاز کی روانگی کیوں رکوانا چاہتا تھا؟" سارجنٹ نے سوال کیا۔

جواب میں کیپٹن فریم نے مختصر طور پر تمام حال کہہ سنایا۔ فون پر سارجنٹ کے ایک گہری سانس لینے کی آواز سنائی دی۔

"کیپٹن" اُس نے جواب دیا "ہم ایک آدمی کو تحقیقات کے لئے آپ کے پاس بھیجیں گے۔ اس وقت ہمارے تمام آدمی کسی نہ کسی کیس کے سلسلے میں باہر گئے ہوئے ہیں۔ اس لئے کچھ وقت لگ جائے گا"

ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے کیپٹن فریم نے سوچا کہ سردست پولیس سے کوئی مدد نہ ملنے کی صورت میں اسے خود اپنے طور پر تحقیقات کی ابتدا کرنا پڑے گی۔ بہر حال یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اپنی دوران ملازمت وہ اس سے ملتی جلتی نوعیت کی تحقیقات کرتا رہا تھا۔ تحقیقات کا آغاز گھاٹ سے کرنا چاہیئے جہاں سے وہ آدمی نمودار ہوا تھا جو بعد میں اجنبی نوجوان کے ساتھ کار میں چلا گیا۔ کیا وہ وہی شخص تھا جسے نوجوان نے فون پر آرٹ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ گھاٹ کے گیٹ سے باہر آنے والا وہ مسافر ہو جو جہاز سے اخبار خریدنے اُترا تھا۔ اس کی تصدیق جہاز کے کپتان کو فون کر کے ہو سکتی ہے کہ آیا وہ مسافر واپس آیا تھا یا نہیں۔

کیپٹن فریم ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسٹار لائٹ جہاز نے روانگی کی وسل دی۔ گویا اب اس سے فون پر رابطہ قائم نہیں کیا جا سکتا تھا کیپٹن نے گھاٹ کے بیگیج روم کو فون کیا۔

"کیا اسٹار لائٹ سے کسی مسافر کا سامان اُتارا گیا تھا" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں" روم انچارج نے جواب دیا "مارٹن کرانڈل نامی ایک مسافر کا سامان اتارا گیا ہے۔ یہ صاحب جہاز سے اخبار خریدنے اُترے تھے مگر پھر واپس نہیں پہنچے"

"اب یہ سامان اس شخص کو یا کسی اور کو اُس وقت تک مت دینا جب تک مجھ سے اجازت نہ لے لو" کیپٹن نے حکم دیا اور ریسیور رکھ دیا۔

وہ اس وقت خاصے جوش میں تھا۔ اگر کرانڈل وہ ہی شخص تھا جو اس نوجوان کے ساتھ کار میں گیا ہے تو اُسے بڑی آسانی کے ساتھ اس کے ٹکٹ ریکارڈ سے تلاش کیا جا سکتا ہے جو کہ پیسنجر ڈیپارٹمنٹ کے فائلوں میں موجود ہوگا۔ اُس نے جلدی سے وہ فائل اُٹھایا جو اسٹار لائٹ کے مسافروں کی فہرست اور دوسرے ضروری کاغذات کے ساتھ پیسنجر ڈیپارٹمنٹ سے آیا تھا۔ فائل دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مارٹن کرانڈل نامی مسافر کو جہاز کی دوسری منزل بندرگاہ کرسٹوبال پر اُترنا تھا۔

اچانک کیپٹن فریم کو خیال آیا کہ ممکن ہے کرانڈل وہ آدمی نہ ہو جو اس نوجوان کے ساتھ کار میں گیا تھا۔ اُس نے جلدی سے گیٹ کے واچ مین کو فون کیا۔

"جان" اُس نے واچ مین سے پوچھا "اسٹار لائٹ کی روانگی میں تاخیر کے دوران کیا تم نے کسی آدمی کو بڑی عجلت میں گھاٹ سے رخصت ہوتے دیکھا تھا"

"جی ہاں" واچ مین نے جواب دیا "میں نے اسے ایک

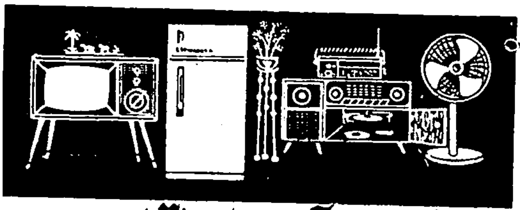

نقد اور آسان قسطوں پر
پنکھے، نئے ماڈل کے ٹیلیویژن سیٹ، ریفریجریٹر، اور دیگر گھریلو اشیاء نقد اور آسان اقساط پر حاصل کیجئے
یہ سہولت صرف کراچی کے لیے ہے
رفیع کارپوریشن
بلاک ایف الاعظم اسکوائر، کراچی۔ فون 681813 دکان اتوار کو بھی کھلی رہتی ہے
ADKO

ٹیلیفون بوتھ سے نکلتے دیکھا تھا۔ بوتھ سے باہر آتے ہی وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا گیٹ سے باہر نکلا اور پارکنگ پلاٹ کی طرف جانے لگا۔"

"کیا اس وقت کوئی دوسرا آدمی بھی گیٹ سے رخصت ہوا تھا" کیپٹن فریم نے سوال کیا۔

"جی نہیں" واچ مین نے کچھ غور کرنے کے بعد جواب دیا۔ "مگر ایک آدمی اس سے کچھ قبل گھاٹ پر آیا ضرور تھا۔ وہ باہر جانا چاہتا تھا مگر کسٹم گارڈ نے اسے روک لیا اور اندر آفس میں لے گیا۔ وہ ابھی تک وہاں سے باہر نہیں نکلا ہے۔"

"شکریہ جان" کیپٹن نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

ظاہر تھا کہ دوسرا آدمی یا تو کرانڈل ہوگا یا کوئی ملاقاتی جس پر کسٹم گارڈ کو اسمگلنگ کا شبہ ہوا ہوگا۔ کیپٹن فریم نے فوراً کسٹم کے انسپکٹر انچارج کو فون کیا۔

"جیکسن، میں کیپٹن فریم بات کر رہا ہوں۔ اسٹار لائٹ کا ایک مسافر کرانڈل نامی سوار ہونے سے رہ گیا ہے۔ کیا وہ تمہارے دفتر میں تو نہیں ہے؟"

"یہاں اس نام کا ایک آدمی موجود تو ہے مگر وہ یہ نہیں بتاتا کہ وہ اسٹار لائٹ کا مسافر ہے یا کوئی ملاقاتی" جیکسن نے جواب دیا "ہم نے اسے ایف بی آئی کے کہنے پر روک رکھا ہے۔"

"ایف بی آئی" کیپٹن فریم نے چونک کر پوچھا۔

"جی ہاں۔ وہ تقریباً پانچ لاکھ ڈالر کے سیکورٹی بانڈ اپنی کمر کے گرد چھپا کر لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔" جیکسن نے بتایا۔ "میں نے معلومات کرنا چاہیں کہ وہ بانڈ چوری کے تو نہیں ہیں۔ جواب میں ایف بی آئی والوں نے کہا کہ وہ خود اس معاملے کی تحقیقات کے لئے آ رہے ہیں۔"

"کیا کسی نے اس کے خلاف مخبری کی تھی؟"

"مخبری کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ جب ایک دبلا پتلا آدمی اس طرح پیٹ پھلائے چلا آ رہا ہو جیسے اسے چھ ماہ کا حمل ہے تو کوئی احمق سے احمق کسٹم گارڈ بھی اسے تلاشی لئے بغیر نہیں چھوڑ سکتا۔"

کیپٹن فریم نے ریسیور رکھ دیا۔ تو ایف بی آئی اور مسروقہ دستاویزات کی بات کسی نہ کسی حد تک ضرور درست تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ کرانڈل اور اس کے دفتر میں آنے والے نوجوان کے مابین کوئی تعلق بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ ایف بی آئی کو ان سے دلچسپی ہو سکتی ہے۔

کیپٹن فریم نے مقامی ایف بی آئی کے دفتر کو فون کیا اور اسپیشل ایجنٹ انچارج سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ کچھ دن پہلے ایک قتل کی واردات کے سلسلے میں وہ اس سے متعارف ہو چکا تھا۔

"گڈ آفٹر نون کیپٹن فریم۔ کہو مزاج تو اچھے ہیں؟" ایجنٹ نے خوش دلی سے پوچھا۔

جواب میں کیپٹن نے اب تک کے تمام حالات ایجنٹ کو سنا دیئے۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کرانڈل کا اس واقعہ سے ضرور کوئی تعلق ہے۔" آخر میں اس نے کہا۔

"مگر گھاٹ پر تو اس نے بالکل چپ سادھ لی تھی" ایجنٹ نے بتایا "اب اسے یہاں لایا جائے گا تو میں اس سے مزید سوالات کر کے معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس سلسلے میں تمہاری بتائی ہوئی باتیں بہت کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں۔ میں بہت ممنون ہوں۔"

"ایک اور بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔" کیپٹن نے کہا۔ "وہ نوجوان بحری جہازوں اور ان کے قواعد وضوابط سے کافی واقف معلوم ہوتا تھا۔"

ایجنٹ نے ساڑھے چار بجے کیپٹن فریم کو فون کیا۔

"میں پریس کے لئے ایک بیان جاری کر رہا ہوں۔" اس نے بتایا "سوچا کہ اس کی کچھ خاص باتیں پہلے تمہیں بتا دوں۔ ہمیں اسٹار لائٹ جہاز کے تاخیر سے روانہ کرنے کی وجہ معلوم ہو گئی ہے۔ جب ہم نے کرانڈل کو تمہارے دفتر میں پیش آنے والا واقعہ بتایا تو اس نے سب کچھ اگل دیا کہنے لگا کہ ان دو احمقوں نے تمام معاملہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ اچھی بات ہے اب بھگتیں گے بھی وہ ہی دونوں۔ میں بھر پایا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میرا اندازہ درست تھا۔" کیپٹن فریم نے کہا۔

"کرانڈل مسروقہ چیزیں خریدنے کا کاروبار کرتا ہے۔" ایجنٹ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اسے پہلے بھی چوری کا مال رکھنے کے سلسلہ میں سزا ہو چکی ہے۔ اور وہ دو آدمی چور اور اٹھائی گیرے ہیں۔ وہ دونوں آپس میں بھائی ہیں ———— پولیس نے انھیں ان کے مکان سے گرفتار کر لیا ہے۔ اور ابھی کچھ دیر پہلے وہ یہاں میرے پاس لائے گئے تھے۔ وہ دونوں وال اسٹریٹ کے ایک بروکر کے پاس کام کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک جس کا نام وائٹی .....

"نام سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ وہی سنہری بالوں والا نوجوان ہوگا جو میرے دفتر میں آیا تھا" کیپٹن فریم نے بات کاٹی۔

"ہاں یہ وہ ہی تھا" ایجنٹ نے جواب دیا۔ "وائٹی جس دفتر میں کام کرتا تھا اور اس کے سیف میں سیکیورٹی بانڈز اور دوسری قیمتی دستاویزات رکھی رہتی تھیں اور وائٹی کو اپنے کام کے سلسلہ میں سیف کھولنے

بند کرنے کا موقع حاصل تھا۔ کرانڈل وائٹی اور اُس کی گرل فرینڈ سے ملا اور جب اسے یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے وائٹی کو پانچ لاکھ کے قابلِ فروخت سیکیورٹی بانڈ چرانے پر اکسایا اور وعدہ کیا کہ اُس کے ایسے لوگوں سے تعلقات ہیں جو ان بانڈوں کو بہت اچھی قیمت پر خرید لیں گے۔ اس سلسلہ میں اُس نے پورٹو ریکو کے ایک خریدار سے بات بھی کر لی۔ طے یہ ہوا کہ وہ خریدار سان جوآن میں جہاز پر بانڈ وصول کرے گا جہاں اسے یہ سہولت حاصل تھی کہ وہ کسٹم حکام کے ذہن میں شک پیدا کئے بغیر بانڈ لے جا سکتا تھا۔ کرانڈل نے اسٹار لائٹ میں ایک سیٹ بک کرالی۔ اس کا ارادہ پناما تک سفر کرنے کا تھا جہاں سے وہ ہوائی جہاز کے ذریعہ سان فرانسسکو پہنچ جاتا۔"

"اور غائب ہو جاتا" کیپٹن نے کہا

"ظاہر ہے" ایجنٹ نے تائید کی "وائٹی نے اسے بانڈ چرا کر دیئے تھے۔ مگر کرانڈل انھیں اُن کا حصہ دینے سے ٹالتا رہا کل جب وائٹی نے اُس کے ہوٹل فون کیا تو کلرک نے اسے بتایا کہ کرانڈل ہوٹل چھوڑ کر چلا گیا ہے اور یہ کہ اس کے سامان پر بحری جہاز سے سفر کرنے کے لیبل لگے ہوئے تھے۔ وقت بہت کم تھا۔ دونوں بھائیوں نے سر جوڑ کر غور کیا اور جو پہلا قابلِ عمل منصوبہ اُن کے دماغ میں آیا اس پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ وائٹی نے اپنے دفتر فون کیا کہ اُس کا بھائی آرٹ بیمار ہے۔ وہ اسے لے کر ڈاکٹر کے پاس جا رہا ہے اس لئے ڈیوٹی پر نہیں آ سکتا۔ پھر وہ دونوں نیلے رنگ کی اسپورٹ کار میں گھاٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ وائٹی کے پاس ایک بغیر لائسنس کا ریوالور بھی تھا وہ بھی اُس نے ساتھ لے لیا۔ اُن کا مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی بہانے سے کرانڈل کو جہاز سے اُترنے کے لئے مجبور کیا جائے وہ گھبراہٹ میں زیادہ سے زیادہ بانڈ اپنے ساتھ لے کر بھاگے گا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ کرانڈل پورے بانڈ جو کہ ایک بریف کیس میں رکھے ہوئے تھے جہاز سے لے کر اُترنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ اُس کے لئے وائٹی نے تمہیں دھمکا کر اسٹار لائٹ کے مسافروں تک یہ خبر پہونچائی کہ ایف بی آئی کے لوگ مسافروں کے سامان کی تلاشی لینے آ رہے ہیں۔ کرانڈل یہ سنتے ہی گھبرا گیا اور بانڈ اپنی پیٹی کے ساتھ باندھ کر جہاز سے اُتر آیا۔ گھاٹ پر آرٹ اس کے اُترنے کا منتظر تھا ان کا پروگرام تھا کہ وہ اُسے ڈرا دھمکا کر اپنی کار میں کہیں لے جائیں گے اور ریوالور کے بل پر اپنا حصّہ دینے پر مجبور کر دیں گے۔ مگر جب آرٹ نے دیکھا کہ کرانڈل کو کسٹم گارڈ نے روک لیا ہے اور وہ اسے دفتر میں لے گیا ہے تو آرٹ نے خوف زدہ ہو کر تمہارے دفتر میں وائٹی کو فون کیا (یہ پہلے ہی ان دونوں میں طے ہو چکا تھا۔) اور وائٹی اُس کا فون ملتے ہی دفتر سے نکل بھاگا۔"

"تو یہ قصّہ تھا" کیپٹن فریم نے سمجھنے کے انداز میں سر ہلایا "مگر ایک بات پر میں ابھی تک حیران ہوں۔ وہ دونوں بھائی کسی بروکر کے پاس کام کرتے تھے تو پھر انھیں جہاز راں کمپنی کے نظم ونسق اور جہاز کے بارے میں معلومات کیسے حاصل ہوئیں۔ انھیں یہ کیسے پتہ چلا کہ کرانڈل اسٹار لائٹ پر موجود ہے؟"

"میں اسی سوال کی توقع کر رہا تھا" ایجنٹ نے ہنستے ہوئے جواب دیا "وائٹی کو یہ معلومات اپنی گرل فرینڈ کے ذریعہ سے حاصل ہوئی تھیں۔ وہ ایک جہاز راں کمپنی میں کام کرتی ہے۔ ظاہر ہے اسے معمولات کا علم ہونا ہی چاہیئے۔ پھر اسے یہ بھی پتہ تھا کہ کرانڈل اور دونوں بھائی مل کر کیا کھیل کھیل رہے ہیں۔ اُس نے کل صبح کسی وقت وائٹی کو فون کیا اور اسے بتایا کہ اُس کے باس کی کمپنی کے جہاز اسٹار لائٹ پر ایک شخص مارٹن کرانڈل کا نام مسافروں کی فہرست میں شامل ہے اور یہ کہ وہ چیک کرے کہیں یہ اس کا دوست کرانڈل ہی تو نہیں ہے۔ یہ فون پا کر ہی وائٹی نے کرانڈل کے ہوٹل فون کیا تھا۔ پھر جب اسے کرانڈل کے جانے کی اطلاع ملی تو وہ تینوں دوپہر کے کھانے پر جمع ہوئے اور تینوں نے مل کر یہ منصوبہ بنایا۔"

"لیکن تم کو یہ کہنا تو نہیں چاہیئے کہ میری سیکریٹری مس بارتھ وائٹی کی گرل فرینڈ ہے" کیپٹن فریم نے چونک کر تیزی سے پوچھا۔

"یقیناً" ایجنٹ نے جواب دیا" اور وہ اس وقت ہماری یہ گفتگو بھی اسی طرح دوسرے فون پر سُن رہی ہے جس طرح اُس نے اس سے قبل تمہاری تمام تحقیقاتی نوعیت کی فون کالیں سنی ہوں گی۔ میں نے دانستہ اُس کا نام ظاہر کرنے میں تاخیر سے کام لیا تا کہ اسے کشمکش میں مبتلا رکھا جا سکے اور اس درمیان میں میرے آدمی اس کی گرفتاری کے لئے تمہارے آفس پہنچ جائیں۔"

کیپٹن فریم نے آہستہ آہستہ کھوئے ہوئے انداز میں ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ بیرونی آفس میں خلافِ معمول گہرا سکوت چھایا ہوا تھا وہ اپنی کرسی سے اٹھا اور دروازے سے جھانک کر دیکھا مس بارتھ بڑی تیزی کے ساتھ راہداری کا دروازہ کھول کر باہر نکل رہی تھی۔

حفیظ اقبال

بیوی

ہو تو کم سے کم اتنی نیک اور شریف تو ہو جتنی نیک اور شریف سلطانہ تھی جب سے عبدل حادثہ کا شکار ہوا تھا ۔۔۔ روزانہ نت نئے گاہک پھانستی محنت کی کمائی کرتی خود بھی کھاتی اور عبدل کو بھی کھلاتی ۔۔۔ عبدل احسان فراموش نہیں تھا۔ اٹھتے بیٹھتے سلطانہ کا شکریہ ادا کرتا رہتا۔ دنیا کی ساری بیویاں سلطانہ جیسی جنتی ہوں تو ہزاروں جھگڑے ختم ہو جائیں۔ طلاق کا تو کوئی بھولے سے بھی نام نہ لے۔

محبت کے ساتھ اس کے گالوں کو تھپتھپاتا ہوا وہ کہتا ۔۔۔

"سونے میں لاد دوں گا تمھیں۔ بس ذرا مجھے ٹھیک ہو جانے دو۔" پھر وہ جاگتے ہیں خواب دیکھنے لگتا۔ "ہمارا اپنا ایک چھوٹا سا گھر ہوگا سلطانہ! اس گھر میں آرام کی ساری چیزیں ہوں گی۔ میں اپنی پھٹ پٹی کے پیچھے تمھیں بٹھا کر سیر کے لئے لے جایا کروں گا۔ لوگ کہیں گے، کیسی اچھی جوڑی ہے تم ماں بن جاؤ گی ۔۔۔ میرے بچے کی ماں۔ لڑکا ہوا تو میں اس کا نام راجہ رکھوں گا اور لڑکی ہوئی تو رانی کہلائے گی۔"

سلطانہ جواب میں مسکرا دیتی۔ "کیسی ہے یہ دنیا کتنے ہی جتن کیوں نہ کرو۔ ہر پھر کے وہیں کے وہیں۔"

"ناامیدی کی باتیں کرنا کفر ہے۔" عبدل کے اندر کا مولوی بیدار ہو جاتا۔ "اچھا آدمی بنتا کچھ بھی مشکل نہیں۔ بس ذرا ڈھیر سارے روپے پاس ہوں۔"

"سوال تو یہی ہے کہ ڈھیر سارے روپے آئیں کہاں سے؟"

وہ دکھ بھری آواز میں کہتی۔

"فضل کی گھڑی آتے دیر نہیں لگتی۔ ایک ہی جیب سے کروڑوں روپے مل سکتے ہیں۔"

"کروڑوں ۔۔۔؟" آنکھوں میں آنسو ہوتے کے باوجود وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔

"ہاں ہاں کروڑوں۔" عبدل اپنی بات پر زور دیتا "تمھاری طرح کافر نہیں ہوں جو ذرا سی بات پر ناامید ہو کر بیٹھ جاؤں"

ناامید تو خیر سلطانہ بھی نہیں تھی۔ لیکن یہ بات اس کی عقل و فہم سے بالا تھی کہ ایک ہی جیب سے کروڑوں روپے کیسے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ جیب نہ ہوئی، بینک ہو گئی۔ لیکن کچھ کہتے ہوئے ڈرتی تھی جب سے عبدل بستر پر پڑا تھا چڑچڑا ہو گیا تھا پل میں رتی پل میں ماشہ۔ پیار بھری باتیں کرتے کرتے گالیاں دینے لگتا۔ گالیاں بک بک کر تھک جاتا تو تکیہ پر منہ رکھ کر سسک سسک کر رونے لگتا ۔۔۔ سلطانہ سب کچھ برداشت کر سکتی تھی۔ لیکن کسی مرد کو روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ عبدل کے رونے پر اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اچھا بھلا شیر گیدڑ بن گیا ہو۔ رلانے والوں کا رونے سے کیا کام؟

بات ٹالنے کے لئے وہ کہتی۔ "تم ٹھیک ہو جاؤ گے تو بس سونے کے جھمکے لے لوں گی تم سے۔"

عبدل کا سارا غصہ کافور ہو جاتا۔ "بس سونے کے جھمکے ارے میں تو تمھیں سب طرح کے زیور سے لاد دوں گا۔ جھومر اور گلوبند اور کڑے اور ست لڑی ہار اور پازیب اور جھانجن اور انگوٹھیاں۔ لیکن ایک شرط ہے میری ......"

"وہ کیا ۔۔۔؟"

"تم کبھی حرام کام نہیں کرو گی!" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہتا۔ "سچے دل سے توبہ کر کے ایک دم شریفوں جیسی زندگی گزارو گی۔ دیکھو نا ایسی گندی زندگی کس کام کی۔ دنیا میں بھی سب نام دھریں اور آخرت میں بھی جہنم کا ایندھن بننا پڑے۔ میرا تو کچھ نہیں، تمھارے ہی فائدے کی بات کرتا ہوں۔"

صبر اور برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے جب وہ بستر سے اٹھ کر ذرا ذرا چلنے کے قابل ہوا تو اسے سلطانہ کی ایک حرکت پر سچ مچ ہی غصہ آ گیا۔ ہوا یہ کہ سلطانہ نے اسے چلتے ہوئے دیکھا تو پہلے تو اس کی نظر اتاری، پھر دوڑی دوڑی گئی اور نکڑ کے مٹھائی والے سے آدھا سیر مٹھائی پر نیاز دلوا لائی۔

" بڑی اللہ آمین کے ساتھ یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے"
اس نے تھوڑی سی مٹھائی عبدل کے منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

کھانے کو تو وہ مٹھائی کھا گیا بلکہ ہاتھ بڑھا کر اس نے برفی کا ایک ٹکڑا ابھی منہ میں ڈال لیا۔ مگر پھر اسے احساس ہوا کہ وہ مٹھائی نہیں زہر کھا رہا ہے ۔" شرم نہیں آتی حرام کھاتے کھلاتے ہوئے" اس نے بگڑ کر سلطانہ سے کہا ۔" حد ہو گئی بے حیائی کی ۔ کیسی گندی کمائی کا مال اور اس پر نام لیا جائے اللہ رسول کا ۔ میں کہتا ہوں آج سے تم گھر کے باہر نہیں جاؤ گی ۔ دونوں پاؤں توڑ دوں گا۔ اگر باہر جانے کا نام بھی لیا ۔ ! "

سلطانہ دھیمے لہجہ میں بولی ۔" تم تو بس یوں ہی بیٹھے بٹھائے تاؤ کھانے لگتے ہو۔ کوئی بات بھی تو ہو۔ "

" ہاں میرا تو دماغ خراب ہو گیا ہے ۔ اڑتی ہوا سے لڑتا ہوں. بیگم صاحب بدمعاشی کرتی پھریں اور میں منہ سے ایک لفظ تک نہ نکالوں اگر مجھے پہلے معلوم ہوتا کہ تمھارے یہ گُن ہیں تو کبھی تم سے شادی نہیں کرتا"

" تمہیں سب کچھ معلوم تھا۔ "

" نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں ہے " عبدل نے ایسی ٹھنڈی سانس بھری کہ چکر آگیا بمشکل سنبھل کر بولا ۔" ہاں مجھے معلوم تھا لیکن یہ سمجھتا تھا کہ کسی شریف کے پلے سے بندھنے کے بعد تم اپنی ساری خراب عادتیں چھوڑ دو گی ۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ شام ہوتے ہی پوڈر، لپ اسٹک لگا کر یار کی تلاش میں نکل جاؤ گی ۔ شوہر بیچارہ مرے یا جیئے تمھیں اپنے حلوے پراٹھے سے کام"

" تمھارے لیئے ہی جاتی ہوں " اس نے بھنا کر کہا ۔" اگر نہ جاؤں تو کتے کی موت مر جاؤ ۔ کوئی دو کوڑی کو بھی تمھیں نہ پوچھے ۔ "

دل تو چاہا کہ اس کتیا کی چوٹی پکڑ کے کھڑے کھڑے نکال دے ۔ پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ بے وقوف ناقص العقل عورت ہے در در کی ٹھوکریں کھاتی پھرے گی ۔ اس کا تو کچھ نہیں جائے گا الٹی اپنی ہی بدنامی ہو گی ۔ سب یہی کہیں گے کہ عبدل کی بیوی ہے ۔ انسان کام کرے تو کم از کم ایسا تو کرے کہ بعد میں کوئی نام نہ دھرنے پائے ۔ یہ کیا بات ہوئی کہ ابھی تو غصہ میں آ کر سلطانہ کو نکال باہر کرے اور بعد میں جب وہ اس کے پاس روتی پیٹتی اور گڑگڑاتی اور ہاتھ جوڑتی ہوئی آئے تو اپنی فطرتی

تیسری
عبدل کی
ریکھا اور

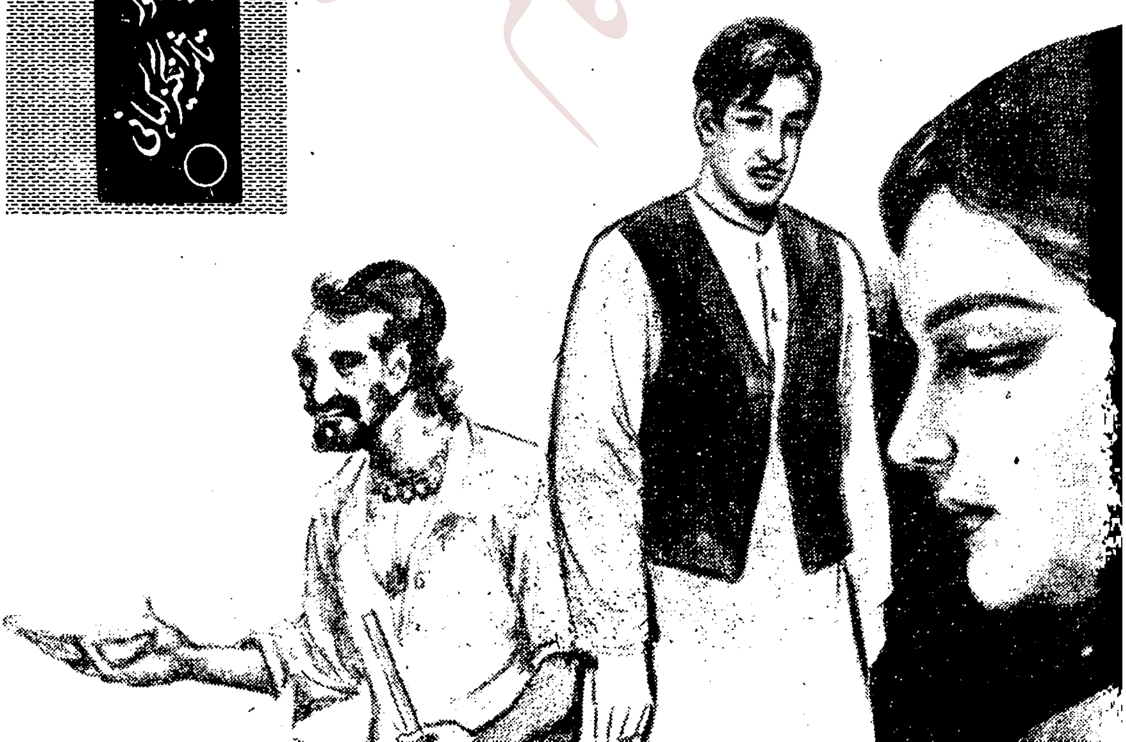

نیک طینتی کے باعث وہ اسے معاف کردے۔

موضوع بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ بولا۔ "میرا خیال ہے اگر میں تھوڑی سی ہمت کروں تو سینما گھر کی کھڑکی تک جا سکتا ہوں۔ ذرا دینا تو ایک بلیڈ۔ آدھا توڑ کے۔"

"بات تو کی نہیں جاتی اور جاؤ گے سینما گھر کی کھڑکی تک۔" سلطانہ نے منہ بنا کے کہا۔ "شاید وہاں تک زندہ سلامت پہنچ جاؤ۔ لیکن لکھ لو میری بات واپس نہیں آ سکتے۔ تمھاری لاش ہی آئے گی وہاں سے۔"

"میں مر جاؤں گا تو تمھیں سکون مل جائے گا۔ تم تو خدا سے چاہتی ہو کہ کل کا مرتا آج مر جاؤں۔ تاکہ خوب اتلے تللے کر سکو۔"

"اگر میں اللے تللے کرنا چاہوں تو کسی کی ہمت نہیں جو مجھے روک سکے۔ وہ تو نہ جانے کیا بات ہے جو میں تمھارے پاس پڑی ہوئی ہوں جاؤں گی تو ڈنکے کی چوٹ جاؤں گی۔ ایک دو نہیں میرے چاہنے والے ہزار ہیں۔ خان بہادر صاحب تو پاندان کی خرچ کے تین سو روپے ماہوار تک پیشکش بھی کر چکے ہیں۔"

"پھر کیا کہا تم نے؟" عبدل نے بڑی رسانیت سے پوچھا۔ وہ سلطانہ کی لمبی چوڑی تقریر سے بے حد متاثر ہو گیا تھا۔

"کہنی کیا۔ صاف بتا دیا کہ خان بہادر صاحب! مجھے ایسی ویسی بازاری عورت نہ سمجھنا۔ ماں اور باپ دونوں کی طرف سے شریف زادی ہوں۔ اب تو عبدل کے ہاں سے میری لاش ہی باہر نکلے گی۔ شریف زادیوں کا ڈولا گھر میں جاتا ہے اور جنازہ باہر نکلتا ہے۔"

عبدل کے منہ میں پانی بھر آیا۔ "تین سو روپے کچھ کم تو نہیں ہوتے۔ اتنی تنخواہ تو ایم اے۔ بی اے کو بھی نہیں ملتی۔ یار سلطانہ۔ تم تو بڑی خوش قسمت ہو۔"

"خوش قسمت ہوتی تو تم جیسے۔ معاف کرنا۔ کمینے سے شادی نہ کرتی۔"

"لو وہ بھی کہہ رہے ہیں یہ بے ننگ و نام ہے۔" عبدل نے ہنس کر جھرجھری لی۔ کوئی اور اتنی کمینگی کے ساتھ اسے کمینہ کہتا تو وہ گدی سے اس کی زبان باہر کھینچ لیتا۔ مگر سلطانہ کی باتوں سے وہ مرعوب ہو گیا تھا۔ سچ تو اسے سات خون تک معاف تھے۔ پھر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ واقعی کمینہ تھا۔ الو کا پٹھا اور گدھے کا بچہ تھا۔ کم ظرف لوگ ہی سچی بات نہیں سن سکتے۔ سوچنے سمجھنے کی بات ہے۔ بے چاری کس محبت اور خلوص کے ساتھ نیاز کی مٹھائی لے کر آئی۔ اور اس نے خواہ مخواہ اسے ہزار باتیں سنا ڈالیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ سلطانہ کی اس محبت پر آگے بڑھ کر اسے اپنے سینے سے چمٹا لیتا۔ دنیا میں کم سے کم ایک ہستی تو ایسی ہے جو اس کی تھوڑی بہت پرواہ کرتی ہے۔

"ذرا ایک بالوشاہی تو دینا۔" اس نے بے نیازی کے ساتھ مٹھائی کے ڈبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور رس ملائی کا لڈو بھی ——!"

"حرام کھاؤ گے تو ہیضہ ہو جائیگا۔" سلطانہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"نیاز کے مال کو کون حرام خور حرام کہہ سکتا ہے۔" اس نے خود ہی مٹھائی کا ڈبہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ پوری بالوشاہی نگل کر بولا۔ "نیاز قبول ہونے کی پہچان یہ ہے کہ جس چیز پر نیاز دلائی جائے وہ مزیدار ہو جائے۔ قسم لے لو جو میں نے اتنی مزیدار مٹھائی پہلے کبھی کھائی ہو۔"

سلطانہ کیسی ہی مردمار ہو لیکن تھی بہرحال عورت۔ عبدل کے منہ سے دو تین چکنی چپڑی باتیں سنیں تو پسیج گئی۔ اور جب عبدل نے دوبارہ بلیڈ کا ٹکڑا مانگا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ "پہلے تمھاری طبیعت ٹھیک ہو جائے۔ جب تک طبیعت ٹھیک نہیں ہو گی۔ میں تمھیں گھر سے باہر نہیں جانے دوں گی۔"

"مگر لوگ کیا کہیں گے۔ کب تک تمھاری کمائی کا بھاڑ کھاتا رہوں گا۔"

"بکنے دو لوگوں کو۔ لوگ تو کسی کو خوش دیکھ ہی نہیں سکتے۔ رہی یہ بات کہ کب تک میری کمائی کھاتے رہو گے تو تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں بہت سے موقعوں پر مردار بھی حلال ہو جاتا ہے۔ نہ میں اپنی مرضی سے کہیں جاتی ہوں اور نہ تم اپنی خوشی سے مجھے بھیجتے ہو۔ یہ تو ہماری تمھاری مجبوریاں ہیں جو ہر پھر کے ہمیں وہیں پہنچا دیتی ہیں جہاں سے ہم نے چلنا شروع کیا تھا۔"

اس نے ایک آہ بھری۔ "سچ کہتی ہو سلطانہ! شریف بننا اتنا آسان نہیں جتنا میں نے سمجھ رکھا تھا۔ لیکن میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جونہی چلنے پھرنے کے قابل ہوا تمھیں کوئی کام نہیں کرنے دوں گا۔ تمھارا پھول سا جسم ایسا نہیں جس پر لوگوں کی گندی نظریں پڑیں۔"

میاں بیوی کی لڑائی ہی کیا۔ تھوڑی دیر پہلے خوب گرما گرمی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے دونوں میں پیار محبت کی ایسی باتیں ہونے لگیں جیسے برسوں کے بچھڑے ہوئے عاشق معشوق اکٹھا ہوئے ہوں۔ ایک

PAKISTANIPOINT

چھوٹا سا پروگرام بھی ترتیب دیا گیا۔ جب عبدل ٹھیک ہو جائیگا اور روزانہ نئی نئی جیبیں کاٹ کر گھر میں روپے پیسے کی ریل پیل کر دے گا تو وہ دونوں اس شہر کراچی کو چھوڑ کر جہاں سینگ سمائیں گے چلے جائیں گے وہاں عبدل پان بیڑی کی ایک دکان کھول لے گا۔ سلطانہ گھر میں رہا کریگی مزے مزے کے سالن پکائے گی اور اگر کبھی سودا سلف لینے کے لئے باہر نکلی تو کالا برقعہ پہنے بغیر ہرگز دہلیز کے باہر قدم نہیں نکالے گی۔ ہاں دوسری شریف زادیوں کی طرح اسے منہ کھولنے کی پوری اجازت ہوگی بشرطیکہ وہ راہ چلتوں سے آنکھ نہ لڑائے۔

"میں کہتی ہوں، منہ کھول لیا تو برقعے کی کیا ضرورت ہے؟"

"تمھارے کہنے نہ کہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہم تو شریفوں والے سارے کام کریں گے"

رات کو جب عبدل کو کھانا کھلا کے اور دوائی پلا کے وہ جانے لگی تو عبدل نے کہا۔

"یار سلطانہ! کسی روز موٹی سی مرغی پھانسو۔ سارے دلدر ایک ہی دفعہ میں دُور ہو جائیں"

"اپنی سی کوشش تو کرتی ہوں۔ کچھ دعا تم بھی کیا کرو"

سلطانہ تو یہ کہہ کر شکار کی تلاش میں نکل گئی لیکن عبدل کو بہت کچھ یاد دلا گئی۔ وہ اب تک بھولا ہوا تھا کہ دعاؤں کے سہارے بڑے بڑے کام نکل سکتے ہیں۔ اٹھا — سامنے والی چوکی پر گیا۔ جا نماز بچھی ہوئی تھی۔ جس پر خوب دھول جم گئی تھی۔ اس نے جا نماز کو خوب اچھی طرح جھاڑا۔ پھر اس پر بیٹھ کر اپنے دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھا دیئے دیر تک ہاتھ پھیلائے بیٹھا رہا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کن الفاظ کے ساتھ دعا مانگے۔ بار بار ہونٹ کپکپا کر رہ جاتے۔ دل دماغ اور زبان ایک دوسرے کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ دل کہتا تھا۔ اتنے بڑے دربار میں ہاتھ پھیلائے ہیں جو کچھ مانگنا چاہو مانگ لو — دماغ کہتا تھا — پاگل مت بنو۔ ساری زندگی گناہوں کی نذر ہو گئی کس منہ سے کچھ مانگو گے بس اپنی کمینگی کا اعتراف کرو۔ گناہوں کی معافی مانگو اور جا نماز سے ہٹ جاؤ۔ زبان بالکل گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ خاصی جد و جہد کے بعد کپکپاتی ہوئی آواز میں اس نے کہا — اے اللہ......! دلوں کا حال جاننے والے اللہ...... میری بیوی بہت کمینی ہے...... کم بخت جسم فروشی کرتی ہے۔ اور دیدہ دلیر ایسی ہے کہ مجھے بھی اپنی حرام کی کمائی کھلاتی ہے...... میں تو چلنے پھرنے کے قابل بھی نہیں۔ مجبور ہوں حرام کھانے کے لئے۔ اگر ٹھیک ٹھاک ہوتا تو کچھ محنت مزدوری سے ایک آدھ جیب کاٹ لیتا۔ سلطانہ کی کمائی ہرگز نہ کھاتا...... سلطانہ میری بدمعاش بیوی کا نام ہے...... ہے تو پکی حرافہ اور بدمعاش... لیکن دل کی بری نہیں ہے...... اگر اسے ڈھیر سارے روپے مل جائیں تو سارے خراب کام چھوڑ دے۔ دن میں روزہ رکھے۔ اور رات بھر نمازیں پڑھے۔ یہ تو سچ ہے جسے حرام کمائی کا چسکہ لگ جائے اس کی عادت مشکل ہی سے چھوٹتی ہے۔ حلال کی چیز میں اسے کوئی سواد نہیں ملتا.... مگر اے اللہ...... ! آزمائش میں کیا حرج ہے...... ایک بار اسے ڈھیر سارا روپیہ دیدے پھر بھی وہ شریف نہ بنے تو اس کی قسمت.... مجھے تو ترس آتا ہے بیچاری پر۔ کیسی اچھی صورت دوزخ میں جلے گی۔ بس ایکبار اسے اتنا بہت سا روپیہ دیدے کہ حجت تمام ہو جائے.... مجھے نماز نہیں آتی لیکن ملا جی سے سیکھ کر پانچوں وقت پابندی کیساتھ نماز پڑھا کروں گا۔ ملا جی سے بھی لمبی داڑھی رکھ لوں گا اور حج کرنے بھی جاؤں گا...... اور اے اللہ تجھے تو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں نے کبھی کوئی گناہ نہیں کیا۔ بس ضرورت کے مطابق تھوڑی سی جیبیں کاٹیں یا کبھی کبھار بائی جی کے کوٹھے پر چلا گیا — یہ کوئی ایسے بڑے گناہ نہیں کہ مجھے دوزخ میں جلنا بھننا پڑے۔ البتہ یہ سلطانہ بڑی گنہگار ہے اس کا رواں رواں گناہ میں مبتلا ہے۔ پر اس کے گناہوں کی سزا مجھے کیوں ملے...... اے اللہ وہ بڑی منحوس اور کمینی ہے۔ اسے کبھی گناہوں کی معافی مانگنے کی توفیق نہیں ہوگی۔ میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔ اس کے گناہوں کو معاف کر دے۔ اس کی طرف سے میں اس کے سارے گناہوں کی معافی مانگتا ہوں...... بس آج کے بعد وہ کبھی جسم فروشی نہ کرے .... اسے آج رات اتنا روپیہ مل جائے کہ باہر جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے —"

عبدل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بہت چاہا کہ کچھ اور دعا مانگے لیکن آواز بھرا گئی — منہ پر ہاتھ پھیرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اچانک خیال آیا کہ اس نے آمین تو کہا ہی نہیں۔ ہاتھ اٹھا کر اس نے جلدی جلدی آمین ثم آمین کا آٹھ دس بار ورد کیا اور اپنی چارپائی پر آ کر لیٹ گیا۔

اسے یقین تھا کہ اس کی دعائیں قبول ہوتی ہیں — آج رات جب سلطانہ اپنی مہم سے واپس آئے گی تو اس کے پاس لاکھ ڈیڑھ لاکھ سے کم نقدی نہیں ہوگی۔ کاروبار شروع کرنے کے لئے اتنا سرمایہ بہت کافی ہے۔ وہ ایک بڑا سا کارخانہ کھول لے گا جس میں دنیا کی ہر چیز تیار ہوا کرے گی۔ اس سلسلہ میں وہ سلطانہ کی بات نہیں مانے گا۔ وہ تو کہے گی کہ جوئے کا اڈہ قائم کر لو۔ رنڈیوں کا چکلہ کھول لو۔ اسمگلنگ کا کام شروع

کر دو۔ کوئی نیک بات تو اس کے دماغ میں آ ہی نہیں سکتی جیسی روح ویسے فرشتے۔ پھر عورت تو بڑی کم ظرف ہوتی ہے۔ اگر کارخانہ قائم کرنے پر راضی ہو بھی گئی تو تمام زندگی طعنے دیتی رہے گی۔ بار بار یہ کہے گی کہ میں اتنے رُپے کما کر لاتی اور نہ تم ایسا شاندار انٹرنیشنل کارخانہ کھولتے۔ یہ بھی نہیں سوچے گی کہ عبدل نے گڑگڑا گڑگڑا کر اللہ سے اس کی کامیابی اور کامرانی کے لئے دعائیں کی ہیں۔ اس کے نخرے سہنے سے تو یہ کہیں اچھا ہے کہ عبدل کی ایک دعا بھی قبول نہ ہو۔ بدبخت سلطانہ کی کم ظرفی کی سزا یہی ہے کہ وہ اسی طرح دربدر کی ٹھوکریں کھاتی پھرے۔

وہ اُٹھ بیٹھا۔ اور ایکبار پھر چوکی پر بچھی ہوئی جا نماز کی طرف بڑھا۔ تاکہ تھوڑی دیر قبل مانگی ہوئی ساری دعائیں واپس لے لے۔ بھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔ سلطانہ سے کسی قسم کی توقع کرنا بالکل فضول اور بے کار ہے۔ عورت کی ذات اور کتے کی دُم کو کتنا ہی سیدھا کرنے کی کوشش کیوں نہ کرو سیدھی ہو ہی نہیں سکتی۔

ابھی اس نے جا نماز پر بیٹھ کر ہاتھ اٹھائے ہی تھے کہ دروازہ کھلا اور سلطانہ اندر داخل ہوئی۔ وہ خلافِ توقع خوش اور مسرور نظر آ رہی تھی۔ معلوم ہوتا ہے دعا قبول ہو ہی گئی۔ جلدی سے وہ چوکی سے نیچے اتر آیا۔ دنیا جہان کی ساری عورتیں خراب ہو سکتی ہیں۔ لیکن نہیں خراب ہو سکتی تو سلطانہ۔ کسی دوسری عورت کو اتنی بڑی رقم حاصل ہوتی تو ایک بار تو اس کے قدم بھی لڑکھڑا جاتے۔ گھر آنے کے بجائے کہیں اور کا رُخ کرتی مگر سلطانہ کی شرافت دیکھو۔ اس کے قدم لڑکھڑائے اور نہ اس نے عبدل کو چھوڑنا گوارا کیا۔ سیدھی اس کے پاس چلی آئی۔

" نماز پڑھ رہے تھے ؟ " اس نے مسکرا کر عبدل سے پوچھا۔

" دعا مانگ رہا تھا۔ " عبدل نے سچ سچ بات اسے بتا دی "کہہ رہا تھا۔ کبھی میری سلطانہ کو کوئی دکھ نہ دیجیو۔ میری خاطر اس نے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ ایسی وفادار شوہر سے محبت کرنے والی جنتی بیبیاں قسمت والوں کو ہی ملتی ہیں۔ "

سلطانہ نے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ کر چارپائی پہ بٹھا دیا۔

"دیکھو تمھیں پھر حرارت ہو گئی۔ آخر تم آرام کیوں نہیں کرتے "

" آرام ہی آرام ہے اب تو اپنے نصیبوں میں " اس نے آنکھیں بند کر کے پُرخیال انداز میں کہا۔ "تمھیں یہ سُن کر خوشی ہوگی سلطانہ کہ تمھاری نیک اور حلال کمائی سے میں بہت جلدی ایک شاندار قسم کا ہوٹل کھولنے والا ہوں۔ پورے سو کمرے ہوں گے اس میں۔ ہر کمرے کا کرایہ دس رُپے روز ہو گا۔ کھانے پینے اور خدمت کا خرچ اس کے علاوہ"

" اچھا اب تم سو جاؤ باتیں صبح کو بنانا۔ "

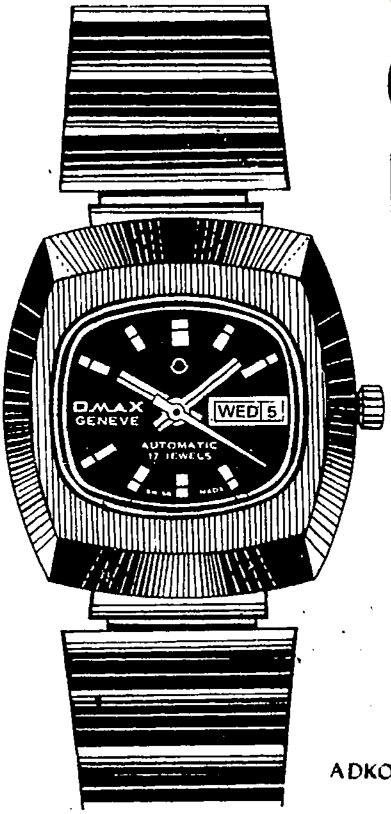

چوبیس گھنٹے — آپ کی ساتھی

OMAX

QUALITY SWISS WATCHES

اومیکس

ہر گھڑی سوئٹزرلینڈ کے ماہرین کا بہترین شہ پارہ

نئے ماڈل، جدید ترین ڈیزائن، مناسب قیمتیں، ہر جگہ دستیاب

ADKO

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔" آ گئیں نا اپنی اصلیت پر۔ مجھے بیوقوف بنانا آسان نہیں۔ چاہتی ہو کہ میں سوجاؤں تو تم ساری رقم لے کر غائب ہو جاؤ۔۔ میرا ہوٹل کا سارا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ جائے اور تم چپکے سے قحبہ خانہ کھول لو۔"

" کیا بک رہے ہو؟"

" بک نہیں رہا۔ فرما رہا ہوں" وہ زور سے ہنسا۔"سیدھے ہاتھ سے ساری رقم ڈھیلی کر دو۔ ورنہ تمہارا خون ہو جائے گا میرے ہاتھوں سے۔۔ بعد میں روتی پھرو گی۔"

وہ بھی ہنس پڑی۔" کون سی رقم۔۔؟ بھنگ تو نہیں پی آئے۔ آج تو مجھے ایک ٹیڈی پیسہ بھی نہیں ملا۔"

" پھر...... کیا کرتی رہیں اب تک۔۔" وہ ہکلانے لگا

" کرتی کیا۔ پہرے کا سپاہی آوارگی کے جرم میں اپنے ہاں پکڑ کر لے گیا تھا۔ میں نے پیسے مانگے تو کہنے لگا۔ تھانے میں بند کر دوں گا اخباروں میں فوٹو چھپ جائیں گے۔"

عبدل کا دماغ چکرانے لگا۔۔"لیکن تم تو ایسی خوش خوش آئی تھیں جیسے تمھیں قارون کا خزانہ مل گیا ہو۔"

" خوشی کی تو بات ہی ہے۔" سلطانہ نے اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے بڑے بڑے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہا۔" اب میں بغیر کسی ڈر اور خوف کے اپنا کام جاری رکھ سکوں گی۔ بس جمعہ کے جمعہ سپاہی کے ہاں جانا پڑے گا۔"

عبدل اس سے زیادہ کچھ نہیں سن سکا یا تو اسے فوراً ہی نیند آ گئی یا وہ اس صدمہ کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گیا۔ صبح کو سو کر اٹھا تو اس نے سلطانہ کو ہوٹل کہہ کر مخاطب کیا اور بتایا کہ وہ بہت جلدی ایک سلطانہ کھولنے والا ہے جس میں ہزار کمرے ہوں گے۔ اور ہر کمرے کا کرایہ دس ہزار روپیہ یومیہ ہوگا۔ لیکن دوپہر سے پہلے پہلے اس کی طبیعت ٹھیک ہو گئی۔

" کچھ کھانے کے لئے ہے۔ ؟" اس نے سلطانہ سے کہا۔

" بڑی بھوک معلوم ہو رہی ہے۔"

سلطانہ نے نفی میں سر ہلایا۔

اس نے گھور کر سلطانہ کو دیکھا۔" تم چاہتیں تو کھانے پینے کا انتظام کر سکتی تھیں۔ لیکن کوئی مرے یا جیئے تمھاری بلا سے۔"

" رات سے پہلے کوئی انتظام نہیں ہو سکتا۔"

" کیوں نہیں ہو سکتا۔ سالا ایسا حسن کس کام کا جو وقت ضرورت بھی کام نہ آسکے۔"

سلطانہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بیٹھی ہوئی خلا میں تکتی رہی

" کیا سوچ رہی ہو۔۔؟"

" سوچ رہی ہوں کہاں جاؤں۔ کس کے آگے ہاتھ پھیلاؤں"

" ہاتھ پھیلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کسی کو دیکھ کر مسکرا دو۔ اور کسی کو دیکھ کر اپنی آنکھ دبا دو۔ ایک وقت کی روٹی کا بندوبست تو ہو ہی جائے گا۔ رات سے بھوکا ہوں۔ اگر بھوکا نہ ہوتا تو تمھیں تکلیف نہ دیتا۔"

سلطانہ اٹھی بال درست کئے۔ ہلکی سی لپ اسٹک اپنے ہونٹوں پر لگائی۔ ایک اچٹتی ہوئی نظر عبدل پر ڈالی اور بغیر کچھ کہے سنے ہوئے گھر سے باہر نکل گئی۔

بھوک کے باعث عبدل کو چکر آ رہے تھے۔ پھر بھی وہ سلطانہ کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایسی فرمانبردار اور نیک اور شریف بیوی۔ اکا دکا لوگوں ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ کوئی اور ہوتی تو سینے پر مونگ دلنے کے لئے بیٹھ جاتی۔ کہتی بیاہ کر لائے ہو تو اب میرا خرچہ بھی اٹھاؤ۔ یہ بھی نہیں دیکھتی کہ عبدل کی کیا حالت ہے۔ اسے تو اپنے چک چک لونڈوں سے کام ہوتا۔

سہ پہر ہو گئی۔۔ سلطانہ نہیں آئی۔ معلوم ہوتا ہے کوئی معقول قسم کا گاہک مل گیا۔ آدمی جوان ہو اور خوبصورت ہو اور عورت ہو تو بہت سی مشکلیں خود بخود ختم ہو جاتی ہیں۔ بڑے بڑے مصائب دور ہو جاتے ہیں۔

سہ پہر بھی گزر گئی۔۔ مغرب کی اذان ہونے لگی۔ اب تک تو اسے واپس آ جانا چاہیئے تھا۔ کیا اعتبار ایسی عورتوں کا جس نے دو پیسے دکھائے بس اسی کی ہو گئیں۔ انھیں اس سے کیا مطلب کہ کوئی ان کے لئے تڑپ رہا ہے۔ یہاں بدلہ وفا کا بے وفائی کے سوا کیا ہے دیکھنے میں سلطانہ کیسی سیدھی سادی ہے۔ لیکن حرفوں کی بنی ہوئی ہے یہ بھی نہیں سوچتی کہ عبدل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ کم بخت کہیں سے ایک روٹی اور تھوڑا سا سالن لا دیتی پھر جو چاہتی کرتی۔ عبدل کو کیا پڑی تھی کہ دوسروں کو تبلیغ کرتا پھرے۔ ایک بار نیک بد کے بارے میں بتا دیا مانے تو اس کی مرضی نہ مانے تو اس کی مرضی۔ عشاء کا وقت ہو گیا۔۔ سلطانہ کا اب بھی کوئی پتہ نہیں تھا۔ دماغی چکروں کے باعث اب اس کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ سوچا کب تک دوسروں کے رحم و کرم پر پڑا رہوں گا۔ حرکت میں برکت ہے۔ اللہ نے دو ٹانگیں دی ہیں اور

دو ہاتھ۔ جب ہاتھ پاؤں ہلائے جائیں گے تو روزی بھی ملے گی۔

اس نے اندر جاکر بلیڈ لیا اور باہر دروازے کی دہلیز پر آبیٹھا۔ سامنے میدان میں پنڈال لگا ہوا تھا۔ فرش بچھے ہوئے تھے۔ مائیک پر نعتیں پڑھنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا محلّے کے کسی صاحبِ دل شخص نے محفل میلاد کا انتظام کیا ہے۔

چلنے کی ہمت نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بڑی عقیدت کیساتھ میدان میں پہنچ گیا۔ چلو کھانا نہیں ملا تو کیا ہوا۔ تھوڑی بہت شیرنی تو مل ہی جائے گی۔ شیرینی کے تصور کے ساتھ ہی ساتھ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کس قدر خبیث ہے اس کا نفس بھی۔ اس مبارک محفل میں آکر بھی کھانے پینے ہی کی بات سوچتا ہے۔ دوزخی کہیں کا۔

مائیک پر کسی بزرگ نے اپنے وعظ کے دوران فرمایا۔

"پڑھو عاشقو درود پڑھو"

"درود سے کبھی غافل نہ ہو درود پڑھو"

عبدل نے زور سے کلمہ طیبہ کا ورد کیا۔ اسے یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ محفل میں موجود دوسرے لوگ کچھ اور پڑھ رہے ہیں۔ کیسا زمانہ آگیا ہے۔ اچھے اچھے لوگ دین سے بے بہرہ ہوگئے ہیں۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد اسے احساس ہوا کہ دُرود کسی اور چیز کا نام ہے اور کلمہ طیبہ کچھ اور ہے۔ لوگ دین سے بے بہرہ نہیں ہوئے۔ وہ خود ہی بھٹک گیا ہے۔ پیٹ کے چکّر نے اسے کہیں کا نہیں رکھا۔ پیٹ بڑا بدکار ہے بابا۔ وہ اپنے ناپاک وجود سے اس مقدّس محفل کو گندہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ وہ اپنی تمام خباثت کے ساتھ وہاں سے باہر نکل جائے۔ لوگوں میں جگہ بناتا ہوا وہ پنڈال سے نکل آیا۔ چکّر بدستور آرہے تھے لیکن اب ان کی تیزی میں کچھ کمی آگئی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کسی جگہ ٹھہر کر تھوڑا سا آرام کرے۔ مگر ڈر بھی معلوم ہو رہا تھا کہ اس پاکیزہ محفل کے لوگ دوبارہ اسے پکڑ کر اسی محفل میں نہ لے جائیں۔ اور شروع سے آخر تک اسے پوری میلاد سننا پڑے۔ میلاد سننے میں تو اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اللہ رسول کی باتیں سبھی کو سننا چاہئیں۔ بس خوف یہ تھا کہ میلاد ختم ہونے تک نانبائی کی دکان بند ہو جائے گی اس بابرکت محفل میں پہنچ کر عبدل اپنا دامن مراد گوہرِ مقصود سے بھر لایا تھا۔ سچ ہے۔ اس محفل میں جانے والا کبھی خالی ہاتھ واپس نہیں لوٹتا۔۔۔ نانبائی کے ہاں پہونچ کر اس نے اپنی برکت والی کمائی پر ایک نظر ڈالی۔ لگ بھگ دو روپے اور چند آنے حاصل ہوئے تھے یہ ساری نشانیاں قیامت کی تھیں۔ لوگ سینما دیکھنے جائیں گے تو دونوں جیبیں روپیوں سے ٹھساٹھس بھری ہوئی ہوں گی لیکن مقدّس محفل میں آئیں گے تو بالکل خالی جیب۔ کوئی ان سے پوچھے یہاں پرتھیں کیا خطرہ ہے؟ بھائی اگر دس بیس روپئے تمھاری جیب سے نکل بھی گئے تو یہاں کی برکت سے اس کا دس گنا وصول ہو جائیگا۔ یہاں کس بات کی فکر۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ سوچ بچار میں ضائع کیا جاتا۔ ویسے اس کا جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ دوبارہ اس محفل میں پہونچ جائے اسٹیج پر بیٹھے ہوئے مولوی صاحب کو ہٹا کر خود ایک لمبا چوڑا وعظ دے اور سامعین کو تلقین کرے کہ آئندہ جب کبھی وہ ایسے نیک کام میں شرکت کریں تو کبھی خالی جیب نہ آئیں بلکہ ہوسکے تو بیوی کے زیورات بھی جیب میں ڈالتے لائیں۔

نانبائی سے اس نے روٹی لی۔ روٹی ہی پر سالن رکھوایا اور ساری چیزوں کو اخبار میں بندھوا کر پُروقار انداز میں باہر نکلا۔

سونے کے سستے زیورات

اس دور میں جبکہ اصلی سونا بہت مہنگا ہوگیا ہے کمپنی نے اصلی سونے کے مطابق ایمی ٹیشن گولڈ کے کم خرچ زیورات تیار کرائے ہیں جو چمک دمک اور خوبصورتی میں اصلی سونے جیسے معلوم ہوتے ہیں۔ استعمال کے باوجود بھی رنگ روپ میں فرق نہیں آتا، بیاہ شادی اور تقریبات میں استعمال ہوتے ہیں، مخمل کے خوبصورت ڈبوں میں دستیاب ہیں آرڈر دیکر منگالیجیے

چوڑیاں رولڈ گولڈ ڈائمنڈ کٹ ایک درجن	۱۲/۰۰	گلے کا نیکلس ڈائمنڈ کٹ جڑاؤ	۱۵/۰۰
کانوں کے جھمکے جڑاؤ	۱۰/۰۰	گھڑی چوڑی جڑاؤ	۱۲/۰۰
مردانہ انگوٹھی جڑاؤ بڑا نگ	۶/۰۰	زنانہ انگوٹھی جڑاؤ نگوں والی	۶/۰۰
ٹیکا جڑاؤ ڈائمنڈ کٹ	۱۰/۰۰	جھومر جڑاؤ ڈائمنڈ کٹ	۳۰/۰۰
گلوبند جڑاؤ ڈائمنڈ کٹ	۳۰/۰۰	جگنی رلاکٹ، جڑاؤ ڈائمنڈ کٹ	۱۲/۰۰

محصول ڈاک دو روپے علاوہ

کوئی دو یا دو سے زائد زیورات ایک ساتھ منگانے پر محصول ڈاک معاف

لندن رولڈ گولڈ سینٹر ۲۵۸ اسٹیشن روڈ معرفت پوسٹ بکس حیدرآباد

آج اس نے پورے دو روپے خرچ کر کے حاتم کی قبر پر لات مار دی تھی ۔ اور لطف یہ کہ ابھی اس کی جیب میں کچھ پیسے باقی بھی تھے ۔ دکان کے پاس ہی ایک فقیر اپنا المونیم کا پیالہ پھیلائے ہوئے اللہ کے نام پر بارہ پیسے کا سوال کر رہا تھا ۔ قدم اٹھانا دوبھر ہو رہے تھے ۔ پھر بھی وہ اس کے پاس گیا ۔

" نوکری کرو گے ۔ ؟ " اس نے فقیر سے پوچھا ۔

فقیر نے جواب میں کہا " اللہ کے نام پر ایک روٹی دلوا دو ۔ یا بارہ پیسے دیدو ۔ "

" شرم نہیں آتی بھیک مانگتے ہوئے ۔ " اس نے روٹی کے بنڈل کو اپنے سینے سے لگا کر کہا " اچھے خاصے تگڑے آدمی ہو محنت مزدوری کرو تو اچھی روزی کما سکتے ہو ۔ لیکن تمہارے منہ کو تو حرام لگ گیا ہے ۔ مفت کی روٹی مل جائے یا کوئی بارہ پیسے دیدے ۔ میں کہتا ہوں اللہ نے تمہیں یہ ہاتھ پاؤں کس لئے دیئے ہیں ۔ "

" جاؤ بابا اپنی راہ لو ۔ فقیر کا دل کیوں دکھلاتے ہو ۔ "

فقیر کی درد بھری آواز پر وہ لرز گیا ۔ بے چارہ دکھے ہوئے دل والا شخص ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کسی نے اس پر بہت ظلم کئے ہیں ۔ ہو سکتا ہے ۔ اس کی بیوی اسے چھوڑ کر چمپت ہو گئی ہو ۔

" لو بابا ۔ ! " اس نے اپنی جیب کے سارے پیسے اس کے پیالے میں ڈال دیئے ۔ " جا کر کھانا کھا لو ۔ " چلتے چلتے اس نے مناسب سمجھا کہ اسے کچھ نصیحت بھی کر دے ۔ " آئندہ کبھی بھیک مت مانگنا ۔ اگر نوکری کرنا چاہو تو سیدھے میرے گھر چلے آنا ۔ الٹے ہاتھ والی گلی میں سرخ اینٹوں والا مکان ہے ۔ مجھے اپنے ہوٹل کے لئے تم جیسے ایماندار بیروں کی ضرورت ہے ۔ اگر پڑھے لکھے ہوئے تو منیجر تک بنا سکتا ہوں ۔ "

فقیر کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ آگے بڑھ گیا ۔ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا ۔ اب یہ فقیر کا کام ہے کہ وہ اس کی پیشکش قبول کرے اور آرام و سکون کی زندگی گزارے یا یونہی لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلا پھیلا کر حرام کی روٹی کھاتا رہے ۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی ٹکر کسی کے جسم سے ہوئی ۔ اس نے روٹی کا بنڈل وہیں زمین پر رکھا اور جھک کر اسے دیکھنے لگا ۔ سلطانہ بالکل بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی ۔ عبدل کے ہاتھ پاؤں پھول گئے جلدی جلدی اس کی نبضیں ٹٹولنے لگا ۔ جب نبضیں نہ ملیں تو اس سے مخاطب ہو کر بولا ۔ " میں تو پہلے ہی کہتا تھا ۔ آوارگی اور بدمعاشی سے باز نہیں آؤ گی تو کتے کی موت مرو گی ۔ دوزخ میں جلائی جاؤ گی ۔ آخر مر گئیں نا ۔ اب مزہ آئیگا ۔ اب معلوم ہوگا بدمعاشی کا کیا پھل ملتا ہے ۔ میری بات مان لیتیں تو آج دوزخ میں جانے کے بجائے سیدھی سیدھی جنت میں چلی جاتیں ۔ اور عورتوں کی ملکہ بن کر عیش کرتیں ۔ لیکن ماننے ہی کیوں لگیں ۔ تمہیں تو روز ایک نئے شخص کی ضرورت تھی ۔ یہ کبھی توفیق نہیں ہوئی کہ میلادیں ہو آتیں ۔ "

سلطانہ کے جسم میں ہلکی سی جنبش ہوئی " پانی ۔ آ "

وہ اچھل پڑا " کم بخت بڑی سخت جان ہے ۔ ابھی تک زندہ ہے ۔ سوچا تھا آج کی لائی ہوئی روٹی دو دن تک چل جائیگی لیکن سلطانہ کی بچی حصہ بٹانے کے لئے چلی آئی ۔ ایسے بڑے پیٹ کی ہے کہ صبح تک ایک نوالہ بھی نہیں چھوڑے گی ۔ "

سلطانہ نے پھر کہا " پانی ۔ ! "

وہ یزید کے خاندان سے نہیں تھا جو سلطانہ کو پانی دینے سے انکار کرتا ۔ چلا نہیں جا رہا تھا ۔ پھر بھی وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے گیا اور ایک کٹورے میں پانی بھر کر لے آیا ۔ " کوئی شکار ملا ۔ ؟ " سلطانہ کے منہ سے پانی کا کٹورہ لگاتے ہوئے اس نے پوچھا

" نہیں ۔ " سلطانہ نے چند گھونٹ پانی پی کر کہا ۔ " کہیں سے روٹی کا ایک ٹکڑا مل جاتا ۔ ؟ "

" ایک ٹکڑے کی بات کرتی ہو ۔ " اس نے ہنستے ہوئے کہا " اتنی روٹیاں لایا ہوں کہ ہم دونوں صبح تک کھاتے رہیں پھر بھی ختم نہ ہوں ۔ "

مگر فوراً ہی اس کی ہنسی نے دم توڑ دیا ۔ روٹی کا جو بنڈل اس نے زمین پر رکھا تھا ۔ وہ وہاں سے غائب ہو چکا تھا ۔ پہلے تو خیال آیا کہ یہ حرکت سلطانہ کی ہے لیکن اسی وقت سامنے گلی میں دو تین کتے لڑتے ہوئے نظر آئے ۔ روٹی کا بنڈل پھٹ چکا تھا اور کتے ایک دوسرے پر جھپٹ جھپٹ کر تیزی کے ساتھ روٹی کا صفایا کر رہے تھے ۔ !

گرتا پڑتا ہوا وہ کتوں تک پہنچا تو ساری روٹی ختم ہو چکی تھی ۔ وہ چکرا کر وہیں بیٹھ گیا ۔ زمین پر دور تک سالن بکھرا ہوا تھا ۔ وہ حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگا ۔ اچانک اس کی حالت غیر ہو گئی ۔ زمین پر لمبا لمبا لیٹ کر وہ اپنی زبان سے سالن کو چاٹنے لگا ۔ پھر اس نے منہ اٹھا کر سلطانہ کو آواز دی ۔

" تم بھی یہیں آجاؤ ۔ یہاں سالن بکھرا پڑا ہے ۔ " اور دوبارہ زمین چاٹنے میں مصروف ہو گیا ۔

ناگ بھون

ناگ بھون محض میری اس لرزہ خیز داستان کا عنوان ہی نہیں ہماری دنیا کی پُرہول حقیقتوں کا ایک ایسا ثبوت ہے جو میں آخری سانس تک نہ بھول سکوں گا۔ یہ کہانی تاریکیوں اور دُھندلائی ہوئی روشنیوں میں ڈوبی ان خوف آور زمینوں کے گرد گھومتی ہے' جہاں ہر لمحہ اجل کے بے رحم ہاتھ مجھے اپنے چنگل میں دبوچ لینے کے لئے بے تاب رہے اور میں جنّت سے دھتکاری ہوئی حقیر شیطانی مخلوق کے اشاروں کا غلام ہو کر رہ گیا۔ وہ مخلوق پُراسرار اور نادیدہ قوتوں پر حاوی تھی۔ اُن کی آگ اُگلتی اور شعلے برساتی گول گول آنکھیں جسم سے حرکت اور ذہن سے فکر سلب کر لیتی تھیں۔ غم و اندوہ' رُوحانی کرب' جسمانی عذاب' ذہنی بے چارگی' وقتی آسودگیوں' ہولناک حقیقتوں اور زندگی کی حرارت آگیں لذتوں کے عبرتناک امتزاج میں ڈوبی میری یہ چند برسوں پر محیط کہانی اب مجھے صدیوں طویل ایک ڈراؤنا خواب معلوم ہوتی ہے۔ محض ایک خواب جسے نیکی اور بدی' مسرت اور اذیت پر قادر قوتوں نے مل کر ترتیب دیا اور پھر اُس میں حقیقت کے رنگ بھرنے کے لئے قسمت کے بے رحم ہاتھوں نے مجھے مرکزی کردار کی صورت میں اس میں دھکیل دیا۔

انیسویں قسط

سابقہ قسطوں کے خلاصے کے ساتھ

سُلطان مُحمّد خان

میں کمسنی کے ایک بڑھئی گھرانے کا چشم وچراغ تھا مفلسی کے باعث کمسنی ہی میں میرے والد نے مجھے کام پر لگا دیا لیکن سات برس کی عمر میں ایک لاولد گورے نے معقول رقم کے عوض مجھے میرے والدین سے گود لے لیا اور میری تعلیم وتربیت پر پوری توجہ صرف کرنے لگا۔

یونیورسٹی کی آزاد فضاؤں میں ایک تیکھے اندام اور خوبرو مشرقی دوشیزہ، ستارہ سے میری محبت پروان چڑھی تعلیم کے خاتمے پر ہم دونوں ازدواجی بندھن میں بندھ گئے اور شملہ کے ایک پُرسکون گوشے میں آ بسے جہاں میں حشرات الارض پر اپنے تجربات جاری رکھنا چاہتا تھا میرا منہ بولا باپ اپنے وطن لوٹتے ہوئے میرے لئے اتنی خطیر رقم چھوڑ گیا تھا جو مجھے ساری عمر کے لئے کافی تھی۔

سانپوں پر تجربات کے دوران میں ایک موذی اور کینہ پرور سیاہ ناگ نے ستارہ کو ڈس لیا۔ یہ المناک حادثہ میرے ذہن اور اعصاب پر بجلی بن کر گرا اور میں نے عہد کر لیا کہ سانپوں اور ناگوں کی پوری نسل سے اپنی ستارہ کی موت کا ہولناک انتقام لوں گا۔ پھر میں نے ستارہ کو اپنے بنگلے کے لان ہی میں دفن کر دیا۔ جب میں نے اپنے عہد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انتقام کا پہلا وحشیانہ جشن منعقد کیا تو کہیں سے ایک پُرجلال، سفید ناگن نمودار ہوئی اور اپنے ہم نسلوں کو میرے پنجۂ انتقام سے صاف بچالے گئی۔ میں دل کا بوجھ ہلکا کرنے ستارہ کی قبر پر پہنچا تو قبر کھدی پڑی تھی اور ستارہ کی لاش کا کہیں پتہ نہیں تھا!

میری خلش اور نیم دیوانگی کے ان دنوں میں ستارہ کی ایک ہمشکل، اندراوتی میری خلوتوں میں در آئی۔ میں اپنا غم بھلانے کے لئے اُس کے حسین نسوانی پیکر سے زندگی کی رعنائیاں سمیٹنے لگا۔

ایک دن حیدر شاہ نامی ایک درویش صفت بزرگ نے اپنی روحانی قوت سے اندراوتی کی اصلیت کا بھرم کھول دیا۔ وہ دراصل وہی پُراسرار، سفید ناگن تھی جس نے میرے انتقام سے اپنے ہم نسلوں کو بچایا تھا۔ وہ ناگوں کی پُراسرار سرزمین کی عیاش فطرت ناگ رانی تھی اور انسانی روپ بدل لینے پر پوری طرح قادر تھی۔ وہ مجھ کو پسند کر چکی تھی اور محض رقابت کی خاطر ستارہ کو قبر سے نکال لے گئی تھی جو درحقیقت مری نہیں تھی بلکہ زہر کے اثر سے طویل سکتے کا شکار ہو گئی تھی۔ حیدر شاہ نے ناگ رانی سے چھینا ہوا منکا میرے حوالے کر دیا اور ستارہ کی بازیابی کے لئے طویل ہدایات دیکر اپنی کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئے

ستارہ کی زندگی کی نوید پاکر مجھ میں نیا عزم پیدا ہوگیا اور میں نے ہر قیمت پر اُسے ناگ بھون کی ہولناک سرزمین سے نکالنے کا عہد کرلیا۔

اِس کے بعد ناگ رانی نے کئی بار مختلف عورتوں کے رُوپ میں میرے قریب آنا چاہا لیکن میں ان دنوں ستارہ کے فراق میں کرب و اذیت کے جہنم میں سُلگ رہا تھا میں اُس کے حسین جال میں نہ آسکا جن دنوں مجھ پر مایوسی کا حملہ ہوا، وہ ایک الھڑ بنجارن، چمپا کے رُوپ میں میری خوابگاہ تک آ پہونچی۔ میں اُس کی اصلیت سے بے خبر کافی عرصے تک اُس کی دلربایانہ اداؤں کا شکار رہا۔

اِسی دوران میں چمپا کی آبرو پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش میں میرا ایک لاوارث مُلازم ہری چند میرے ہاتھوں مارا گیا۔ ایک رِندانہ طور پر میں نے چمپا کو ناگ رانی کے اصلی رُوپ میں دیکھ لیا۔ میں نے اُس پر اس امر کا انکشاف نہیں کیا لیکن وہ اپنا چھِنا ہوا منکا واپس لینے کے لئے اس قدر مضطرب تھی کہ میرے مقابلے پر آگئی۔ میں نے اپنی تمام صلاحیتوں اور درویش صفت جیوتشی کے بتائے ہوئے طریقوں پر عمل کر کے ناگ رانی کو ہمیشہ کے لئے تسخیر کرلیا۔ اب وہ میری مرضی کی غلام ہوچکی تھی۔

پھر مجھ پر ہری چند کے قتل کے الزام میں شبہ کیا گیا۔ پولیس کی جماعت تفتیش کے لئے آئی اور میرے اشارے پر ناگ رانی نے انھیں اس قدر ہراساں کیا کہ وہ بھاگ نکلے۔ اسی تفتیش کی پشت پر ناگ رانی کی چھوٹی بہن سامنے آئی جو کوشیلا دیوی کا انسانی رُوپ دھارے شملہ کے اعلیٰ حلقوں میں معزز درجے پر فائز تھی۔ میری خاطر ان دونوں بہنوں میں رقابت کی آگ بھڑک اٹھی اور ناگ رانی اپنی بہن کو زندہ نگل گئی۔

ناگ رانی نے اب کوشیلا کا رُوپ دھار لیا اور میں شب و روز اُس کے ہمراہ دادِ عیش دیتا رہا۔ ایک روز میں نے دو ٹوک الفاظ میں اس سے ناگ بھون سے ستارہ کو چھڑا لانے کی خواہش کا ذکر کیا۔ یہ سُن کر وہ کانپ اٹھی۔ ستارہ کو ناگ بھون پہونچانے کے بعد وہ اس معاملے میں بے بس ہو کر رہ گئی تھی۔ ستارہ اب ناگ راجہ کی قیدی تھی اور وہ اس معصوم دوشیزہ کی عصمت دری کے درپے تھا ناگ رانی نے بتایا کہ ناگ بھون بہت ہی خوفناک اور ڈراؤنی سرزمین ہے جہاں کی ہر شے پر ایک پُرانے شیش ناگ کی حکمرانی ہے جو ناگ راجہ کہلاتا ہے۔ اس پُرہیبت اور کینہ پرور ہستی سے جیتنا کسی کے بس کی بات نہیں۔

اسی گفتگو کے دوران ناگ راجہ کا ایک معتمد گرگا شیو ناگ ہم دونوں کو پکڑ کر ناگ بھون لے جانے کے لئے آپہنچا۔ وہ بہت ہی ڈراؤنا انسان تھا۔ اس کے چہرے کی کھال جا بجا جھُولی ہوئی تھی۔ مقناطیسی آنکھوں میں موت کی بے رونق زندگی چھائی ہوئی تھی جسے دیکھ کر ہڈیوں تک میں سنسناہٹ ہونے لگتی تھی۔ اس کے بالوں کی جگہ بے شمار باریک اور سیاہ ناگ اُگے ہوئے تھے جو پوری طرح زندہ تھے۔ ایک مقابلے میں اُس کی آنکھیں گل کر پانی کی طرح بہہ گئیں اور وہ فرار ہوگیا۔

میں وقتی تحفظ کے پیشِ نظر شملہ سے روانہ ہوگیا۔ ناگ رانی کی ایک سہیلی چترا ہر دم میرے ساتھ تھی۔ شیو ناگ نے چترا کو آلۂ کار بنا کر مجھے سون ہاٹ کے مشرق میں۔ ایک بھیانک اور خوف آور مقام کے سفر کی ترغیب دلائی اور میں اس اُجاڑ ویرانے میں ایک بار پھر شیو ناگ کے بے رحم چنگل میں پھنس گیا۔ پھر ناگ رانی میری مدد کو آئی ایک طویل اور سنسنی خیز مقابلے کے بعد شیو ناگ منھ کی کھا کر سون ندی میں جا گھسا جہاں سے ایک راستہ ناگ بھون کو جاتا تھا۔ اس کشمکش میں چترا ماری گئی اور ناگ رانی نے اس کے بعد ایک نئی خوبصورت داسی جے سیکا میرے حوالے کردی۔

شیو ناگ کی شکستوں پر چراغپا ہو کر آخرکار ناگ راجہ خود ہماری سرکوبی کے لئے آپہونچا اور ناگ رانی اس سے پناہ حاصل کرنے کے لئے مجھے اور جے سیکا کو ہمراہ لے کر کانی بھومی نامی سمندری جزیرے سے جل منڈل نامی عجیب و غریب زیرِ سمندر دُنیا میں جا چھپی۔ جل منڈل سمندر میں ڈیڑھ ہزار فیدم نیچے ایک عجیب و غریب گپھا میں واقع تھا۔ جل ناگوں کی اس خوف آور سرزمین پر جل کماری کی حکمرانی تھی جو ہمیشہ ایک خوبرو عورت کے رُوپ میں میرے سامنے آئی۔

جل منڈل میں کبھی مجھ پر جل کماری کی عنایات رہیں اور کبھی میں شدید اذیتوں کا نشانہ بنایا گیا۔ جب جل کماری نے یہ دیکھا کہ میں کسی طرح ناگ رانی کے مقابلے میں اُس کی جانب مائل نہیں ہوتا تو اُس نے ایک سازش کے ذریعے ناگ رانی کو جل منڈل سے نکل جانے پر مجبور کردیا اور مجھے اگن پُوجا کے جشن پر ناگ کی بھینٹ چڑھانے کی قسم کھائی۔ جل منڈل میں یہ لرزہ خیز جشن ہر ہزار برس بعد ہوتا تھا۔

تہوار کے موقع پر اگن دیوتا آگ کے بھیانک شعلوں میں رینگتا اگن ناگ کے پُرشکوہ رُوپ میں نمودار ہوا اور میرے بدن کو سونگھ کر چلا گیا۔ ناگ رانی نے اروشی دیوی کے ذریعے میری جان بخشی کرادی تھی۔ رسم کے اختتام پر جل کماری نے شکست خوردہ لہجے میں مجھے بتایا کہ اب مجھے ایک برس کے اندر اندر مونگ کی دال سے اگن ناگ کا پُتلا بنا کر اُسے کسی کنواری کے زندہ خون سے غسل دینا پڑے گا ورنہ سوتیوں کے رُوپ میں میرے بدن میں گھسے ہوئے موذی سانپ مجھے تڑپا تڑپا کر ہلاک کردیں گے۔ ادھر جے سیکا نے میری بھینٹ کے صدمے سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کی ناکام کوشش کر ڈالی اور یوں اس کا یہ راز افشا ہوگیا۔ وہ ناگن نہیں بلکہ انسانوں کی نسل میں سے تھی اور ایک سپیرن کی اولاد تھی جسے ناگ رانی نے خوش ہو کر بہت سی پُراسرار قوتیں دے دی تھیں۔

جے سیکا کا راز افشا ہونے کے باعث میں ایک بار پھر جل کماری کے عتاب کا نشانہ بن گیا۔ جے سیکا کو بھی ایسی ایسی سزائیں سہنی پڑیں جن کا تصوّر تک محال تھا۔ اس دوران میں کئی بار میرے پیٹ میں گھسے ہوئے سانپوں نے بھی مجھے شدید اذیت میں مبتلا کیا۔ ایک موقع پر میری بے احتیاطی سے منکا جے سیکا کے پیٹ میں چلا گیا۔ یہ میری بدنصیبی کی ایک نئی ابتدا تھی۔ میں نے بہت مکاری سے کام لیتے ہوئے جل کماری کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ جے سیکا کو کالی بھومی پر ناگ رانی کے قریب پہنچا دے۔ اُس نے ایک منصوبے کے تحت اقرار کرلیا۔ جے سیکا کے چلے جانے کے بعد اُس نے اپنی حسین خوابگاہ میں مجھے شراب پلا کر مدہوش کیا پھر مجھ سے ناگ رانی کا منکا طلب کیا۔ میں نشے اور شہوانی جذبات کی رو میں اندھا ہو رہا تھا۔ میں نے اُسے منکے کے چلے جانے کی کہانی سُنادی۔ وہ ناگ رانی پر غالب آنے کا منصوبہ یوں تباہ ہوتے دیکھ کر غصّے میں اندھی ہوگئی۔ اُس کے ایک اشارے پر میرے اردگرد ہیبت ناک تاریکی پھیل گئی اور جل ناگوں کے ایک مشتعل انبوہ نے مجھ پر حملہ کردیا میرا نشہ ایک دم ہرن ہوگیا اور موت کی بھیانک تصویر آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی۔

جل کماری نے نہایت کامیابی کے ساتھ مجھے اپنا راز افشا کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ میری ساری مزاحمت بالکل بے سود ثابت ہوئی اور جل کماری نے نہایت اطمینان سے مجھے مغلوب کرلیا کیونکہ منکے کے بغیر میں اپنی ہر قوت سے محروم ہوچکا تھا پھر میرے اوپر ناقابلِ بیان اذیتوں کا دور شروع ہوا جس میں میری بائیں آنکھ جاتی رہی ان کٹھن لمحوں میں، جے سیکا سے اطلاع پاکر ناگ رانی جل منڈل میں آپہونچی، قہر و غضب اور انتقام کا ایک مہیب ٹکراؤ ہوا۔ جل منڈل کی سرزمین پر ناگ رانی اور جل ناگوں کی ایک خوفناک جنگ چھڑ گئی۔ ناگ رانی نے ان پر خرگوشوں جیسی صورت والے کالے کالے چوپایوں کو چھوڑ دیا تھا۔ اس خونریز حیوانی معرکے کی افراتفری سے فائدہ اُٹھا کر ناگ رانی مجھے ہمراہ لے کر جل منڈل سے نکل گئی۔ سمندری گپھا میں کودنے سے قبل ناگ رانی نے اپنا منکا میرے حوالے کردیا — جو اُس نے شاید کسی طرح جے سیکا کے پیٹ سے برآمد کرلیا تھا۔ زیرِ آب سفر

کے دوران میں کئی کٹھن مرحلوں سے گزرنے کے بعد ہم آخر کار کالی بھومی پر جا پہنچے جہاں ناگ رانی جے سیکا کو چھوڑ گئی تھی۔ اپنی آزادی کا جشن میں نے بڑی فراخدلی سے منایا اس پُر مسرت جذبے پر جب میں ناگ رانی کے نسوانی ہیکر میں ڈوبا ہوا تھا تو مکروہ صورت شیو ناگ وہاں آ پہنچا۔ میں نے جونہی اُس کے مقابلے پر آنا چاہا میرے پیٹ میں گھسے ہوئے ان سانپوں نے حرکت کرنی شروع کر دی جو اگن ناگ کی بھینٹ سے نجات کی نشانی تھے۔ میں ایک آنکھ سے محروم، کرب سے زمین پر تڑپ رہا تھا اور مکار شیو ناگ قہقہے مارتا میری طرف بڑھ رہا تھا۔

سخت مقابلے کے بعد شیو ناگ مغلوب ہو گیا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اُس کے سر پر اُگے ہوئے سارے سانپ جڑ سے کاٹ دیئے۔ یوں سانپ دوبارہ پیدا ہونے تک اُس کی تمام شکتیاں ختم ہو گئیں۔ اس موقع پر ناگ رانی نے احمقانہ فراخدلی سے کام لیتے ہوئے اُسے ایک کالے کتے کے روپ میں کچھ عرصہ زندہ رکھنے کا فیصلہ کیا اور وہ کالی بھومی سے سون ہاٹ جاتے ہوئے، موقع پا کر سون مندر میں جا گھسا جہاں ناگ رانی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ اس چوٹ کے بعد ناگ رانی نے ایک سادہ لوح دہقانی کو اپنے دام میں پھانس کر اُس کی بائیں آنکھ کی روشنی سے میری پھوٹی ہوئی آنکھ کی بینائی بحال کر دی۔ اب میری دونوں آنکھیں اس دہقانی کی زندگی میں روشن رہتیں لیکن اُس کے مرتے ہی میری بائیں آنکھ دوبارہ ناکارہ ہو جاتی۔ اِس دوران میرے بدن میں گھسے ہوئے سانپوں نے بار بار مجھے جاں کنی کے عالم سے دوچار کیا تھا اس لئے ناگ رانی نے مشورہ دیا کہ سب سے پہلے ناگ دیوتا کو کسی کنواری کے خون کی بھینٹ دے کر اس مستقل روگ سے نجات حاصل کی جائے۔ پھر میں ناگ رانی اور جے سیکا کے ہمراہ ایک ویران اور پُراسرار انا نتھ آشرم میں پہنچا جہاں ایک مدقوق اور برہنہ تن بوڑھا سانپوں کے ہجوم میں گھرا موجود تھا۔ اِس مہا پجاری نے جے سیکا کو اُس کی کھوئی ہوئی شکتیاں واپس دلانے کے لئے برفانی پہاڑوں سے اُبلنے والے ایک گرم چشمے پر شکتی کے اشنان کے لئے بھیجا جس سے وہ کامران لوٹی۔

مہا پجاری شنکر ناتھ غیر معمولی قوتوں کا مالک تھا، اُس کی ہدایت پر یوہاری کی ایک کنواری دوشیزہ کی بھینٹ دینے کی تیاریاں کی گئیں لیکن عین وقت پر حیدر شاہ آڑے آ گئے۔ شنکر ناتھ فرار ہو گیا اور حیدر شاہ نے کافی لعن طعن کے بعد مجھے ایک جگہ چھوڑ دیا۔ پھر مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میری پرچھائیں غائب ہو چکی ہے، روشنی میں مجھ پر شدید کرب کا عالم طاری ہو گیا اور ناگ رانی مجھے پجاریوں کے ایک ڈیرے پر لے گئی، وہاں شنکر ناتھ نے مجھے بھیلو کے ہاتھوں مروانے کی ناکام کوشش کی اور ایک کڑے مقابلے کے بعد میری پرچھائیں ہی میرے وجود پر مسلط کر دی، مزید یہ کہ شنکر ناتھ نے میری بائیں آنکھ کی بینائی ایک کمینی حرکت سے دوبارہ زائل کر دی، پرچھائیں کی اذیت کے باعث میرا روشنی میں رہنا دوبھر ہو رہا تھا جس کے باعث ناگ رانی مجھے ایک تیرہ و تار پہاڑی غار میں لے گئی جس میں سے نکلنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی، تاریک غاروں کی اس بھول بھلیاں میں ناگ رانی ایک لڑکی کو بے رحمی کے ساتھ میرے حوالے کر کے جے سیکا سمیت لوٹ گئی، اُس لڑکی نے بے حجابی کے ساتھ مجھے اپنے بارے میں ایک عجیب و غریب کہانی سنائی اور پھر اُس پر اچانک غیر فطری ہذیانی ہنسی کا طویل دورہ پڑ گیا۔

وہ کافی دیر تک یونہی ہذیانی انداز میں ہنستی رہی اور میں خوفزدہ انداز میں غار کی دیوار سے چپکا بیٹھا رہا۔ آہستہ آہستہ اُس کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے خاموش ہو گئی پھر مہا پجاری شنکر ناتھ میرے ہمدرد کے روپ میں اس غار میں آ پہنچا۔ اُس نے ناگ رانی کے خلاف زہر افشانی کر کے اور مجھے ناگ بھون پہنچانے کا وعدہ کر کے مجھ سے منکا لینا چاہا مگر میں اُس پر ٹوٹ پڑا۔ پھر میں نے ناگ رانی کو طلب کیا اور اُس نے شنکر ناتھ کو بے رحمی کے ساتھ جہنم واصل کر دیا۔ اسی کے ساتھ میرا سایہ بھی اس جہنمی بڈھے کی قید سے آزاد ہو گیا۔ ابھی میرے سائے کی مکمل آزادی کے لئے ناگ رانی کا کچھ کام باقی تھا۔

ناگ رانی کی ہدایت پر جے سیکا بیہوش عورت کو اُٹھا لے گئی اور میں ناگ رانی کے ہمراہ باہر نکل آیا۔ اس خوفناک پہاڑی سلسلے میں تیز برفانی ہواؤں کا راج تھا اور آس پاس کی چوٹیوں پر برف بکھری پڑی تھی۔ یہاں میرے ذہن میں ناگ رانی کے خلاف شکوک و شبہات سر اُبھارنے لگے۔ اِدھر وہ مجھے اپنی وفاداری اور محبت کا یقین دلاتی رہی میں نے مشتعل ہو کر اُس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا اور وہ پہاڑ کی خوفناک ڈھلان سے نیچے بے رحم وادی میں لڑھک گئی۔ میں اس رات بڑی بے چینی کے ساتھ برف باری میں گھر ان پہاڑی سلسلوں میں بھٹکتا رہا۔ آخر کار ناگ رانی دوبارہ مجھ سے آ ملی۔ برف باری میں کچھ وقت گزارنے کے بعد وہ مجھے اپنی قوت کے سہارے بلاسپور کی ایک ویران حویلی میں لے گئی۔ وہاں میری بائیں آنکھ کی بینائی ایک نوجوان کی آنکھ کی قربانی دے کر دوبارہ بحال کی گئی پھر دیوتا کے مجسمے کے سامنے اپنا سارا زہر خارج کر کے میرے سائے کی مکمل آزادی کے لئے ایک خاص پوجا کی اور میرا سایہ پوری طرح آزاد ہو گیا۔

اس وقت تک میری بیوی ستارہ ناگ بھون میں میرے لڑکے کو جنم دے چکی تھی اور جل کماری کے گرگے اُسے لینے کے لئے چل پڑے تھے۔ ناگ رانی نے ان پر وار کرنے سے قبل سون مندر کی خیر خبر لینے کے ارادے سے مجھے وہیں چھوڑا اور خود بلاسپور کی اس ویران حویلی سے چلی گئی۔ میں تنہائی میں اپنے ماضی اور مستقبل کے بھیانک اور موہوم تصورات میں کھویا ہوا تھا کہ یکایک جے سیکا کی دہشت زدہ چیخ اور جانے پہچانے بھیانک قہقہے نے مجھے چونکا دیا۔

آنے والا شیو ناگ تھا۔ بلاسپور کی اس ویران حویلی میں اس نے بڑی بے دردی کے ساتھ مجھے زیر کر لیا اور ناگ رانی کا منکا میرے قبضہ سے نکل گیا۔ اذیتناک بے ہوشی کے بعد میں نے خود کو حوالات میں قید پایا۔ شیو ناگ نے ہری چند کے دبے ہوئے قتل کے سلسلے میں مجھے انسپکٹر ہیرس کے حوالے کر دیا تھا۔ ہیرس نے اپنے پرانے زخموں کا انتقام لینے کے لئے مجھ پر کافی تشدد کیا اور میں ایک مسلمان سپاہی کی ہمدردی حاصل کر کے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اسی دوران میں ناگ رانی بھی مجھ سے آ ملی۔ اس کی حالت بہت ابتر تھی سون مندر کے نواح میں شیو ناگ نے اُسے ہوسناک عزائم کا نشانہ بنایا تھا۔ فرار کی راہیں مسدود کرنے کے سلسلے میں ہیرس اور اُس کے ماتحت شیو ناگ اور ناگ رانی کے ہاتھوں مارے گئے اور شیو ناگ نے مجھے ناگ رانی سمیت سون مندر میں قید کر دیا۔ سون مندر میں شیو ناگ نے میرے بدن کو ہاتھ لگائے بغیر میرا سارا خون نچوڑ لیا اور پھر مجھے ایک ویرانے میں پھنکوا دیا۔ اس کے تیوروں سے ظاہر ہو چکا تھا کہ وہ ناگ رانی کو سون مندر میں قید کر کے میری طرح پامال کرے گا۔ منکا گم ہونے کا شاخسانہ نہ صرف میرا بلکہ ناگ رانی کا بھی مقدر بن چکا تھا۔

مایوسی اور بے بسی کے ان لمحات میں جے سیکا اس ویرانے میں آ پہنچی اُس کی زبانی مجھے علم ہوا کہ بلاسپور کی ویران حویلی شیو ناگ نے جلا کر خاکستر کر دی ہے اور اس کے گرگے ملبے کے گرد حصار باندھے منکے کی نگرانی کر رہے ہیں۔ منکا اب ایک بھولا ہوا خواب بنتا نظر آ رہا تھا۔

جے سیکا میری بدحالی کے پیش نظر مجھے اس ویرانے سے سرن گڑھ کے ایک مکان میں لے گئی۔ اس کا سہارا مل جانے پر میرے دل میں ایک بار پھر زندہ رہنے کی اُمنگ جاگ اٹھی تھی۔ اس رات ہم دونوں بستر پر دراز باتیں کر رہے تھے کہ اچانک دروازے پر تیز دستک کی آواز سنائی دی اور ہم چونک پڑے۔

جے سیکا کے ہمراہ میں سرن گڑھ کے ایک مکان میں پہنچا۔ اُس کی ہمدمی میسّر آ جانے پر میرے دل میں ایک مرتبہ پھر زندہ رہنے کی اُمنگ جاگ اٹھی تھی۔ پھر اسی شب حیدر شاہ اس مکان پر آ پہنچے اور مجھے لعن طعن کرنے لگے۔ جے سیکا اُن کے شفقانہ رویہ سے اتنی متاثر ہوئی کہ اُس کے گناہ آنسو بن کر آنکھوں سے بہہ نکلے اور وہ اپنے ضمیر کی خلش کے باعث حیدر شاہ کی محبت آمیز آغوش میں ابدی نیند سو گئی۔ حیدر شاہ نے مجھے فوری طور حضرت صاحب کی درگاہ کی جانب روانہ ہونے کا حکم دیا اور میں سرن گڑھ سے روانہ ہو گیا۔ میری سفید گھوڑی بجلی اور ناہموار زمین پر اپنے سموں کا ساز بجاتی شاکر پور کی طرف اڑی جا رہی تھی کہ راستے میں ایک جوان اور گداز بدن لڑکی مظلومیت کے لبادے میں میرے آڑے آ گئی۔ اُس کی مدد کی کوششوں میں میری گھوڑی ہاتھ سے نکل گئی اور مجھے مجبوراً اس لڑکی کے ہمراہ جنگل

میں رات بسر کرنی پڑی۔ پھر رات کی تنہائی میں جسموں کے فریبِ گناہ کا رُوپ دھار لیا اور میں حیدر شاہ کی ہدایت کو بھول بیٹھا۔ رات بھر کی آوارگی کے بعد میں صبح بیدار ہوا تو وہ پُراسرار لڑکی غائب ہو چکی تھی۔ میں بوجھل قدموں سے پیدل ہی شاکر پور کی طرف چل دیا۔ راستے میں مزار کی وضع کی ایک عمارت دیکھ کر میں اس میں داخل ہوا۔ وہاں ہر طرف سانپ کلبلا رہے تھے۔ تب مجھے دھوکا ہوا کہ وہی حضرت صاحب کی درگاہ ہے۔ پھر میری توقعات کے برعکس شیوناگ فاتحانہ شان سے میرے سامنے آ پہونچا۔ دورانِ سفر لڑکی کے ساتھ شب بسری کے باعث میں حیدر شاہ کی مدد اور تائید سے محروم ہو چکا تھا۔ شیوناگ نے مجھے مفلوج کر کے ناگ بھون کا نام میرے ذہن سے محو کر دیا۔ میں تین دن تک بھوکا پیاسا اس ہولناک طلسم میں سسکتا رہا۔ پھر اس کچی عمارت نے پتھریلے مندر کا رُوپ دھار لیا اور وہاں سنکھوں کے پُرہیبت شور میں بہت سے ناگ اور ناگنیں انسانی رُوپ میں گھناؤنے کھیل کھیلنے کے لئے جمع ہونے لگیں۔ میں گویائی اور حرکت کی قوتوں سے محروم صرف دیکھنے پر قادر رہا۔ اس گھناؤنی محفل میں ناگ بھون کا ناگ راجہ میری محبوب بیوی' ستارہ کے ہمراہ آیا اور میرے دل پر چھریاں چل گئیں۔ دیوی دیوتاؤں کے حیا سوز مجسّموں کے درمیان' میری نگاہوں کے سامنے نفس کی آگ میں جھلسے ہوئے انسان نما بھیڑیئے عصمتوں کو تار تار کرنے میں لگے ہوئے تھے اور میری ستارہ اُن کے درمیان سراسیمہ نظر آ رہی تھی۔ وہاں کوئی اس کا ہمدرد نہ تھا اور نہ ہی میں اُس کی مدد کرنے پر قادر تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی مندر میں بے حیائی کا انسانیت سوز کھیل شروع ہو گیا میں بے بس اور مجبور تھا اور ستارہ کی فکر مجھے کھائے جا رہی تھی۔ اچانک کالی کے مجسّمے کی آنکھوں سے روشنی کی ایک لکیر نکلی اور آہستہ آہستہ فرش پر حرکت کرنے لگی۔ میں اس روشنی میں ستارہ کو تلاش کر رہا تھا اور پھر میں نے اُسے پا لیا۔ وہ پسینے میں ڈوبی ہوئی ناگ راجہ سے دُور رہنے کی التجائیں کر رہی تھی۔ پھر وہ چیخنے اور گڑگڑانے لگی اور آخر کار قدرت کو اُس پر رحم آ گیا۔ مندر بھیانک آوازوں سے لرزنے لگا۔ کالی کے مجسّمے سے نکلنے والی روشنی اچانک معدوم ہو گئی اور میں طاق سے نکل کر فرش پر گر پڑا۔ ہوش آنے پر میں نے اپنے آپ کو ایک ویران اور سنسان مقام پر پایا۔ میرے آس پاس زمین پر تین عورتیں اور سات مرد بے ہوش پڑے تھے اور وہیں میں نے حیدر شاہ کو اپنی طرف قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے پایا۔ پھر اُنھوں نے مجھے حضرت صاحب کی درگاہ پر پہنچنے کی ہدایت کی اور میں شاکر پور کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں پہونچ کر جب میں ایک تنور پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ شیوناگ میرے ارادوں سے باخبر ہو چکا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ میں کسی بھی طرح حضرت صاحب کی درگاہ تک پہنچوں، مگر میں نے اُس کے سارے شیطانی حربے ناکام بنا دیئے۔ اور ایک درگاہ پر پہنچ کر وہاں رکھے ہوئے مٹکوں سے پیاس بُجھائی۔ مٹی کے آبخورے پر میں نے حیدر شاہ کی ہدایت کے مطابق ایک دُعا پڑھ کر پھونکی اور بعد میں مجھے اس آبخورے سے سنگِ مرمر کا ایک دُودھیا ٹکڑا ملا۔ جسے لیکر میں نے حضرت صاحب کی درگاہ کی راہ لی۔ شیوناگ نے ایک بار پھر مجھے روکنے کی کوشش کی۔ لیکن آخر میں اس متبرک مقام تک پہنچ ہی گیا۔ درگاہ میں کسی غیبی آواز نے میری رہبری کی اور اُس کے بیان کے مطابق ناگ رانی کا منکا مجھے باہر برآمدے میں اپنے جوتوں میں مل گیا۔ اب ناگ رانی پھر میرے قبضے میں تھی۔ میں نے اُسے سون مندر پہنچنے کا حکم دیا۔ وہاں مجھے ایک پُرانی بدرو کی تلاش تھی جس کے ذریعے بآسانی مندر تک پہنچا جا سکتا تھا۔ اس جگہ ناگ رانی کو پھر شیوناگ کے گرگوں کا مقابلہ کرنا پڑا اور ہم بدرو میں آگے بڑھے لیکن شیوناگ کو ہماری آمد کی خبر ہو چکی تھی چنانچہ بدرو میں پانی کا ایک تیز اور طوفانی ریلا داخل ہوا۔ اور میں سنبھلنے کی ناکام کوشش کرتا ہوا سون ندی میں پہنچ گیا۔ بعد میں ناگ رانی بھی مجھ سے آ ملی۔ وہ دراصل اس لئے اب تک رُکی رہی تھی تا کہ شیوناگ کو میرے تعاقب سے باز رکھے۔ اُس نے کوئی خطرناک عمل کرنے کے لئے مجھ سے اپنا منکا طلب کیا۔ مگر اب شیوناگ نے فضا پر آتشی چادر مسلط کر دی تھی اور مندر تک پہنچنا بیحد دشوار تھا لیکن ناگ رانی اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی اور ہم ایک بار پھر اسی بدرو کے ذریعے سون مندر کی طرف بڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ ہم اُس کے پچھواڑے تک پہنچ گئے۔ یک بیک ایک تیز دھماکہ ہوا۔ میرے دونوں کان سُن ہو گئے اور نگاہوں کے سامنے اندھیرا پھیلنے لگا۔ بدرو میں بہتا ہوا پانی اچانک زمین میں جذب ہونے لگا اور زمین پے در پے دھماکوں سے لرزنے لگی۔

پے در پے کئی دھماکے ہوئے اور فضا میں ہر طرف گرد و غبار اور ملبے کی بارش ہونے لگی، ناگ رانی نے میری ہمت بندھائی پھر ایک زوردار دھماکہ ہوا اور شیوناگ کی خوفناک آواز آئی' وہ مجھے دھمکیاں دے رہا تھا۔ میں نے ناگ رانی کو تلاش کیا مگر وہ مجھے کہیں دکھائی نہ دی۔ شیوناگ نے سون مندر کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ دہشت' اُمید اور مایوسی کی ملی جلی کیفیت میں' میں ملبے کے ایک نسبتاً اونچے ڈھیر کی طرف بڑھنے لگا۔ وہاں ایک ادھوری دیوار کی اوٹ میں مجھے ایک لڑکی نظر آئی' اُس نے مجھے اپنے جسم کے ذریعے قابو میں کر لیا۔ اور میرا ہاتھ پکڑ کر کسی محفوظ پناہ گاہ کی طرف بڑھنے لگی' وہ لڑکی بے حد عجیب تھی، ہنستی تو منہ سے سانپ جھڑتے تھے' ہم کچھ ہی دور تک گئے تھے کہ اندھے شیوناگ نے ہمارا راستہ رُک لیا' اُس نے لڑکی کو راجکماری کہہ کر مخاطب کیا اور اس وقت مجھے پتہ چلا کہ وہ ناگ راجہ کی اکلوتی بہن ہے' شیوناگ دھمکیاں دے کر وہاں سے چلا گیا اور راجکماری نے مجھے بتایا کہ آج رات ہم ناگ بھون میں گزاریں گے مگر راجکماری کا یہ عزم خاک میں مل گیا۔ شیوناگ نے ناگ بھون کو جانے والے راستے کی نشانیاں مٹا دی تھیں' رات کے آخری پہر تک ہم راستہ تلاش کرتے رہے اور بالآخر آخری پہر میں ہم نے راستہ تلاش کر لیا' وہ ایک زمین دوز سُرنگ تھی' میں راجکماری کے پیچھے سرنگ میں کود پڑا' وہاں مجھے شیوناگ کے دوست راگی نے دبوچ لیا جسے میں نے منکے کے ذریعے ہلاک کر دیا اور شیوناگ کو بھی منکے کے ذریعے بھگا دیا۔ اسی لمحے وہاں راجکماری بھی آ گئی' اُس نے بتایا کہ اس پر غنودگی چھا گئی تھی' میں نے راجکماری سے کہہ کر سرنگ میں روشنی کرائی اور دیکھا کہ راگی کی لاش غائب ہو چکی تھی' میں اور راجکماری ناگ بھون کی طرف بڑھنے لگے۔ ابھی کچھ دور ہی گئے تھے کہ اندھیرے میں سُوں کی ہلکی آواز اُبھری اور مضبوط ڈوری والا جال میرے گرد لپٹ گیا۔ راجکماری بھی اسی جال میں پھنس گئی تھی۔ وہ جال ناگ رانی نے ہم پر پھینکا تھا جسے راجکماری نے اپنی شکتی سے جلا دیا اور پھر ان دونوں ناگنوں کا مقابلہ شروع ہو گیا جس میں جیت ناگ رانی کی ہوئی' راجکماری بھاگ کھڑی ہوئی۔ مگر کچھ دیر بعد شیوناگ کو لیکر وہاں پہنچ گئی۔ اب ایک نیا مقابلہ تیار تھا' میں نے فوراً ہی ناگ رانی کا منکا اپنی داہنی مٹھی میں دبا لیا اور شیوناگ کی بے خبری میں اس کے عقب کی طرف بڑھنے لگا' آخری اور فیصلہ کن وار کے لئے۔

بڑا خوفناک مقابلہ ہوا اور ناگ رانی نے شیوناگ کو کُتّے کا پلّا بنا دیا۔ اُس نے راجکماری کو ختم کرنا چاہا مگر میں نے اسے منع کر دیا کہ میں راجکماری کو ناگ بھون پہنچنے کا ایک ذریعہ سمجھتا تھا۔ ناگ رانی نے راجکماری کو بھونرا بنا دیا اور میں نے وہ بھونرا اپنی مٹھی میں قید کر لیا۔ پھر میں اور ناگ رانی ناگ بھون کی طرف چل پڑے' ناگ رانی نے راستے میں اپنے دو جاں نثاروں کو خچروں کے رُوپ میں طلب کر لیا۔ روانہ ہونے سے پہلے اُس نے راجکماری کو جو بھونرے کے رُوپ میں تھی' معذور کر دیا' اور پھر ہم خچروں پر سوار ہو کر ناگ بھون کی سمت چل پڑے' شیوناگ بھی کُتّے کی شکل میں ہمارے ساتھ چل رہا تھا۔ ناگ رانی نے مجھے بتایا کہ ناگ بھون کے راستے میں ایک آتشی حصار ہے جسے کوئی انسان عبور نہیں کر سکتا۔ کچھ دُور جا کر مجھے خیال آیا کہ ستارہ ناگ بھون میں ہے' وہ وہاں کیسے پہنچ گئی' یہ بات میں نے ناگ رانی کو بتائی اور اُس نے خچروں کو اُن کو غائب کر دیا۔ پھر ناگ رانی نے شیوناگ کو واپس انسانی شکل میں لا کر اُس سے آتشی حصار کو عبور کرنے کی تدبیر پوچھی مگر اُس نے انکار کر دیا۔ ناگ رانی نے اُسے بُری طرح زخمی کر دیا اور اُس نے بتایا کہ ستارہ کو اگن دیوتا کے درشن کے بعد ناگ بھون لے جایا گیا تھا اور چونکہ میں نے ناگ دیوتا کا درشن کر لیا ہے اس لئے اگن کنڈل میرے لئے بے ضرر ہے' اس کے بعد ناگ رانی نے منحوس شیوناگ کو جان سے مار دیا۔ پھر ناگ رانی نے دوبارہ خچروں کو بُلایا اور ہم آگے بڑھنے لگے۔ اور پھر میں اگن کنڈل کے جال میں پھنس گیا۔ شیوناگ نے ہم سے جھوٹ بولا تھا لیکن میں نے حیدر شاہ کے بتائے ہوئے مقدس کلمات کی مدد سے اگن کنڈل کو عبور کر لیا۔ اب ناگ بھون بالکل قریب آ چکا تھا۔ ناگ بھون میں جہاں قدم قدم پر بکھرے ہوئے مہلک خطرات میرے لئے رُوح فرسا داستان کو جنم دینے کے لئے تیار تھے اور اس سرزمین کے حکمراں کی بہن' راجکماری ایک معذور بھونرے کے رُوپ میں میری جیب میں قید تھی۔

اب آپ آگے کے واقعات پڑھیے

کوشیلا

میں نے اپنی اینٹھتی ہوئی آواز کو جنبش دینے کی کوشش کی۔

"سلطان جی! تم بہت زیادہ پریشان ہو، تمہارے اعصاب پر ناگ بھون کی بھیانک دھرتی کا خوف چھایا ہوا ہے میری مانو تو ذرا رُک کر خود پر قابو پالو۔ ورنہ ناگ بھون میں گھستے ہی جوش میں کوئی غلطی کر بیٹھو گے اور جان جوکھم میں پڑ جائے گی!" وہ ہمدردانہ لہجے میں بولی

"اب رُکنے کا نام نہ لو کوشیلا!" میں نے ہیجان آمیز لہجے میں کہا۔

"میری ستارہ مجھے پکار رہی ہے۔ اب میں ایسی منزل پر پہنچ چکا ہوں جہاں ذرا بھی توقف دشواریوں میں ڈال دے گا۔"

ناگ رانی اس بار کچھ نہ بولی۔

سُرنگ میں ہر سو مہیب تاریکی کا راج تھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود چند قدم آگے بھی کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اپنی زندگی میں کبھی اتنے گہرے اور گھور اندھیرے سے میرا سابقہ نہیں پڑا تھا۔ دونوں خچر اس اندھیرے کے باوجود اس پُراسرار سُرنگ میں یوں سرپٹ دوڑ رہے تھے جیسے وہ ان راستوں سے بخوبی واقف ہوں۔ اُن کے سُموں کی تیز ٹاپیں سُرنگ کی محدود فضا میں بھیانک بازگشت پیدا کر رہی تھیں اور سُرنگ کے آخری دہانے کی جانب سے دہشت میں ڈوبی ہوئی دھیمی دھیمی پھنکاروں اور سیٹیوں کا ملا جلا شور اُبھر رہا تھا۔ کسی وسیع گپھا میں بیشمار ناگوں اور اژدہوں کی آوازوں کی گونج سے مشابہ وہ آوازیں مجھے دہشت کے پسینوں میں نہلاتے دے رہی تھیں میرے رونگٹے کھڑے ہو چکے تھے اور مجھے اپنی جلد پر بے شمار چیونٹیاں سرسراتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اعصاب پر تشنج کی کیفیات طاری تھیں اور جسم کے سارے مساموں کے دہانے کھُل چکے تھے۔

چند ثانیوں کے بعد سُرنگ میں کافی فاصلے پر مجھے گہری سیاہی میں بے شمار ننھے ننھے جگنو چمکتے اور جھلملاتے ہوئے نظر آئے۔ آہستہ آہستہ ان روشن نقطوں کی تعداد بڑھنے لگی اور پھر تاریکی کا وہ سمندر جلتے بجھتے روشن نقطوں سے بھرا ہوا نظر آنے لگا۔

"یہ اُڑتی ہوئی چنگاریاں کیسی ہیں کوشیلا؟" میں نے سرگوشیانہ اور متذبذب آواز میں ناگ رانی سے دریافت کیا۔

"ناگ بھون قریب آچکا ہے سلطان جی!" ناگ رانی کی متفکرانہ آواز اُبھری۔

ناگ بھون ۔۔! نمناک اندھیروں میں ڈوبی ہوئی طلسم ربا سرزمین، جہاں زمین پر رینگنے والے حقیر کیڑوں کی حکمرانی تھی، قریب آپہنچی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ میں اُس کے قریب پہنچتا جا رہا تھا۔ میری کنپٹیوں میں آگ سی بھڑکنے لگی اور بدن پر سردی کا احساس چھانے لگا۔

"کوشیلا! ناگ بھون کا وحشتناک تصوّر اب میرے اعصاب پر سوار ہوتا جا رہا ہے۔ یہ روشن نقطے مجھے اپنے دماغ کی گہرائیوں میں نشتر کی طرح چبھتے محسوس ہو رہے ہیں۔"

"زمین سے بلندی پر جگمگاتے ہوئے روشن نقطے ان بے چین ناگوں کی چمکیلی اور سحر آفریں نگاہیں ہیں جو تمہاری آمد کی خبر پا کر اپنے پھن فضا میں بلند کئے ناگ بھون کے دہانے پر تمہارے منتظر ہیں۔ ان کی موجودگی پریشانیوں کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔!"

"ہم ان سے بچ کر کس طرح ناگ بھون میں داخل ہو سکتے ہیں؟" میں نے فضا میں جلتے بجھتے روشن نقطوں پر نگاہیں مرکوز کر کے ناگ رانی سے سوال کیا۔

"ناگ راجہ کے باغیوں کو بھی شاید ہماری آمد کا علم ہو چکا ہوگا ان کی تعداد تو ضرور کم ہے لیکن ان میں سے بعض بہت طاقتوں کے مالک ہیں اور اُن سب کی دلی ہمدردیاں میرے ساتھ ہیں" ناگ رانی کہنے لگی "اگر وہ یہاں موجود ہوئے تو مجھے بڑی مدد ملے گی ورنہ اس ہجوم سے نمٹے بغیر ناگ بھون میں داخلہ ناممکن ہے۔ یہ ہمیں روکنے کے لئے اپنی جان لڑا دیں گے۔"

"باغی تمہاری کیا مدد کر سکیں گے؟" میں نے تشویش آمیز لہجے میں پوچھا۔

"میں ان کی مدد سے افراتفری پھیلا سکتی ہوں۔ اس افراتفری میں ہم موقع نکال کر آسانی سے ناگ بھون میں جا گھسیں گے۔ ایک بار اندر پہنچ جانے کے بعد شاید ہم اپنے حامیوں کی مدد سے اتنے کمزور نہیں رہیں گے کہ ناگ بھون والے ہمیں ایک ہی ریلے میں مسل سکیں!"

"لیکن تم ان باغیوں سے رابطہ کیسے قائم کرو گی۔؟"

"بس تم دیکھتے رہو۔!" ناگ رانی کا لہجہ اس بار قدرے سخت تھا

دونوں خچر پوری رفتار سے دوڑتے رہے اور آخرکار مجھے تاریکی میں رنگ برنگی زندہ لکیریں لہراتی نظر آنے لگیں۔ ہر رنگ اور جسامت کے سینکڑوں ناگ اور اژدھے اپنے پھن فضا میں اُٹھائے تیز پھنکاریں مار رہے تھے۔ اُن کی آوازوں سے سُرنگ میں بھیانک گونج پیدا ہو رہی تھی۔ ان مشتعل ناگوں کی سُلگتی ہوئی قہر بار نگاہیں ہماری جانب نگراں تھیں۔!

جب ہم اس ہجوم سے کچھ دور رہ گئے تو دونوں خچروں کی رفتار سست پڑنے لگی اور پھر وہ رُک گئے۔ ناگ رانی مجھے اشارہ کر کے

نیچے کود پڑی۔ میں بھی اپنے خچر کی پشت سے اُتر گیا۔

اِس مقام سے سُرنگ قدرے ڈھلوان دار ہو گئی تھی اور بظاہر کسی بہت بڑی زیرِ زمین گپھا کے دہانے پر ختم ہوتی نظر آ رہی تھی۔

ناگ رانی ان دونوں خچروں کے درمیان کھڑی ہو کر چند ثانیوں تک سرگوشیانہ آوازوں میں کچھ کہتی رہی پھر اُس نے اُن کی پشت پر ایک ایک تھپکی دی اور وہ دونوں دودھیا رنگ کے موٹے موٹے سانپوں میں تبدیل ہو کر سُرنگ کی کھُردری زمین پر سرسراتے ہوئے آگے بڑھ گئے!

ناگ رانی کئی سیکنڈ تک اُن کی جانب دیکھتی رہی۔ جب وہ سفید لکیریں سُرنگ کے نمناک اندھیرے میں مدغم ہو گئیں تو وہ ایک گہرا سانس لے کر میری جانب پلٹی۔ "جانتے ہو میں نے کیا کھیل رچایا ہے؟" وہ فاتحانہ لہجے میں مجھ سے بولی۔

میں نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔

"یہ دونوں میری خاطر بہت بڑی قربانی دینے گئے ہیں۔ ان کی زندگیوں کا بھی کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ اِن میں سے ایک تمہارا روپ اختیار کرے گا اور دوسرا میری انسانی صورت میں ناگ بھون کے باسیوں کے مشتعل ہجوم کی جانب جائے گا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس وقت وہاں پُراسرار قوتوں سے محروم سانپوں کی کثرت ہے، وہ ان دونوں کو دیکھتے ہی اُن پر ٹوٹ پڑیں گے۔ شکتیوں والے ناگ اصل قصہ ضرور سمجھ جائیں گے اور اُنہیں روکنا چاہیں گے لیکن وہاں اُن کی بات کوئی نہ سُنے گا۔ مجھے یقین ہے کہ ناگوں کی اکثریت ان دونوں کو لے کر ناگ بھون میں جا گھسے گی اور پھر مقابلہ تعداد کے بجائے شکتیوں پر ہو گا اور ہم دونوں سکون کے ساتھ ناگ بھون میں داخل ہو جائیں گے!"

میں خاموش رہا۔ میری نگاہیں سامنے کی جانب نگراں تھیں، میرے دل و دماغ اور اعصاب پر تذبذب اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیات طاری تھیں گو ناگ رانی اپنے منصوبے پر بہت مطمئن نظر آ رہی تھی، لیکن میں اُس کی جانب سے ابھی شبہات کا شکار تھا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ سارے واقعات ناگ رانی کی توقعات کے مطابق ہی پیش آتے چلے جائیں اور وہ بلا مزاحمت اپنا مقصد حاصل کر لے۔

ناگ رانی کا پُرتاثیر منکا میرے گلے میں موجود تھا۔ حیدر شاہ کے بتائے ہوئے مقدس کلمات میرے ذہن میں محفوظ تھے اور میں شدید گھبراہٹ کے عالم میں بار بار دل ہی دل میں اُن کا ورد کر رہا تھا۔ ناگ بھون کے حکمراں کی بہن، راجکماری ایک معذور بھونرے کے روپ میں میری جیب میں مقید تھی اور میں فیصلہ کر چکا تھا کہ ناگ رانی کی مخالفت کے باوجود میں حسبِ موقع اسے اپنا آلۂ کار بناؤں گا۔ میں جس طرح ٹھوکریں کھاتا، در بدر بھٹکتا اور ذلیل و خوار ہوتا ناگ بھون کے دہانے پر پہنچا تھا اُس کے ردِعمل کے طور پر میرے تمام لطیف احساسات مٹ چکے تھے۔ ستارہ کے حصول کی خاطر میں قطعی فیصلہ کر چکا تھا کہ اب اپنی آنکھوں پر خود غرضی کی پٹی باندھ کر آگے بڑھوں گا اور کسی کو بھی داؤ پر لگانے سے گریز نہیں کروں گا خواہ وہ ناگ رانی ہو یا راجکماری!

سُرنگ میں واقع آتشی حصار کو عبور کرتے ہوئے پڑنے والے آبلوں اور زخموں کی سوزش مجھے سخت جان اور بے رحم شیوناگ کی یاد دلا رہی تھی جس کے باعث میری منزل بار بار فریب نظر آتی رہی، لیکن اب وہ موذی زندگی سے ہاتھ دھو چکا تھا اور اُس کی کینہ پرور شخصیت میرے لئے رکاوٹ نہیں بن سکتی تھی۔

میں ان خیالات میں ڈوبا ہوا سامنے دیکھ رہا تھا کہ یکایک سُرنگ میں گونجنے والا پھنکاروں کا دھیما دھیما شور غضبناک آوازوں میں تبدیل ہو گیا جیسے وہ تمام سانپ آپس میں برسرِپیکار ہو گئے ہوں۔ اسی کے ساتھ روشن نقطے تیزی کے ساتھ زاویئے بدلنے لگے!

"میرا وار کامیاب ہو گیا سلطان جی!" ناگ رانی میرا بازو دبا کر مسرت سے کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "وہاں ہنگامہ جنم لے چکا ہے اب میرا اشارہ پاتے ہی تم کو آگے بڑھنا ہے۔"

میں کئی سیکنڈ تک سکتے کے عالم میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ ناگوں کا غضبناک شور اب وہاں قیامت کا سماں باندھ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی تنگ کوٹھری میں مقید جہنمی بلاؤں کو یک بیک آزاد کر دیا گیا ہو اور وہ آزاد ہوتے ہی آپس میں معرکہ آرا ہو گئی ہوں۔

"دوڑو سلطان جی!" اچانک ناگ رانی چلائی اور میں گھوم کر اندھیرے میں اُس کے قدموں کی تیز آہٹوں کے تعاقب میں دوڑ پڑا۔

تاریک فضا میں رچی ہوئی بساند اس مقام پر خاصی بڑھ چکی تھی۔ اگر عام حالات میں ایسی بدبو سے واسطہ پڑتا تو میرے لئے ایک لمحے کے لئے بھی وہاں ٹھہرنا دشوار ہوتا لیکن اس وقت اپنے مقصد کی لگن کے سامنے میرے تمام احساسات مٹ چکے تھے!

دوڑتے دوڑتے میں نے خود کو اچانک ایک کھڑی ڈھلان کے کنارے پایا۔ اس مقام پر سُرنگ ختم ہو جاتی تھی اور شاید ڈھلان دار راستہ ناگ بھون میں داخل ہو جاتا تھا۔

تمام روشن نقطے اس وقت غائب ہو چکے تھے۔ سانپوں

کا ہیبت شور سُرنگ کے آخری حصّے سے دور ہو کر اب ناگ بھون کے
کسی تیرہ و تار حصّے میں اُبھرتا سُنائی دے رہا تھا!

"یہاں سے سنبھل کر اُترنا" مجھے اپنے قریب ناگ رانی کی آواز سُنائی دی" مجھے حیرت ہے کہ یہاں کوئی بھی موجود نہیں ہے تمہارا اگلا قدم اب ناگ بھون میں ہوگا۔"

میرا دل اُچھل کر حلق میں آگیا۔ میں نے گھُپ تاریکی میں دیکھتے ہوئے اپنا قدم اٹھایا ہی تھا کہ تاریک فضا تیز روشنی سے جگمگا اُٹھی اور میں دونوں آنکھیں بھینچ کر لڑکھڑاتا ہوا کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ طویل عرصے تک اندھیرے میں رہنے کے باعث وہ روشنی باریک سوئیوں کی طرح میری آنکھوں میں چبھی تھی۔

" یہ تیری بھول ہے ناگ رانی !" روشنی ہونے کے ساتھ ہی ایک کرخت مردانہ آواز اُبھری" ناگ بھون کے رکھوالے اتنے غافل نہیں رہتے۔ اِس دنیا کی روایات توڑنے والوں کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے وہ اب تیرا مقدر ہے!"

پھر ناگ رانی کی تیز چیخ سُنائی دی۔

میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ کئی سیکنڈ بعد میں دیکھنے کے قابل ہوا تو اپنے اور ناگ بھون کے درمیان سات بڑے بڑے ناگوں کو حائل پایا۔ ان کی مسمرائی آنکھیں میرے قدموں کی جنبش کی منتظر تھیں اور اُن کے دہانے مجھے نگل جانے کے لئے تیار تھے۔ اُن کے عقب میں ایک لمبا تڑنگا، مضبوط بدن کا مالک خوبرو نوجوان کھڑا ہوا تھا۔ اُس کی شعلہ بار نگاہیں ناگ رانی پر جمی ہوئی تھیں جو مجھ سے کچھ دُور بُری طرح چیختی ہوئی اُچھلے جا رہی تھی۔ اُس کے دونوں ہاتھ فضا میں یوں حرکت کر رہے تھے جیسے وہ کسی نظر نہ آنے والے جسم کو پوری قوت سے پیچھے دھکیل رہی ہو۔

اِس وقت میری عقل مفلوج ہو کر رہ گئی۔ میں فیصلہ نہ کر سکا کہ اس وقت مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ ابھی میں اسی تذبذب کا شکار تھا کہ کسی جانب سے مضبوط رسّی سے بنا ہوا درندوں کو پکڑنے والا جال اُڑتا ہوا میرے اور ناگ رانی کے اوپر آ رہا۔ میں نے ہاتھ پیر مارے لیکن پھُرتی کے ساتھ جال کھینچ لیا گیا اور میں زمین پر گر پڑا۔

ایک ثانیئے کے لئے میری نظر سات ناگوں کے عقب میں کھڑے ہوئے خوبرو جوان پر پڑی۔ وہ زہریلے انداز میں مُسکرا مُسکرا کر جال کھینچ رہا تھا!

ہم دونوں کے گرد جال کی گرفت مضبوط ہو جانے کے بعد وہ نوجوان واپس مڑا اور ناگ بھون کی اُترائی پر چل پڑا۔ ہم دونوں بھی سخت اور ناہموار زمین پر گھسٹتے ہوئے اسی سمت میں لیجائے جانے لگے۔ اس بار جال کی رسّی ان ساتوں ناگوں کے دہانوں میں پھنسی ہوئی تھی۔

زمین پر گھسٹتے گھسٹتے جب میں اس ڈھلان پر پہنچا تو میرا بدن اِس جال سمیت لڑھکتا ہوا تیزی کے ساتھ نشیب کی جانب چلا' لیکن رسّیاں گرفت میں ہونے کے باعث چند گز بعد رُک گیا۔

جھٹکوں کے باعث میرا جوڑ جوڑ ہل کر رہ جاتا لیکن منکے کے باعث میں اس بے رحمانہ سزا کے ناخوشگوار اثرات سے محفوظ رہا۔

ناگ رانی سخت طیش کے عالم میں کسی شیش ناگ کو گالیاں دیئے جا رہی تھی جس نے غفلت اور بے خبری کے عالم میں وار کر کے اپنی روایتی بزدلی کا ثبوت دیا تھا!

اِدھر اِس ڈھلان پر نظر پڑتے ہی میرا رواں رواں کانپ اُٹھا۔ وہ روح فرسا اور پتھریلی ڈھلان کئی سو فٹ کی گہرائی تک چلی گئی تھی اور اُس کے اختتام پر تاحدِ نظر سیاہی اور اندھیرے کا راج تھا۔ بلندی سے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہاں کیا ہے۔ اِس نشیب کی گہرائی اور وسعت پر مستزاد اِس ہولناک گپھا کا اوپری حصہ تھا۔ وہ بھی بلا مبالغہ کئی سو فٹ بلند تھا اور وہاں دُور دُور تک کہیں بھی روشنی کا گزر نظر نہیں آ رہا تھا۔

خوف اور دہشت کے باوجود میں اِس ہولناک غار کی ساخت اور وسعت پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ آسمان کے سائے اور روشنی کی کرنوں سے محروم اتنے وسیع اور گہرے زیرِ زمین غار کا تصوّر تک میرے لئے ناممکن تھا لیکن اِس وقت میں خود وہاں حالات کا اسیر تھا!

پھر ہم دونوں جال میں پھنسے آہستہ آہستہ کھڑی ڈھلان سے نیچے لڑھکنے لگے۔ تیز روشنی کا دائرہ ہمارے ساتھ ساتھ حرکت کر رہا تھا۔

اِس ڈھلان پر جا بجا سخت شاخوں اور نکیلے کانٹوں والی سیاہی اور نیلاہٹ مائل خودرو جھاڑیوں کا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ آثار سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ڈھلان کی ترائی میں بھی ایسا ہی گھنا جنگل پھیلا ہوا ہوگا اور شاید وہی ہماری منزل تھا۔

ہم اِس وقت ناگ بھون کی پُر ہول اور غیر انسانی دُنیا میں داخل ہو چکے تھے۔ فضا میں ایک آدھ ثانیوں کے لئے موت کا سا بھیانک سکوت چھا تا تھا ورنہ ہر طرف سے ناگوں، سانپوں اور اژدہوں کی دہلا دینے والی آوازیں اُبھرتی سُنائی دے رہی تھیں۔

" ناگ رانی اب اپنی زبان بند کر لے ورنہ میں تجھے یہیں معذور کر دوں گا۔" ناگ رانی کی بڑھتی ہوئی مغلظات پر حراغ پا ہو کر

اوپر سے وہی خوبرو نوجوان غرّایا۔

"تو خوبرو ضرور ہے لیکن مردانگی تجھے چھو کر بھی نہیں گزری ہے شیش ناگ ۔ یہ راز بہت کم ناگوں کو معلوم ہے کہ ناگ راجہ نے تجھے اپنے حرم کا نگراں کیوں مقرر کیا ہوا ہے ۔ تو بزدلی کے ساتھ مجھے معذور تو کر سکتا ہے لیکن بہادری کے ساتھ مقابلہ کرنا تیری فطرت کے خلاف ہے!" ناگ رانی سخت غصّے کے عالم میں چنگھ کر بولی۔

اسی وقت غیر ارادی طور پر میری زبان پر حیدر شاہ کے بتائے ہوئے کلمات رواں ہو گئے اور ہمارے گرد کسا ہوا جال دھواں بن کر فضا میں تحلیل ہو گیا اور روشنی بھی ایک دم غائب ہو گئی۔

پھندوں کی قید سے رہا ہوتے ہی میرا بدن ڈھلان سے نیچے لڑھکنے لگا۔ تمام تر حفاظت کے باوجود میں نے بڑی جانفشانی سے اِدھر اُدھر ہاتھ پیر مارے اور پھر ایک سخت اور خاردار جھاڑی میری گرفت میں آ گئی اور میرا بدن تیز جھٹکے کے ساتھ رُک گیا۔

"اِس وقت اس کے قریب جانا... اس کے قبضے میں کوئی بڑی شکتی معلوم ہوتی ہے ۔" گھپ اندھیرے میں اسی نوجوان کی کرخت آواز سنائی دی۔ شاید وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب تھا "ہاں ناگ رانی کو گھیر لو' اُسے میں نے جال سے نکل کر بائیں جانب لڑھکتے دیکھا تھا۔ اب تک وہ دونوں کھائی میں پہنچ چکے ہوں گے ۔!"

نئے واقعے سے میری ہمت بحال ہو چکی تھی اور میں اب ان لوگوں سے ٹکرا جانے کے موڈ میں آ چکا تھا۔ اُس کی آواز سے خاصی حد تک مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ اِس وقت کس جگہ موجود ہے لیکن میں نے مصلحت اسی میں جانی کہ اُس سے مقابلے کے بجائے کسی طرف کھسک چلوں۔ وہ خود بھی مجھ سے خائف ہو چکا تھا اور اب مجھے چھوڑ کر ناگ رانی کی گھات میں لگا ہوا تھا لہٰذا میں نے ناگ رانی کی خاطر مشکلات مول لینے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے خاموشی مناسب سمجھی۔

راج کماری اِس وقت میرے قبضے میں تھی اور میں اب اُس سے بھی کام لینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن میں اِس عمل سے ناواقف تھا جس کے ذریعے میں اُسے بھونرے سے اُس کے اصل روپ یا انسانی شکل میں لا سکوں اور اُس کی موجودہ حالت میرے لئے قطعی بے سود تھی۔!

میں کافی دیر تک دم سادھے وہیں پڑا رہا لیکن آس پاس سناٹا چھایا رہا۔ نچلی وادی کے مختلف حصوں سے اب بھی بے شمار پھنکاروں کا شور سنائی دے رہا تھا۔

جب مجھے پورا یقین ہو گیا کہ میدان صاف ہو چکا ہے تو میں نے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا اور اسی وقت مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا' ناگ بھون میرے لئے اجنبی اور پُراسرار سرزمین تھی۔ اِس وقت میں ایک خوفناک ڈھلان پر اُگی ہوئی جھاڑی کے سہارے نیچے گرنے سے محفوظ تھا۔ اس جھاڑی سے لٹکے لٹکے میرے بازو شل ہو چکے تھے اور مجھے کچھ علم نہ تھا کہ مجھے کس طرف جانا چاہیئے۔

راج کماری سے موجودہ حالت میں مدد کی اُمید بے سود تھی اور ناگ رانی نہ جانے کہاں نکل چکی تھی۔ معاً مجھے خیال آیا کہ اُس کا منکا میرے قبضے میں ہے اور وہ جہاں اور جس حال میں بھی ہو میرے طلب کرنے پر ہی مجھ تک پہنچنے کی پابند ہے۔!

یہ خیال آتے ہی میں نے ناگ رانی کو طلب کیا اور اگلے ہی لمحے وہ میرے پاس آ پہنچی۔

"وہ چلے گئے' اِس وقت راستہ صاف ہے ۔!" میں نے ناگ رانی کو پہچان کر کہا۔

"میں نیچے کھائی میں جا گری تھی' تم نے اُس جال پر کیا منتر پڑھا تھا۔ ؟" اُس کی آواز میں اس وقت قدرے بشاشت رچی ہوئی تھی۔

"آگے کی فکر کرو۔ اب ہمیں کدھر چلنا ہے ؟" میں نے اُس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"سب سے پہلے ہمیں ڈھلان سے نیچے پہنچنا ہے' اس پر سے تمہارا اُترنا بہت دُشوار ہے' تم یہ جھاڑی چھوڑ دو۔ خود بخود نیچے پہنچ جاؤ گے !"

اُس کے مشورے پر مجھے غصّہ آ گیا ۔ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ مجھ پر طنز کر رہی ہو۔!

"یہ مجھے بھی معلوم ہے لیکن میں نیچے پہنچ کر زندہ رہنا چاہتا ہوں ۔" میں نے تلخ اور غصیلے لہجے میں ناگ رانی کے احمقانہ مشورے کا جواب دیا۔

"سلطان جی! خفا کیوں ہوتے ہو ۔!" میں نے اُس کے گرم گرم سانسوں کا لمس اپنی پیشانی پر محسوس کیا۔ "منکا تمہارے پاس ہے تمہیں ذرا بھی چوٹ نہ آئے گی ۔!"

میں اپنی بدحواسی پر دل ہی دل میں شرمندہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا ناگ بھون پہنچتے ہی مجھ پر ایسی ہیجانی کیفیت طاری ہوئی تھی کہ میں سب کچھ بھول کر رہ گیا تھا!

"میں جھاڑی چھوڑ رہا ہوں !" میں نے ندامت آمیز لہجے میں اُس سے کہا اور جھاڑی چھوڑ دی۔

میرا بدن تیزی کے ساتھ اس سنگلاخ اور ناہموار ڈھلان پر اُگی ہوئی جھاڑیوں پر سے لڑھکتا اور اُلجھتا ہوا نیچے کی طرف جانے

لگا۔ میرے جسم پر کسی ضرب یا تکلیف کا کوئی احساس نہیں تھا۔ ہاں قلابازیوں کے باعث دل کی دھڑکنیں کھوپڑی میں گونج رہی تھیں۔!

آخر کار ایک تیز جھٹکے کے ساتھ میرا بدن زمین سے جا لگا۔

میں کئی ثانیوں تک یوں ہی بے سُدھ پڑا رہا۔ میرا سینہ کسی لوہار کی دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے شرارے ناچ رہے تھے۔!

"جلدی اُٹھو، یہاں کچھ گڑبڑ معلوم ہوتی ہے!" اچانک اپنے قریب ہی مجھے ناگ رانی کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "یہاں درختوں کے کھوکھلے تنوں اور غاروں میں ہر وقت سینکڑوں سانپ پھنکارتے رہتے ہیں لیکن اب یہاں سناٹا ہے۔"

میں بوکھلا کر زمین سے اُٹھا اور ناگ رانی میرا ہاتھ تھام کر ایک طرف دوڑ پڑی۔ درختوں، جھاڑیوں اور پتھروں میں اُلجھتے ابھی ہم تھوڑی ہی دُور گئے تھے کہ عقب میں ہونے والے پُر شور دھماکوں سے زمین لرز اٹھی اور میں منہ کے بل زمین پر جا رہا۔

"نیچے پڑے رہو، کانوں میں انگلیاں ٹھونس لو" ناگ رانی پوری قوت سے چیخی "ناگ راجہ ہمیں زمین میں زندہ دفن کر دینا چاہتا ہے اسی لئے اُس نے یہ علاقہ خالی کرا لیا تھا۔"

میں نے فوراً اُس کی ہدایت کی تعمیل کی۔

چند سیکنڈ بعد دھماکوں کی گونج کم ہوئی تو ناگ رانی مجھے ساتھ لے کر آگے کی جانب دوڑ پڑی۔

ہم کافی دیر تک پوری قوت کے ساتھ دوڑتے رہنے کے بعد اس ویران اور سنسان علاقے سے نکل کر ناگ بھون کے ایسے حصے میں داخل ہو گئے جہاں سانپوں کا شور گونج رہا تھا۔

"کوشیلا... ہم کدھر جا رہے ہیں؟" میں نے دوڑتے دوڑتے ہانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہم انند گھاٹ جا رہے ہیں۔" وہ جلدی سے بولی "وہ ایک چشمے کا کنارا ہے۔ میرے آنے کی خبر پھیلتے ہی ناگ راجہ کے سارے باغی وہاں جمع ہو رہے ہیں۔ ناگ راجہ کو خبر ہونے سے پہلے مجھے وہاں پہنچنا ہے۔ ورنہ وہ سب مارے جائیں گے۔"

"انند گھاٹ!" میں نے دل ہی دل میں دوہرایا اور اُس کے ساتھ دوڑتا رہا۔ گھور تاریکی میں دشوار گزار راستوں پر کافی دیر تک دوڑتے رہنے کے بعد میرے کانوں میں پتھروں کے درمیان بہتے ہوئے پانی کا مدھر شور پہنچا اور میں سمجھ گیا کہ انند گھاٹ آ پہنچا ہے۔

گھنے درختوں کے جنگل میں رُک کر ناگ رانی نے اونچی آواز میں کوئی نامانوس لفظ کہا اور جواب کا انتظار کرنے لگی لیکن وہاں کوئی مخصوص اشارا نہ سُنائی دیا۔ اُس نے دوبارہ وہی لفظ کہا اور جب اِس بار بھی سکوت ہی رہا تو وہ مجھے ہمراہ لے کر گھنے درختوں کے درمیان گھس پڑی۔!

کچھ دیر تک بھٹکتے رہنے کے بعد وہ چشمے کے کنارے درختوں کے ایک وسیع کنج تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی جہاں اُس نے تاریکی کے باوجود اپنی پُراسرار قوت کے سہارے بہت سے سانپوں اور ناگوں کے بے جان بدن دیکھے۔

"چوٹ ہو گئی!" وہ مضطربانہ لہجے میں بولی "ہمارے آنے سے پہلے ہی شیش ناگ کا وار چل گیا۔ میرے کئی سو ساتھی مُفت میں مارے گئے۔ اب دوسروں کو یکجا کرنا اتنا آسان نہ ہو گا۔ حالات بہت زیادہ ناسازگار ہیں۔ اور ہمیں ہر وقت اپنی جانوں کا خطرہ ہے۔"

معاً ایک درخت کی آڑ سے بجلی کی ایک لہر کوندتی ہوئی ہماری جانب آئی۔ اُس نے مجھ پر تو اثر نہیں کیا لیکن ناگ رانی چیخ مار کر یوں دُور جا گری جیسے کسی نے اُسے ہاتھوں میں اُٹھا کر دُور اچھال دیا ہو۔!

"منکا۔ سلطان جی میرا منکا دو، ورنہ ہم دونوں....!"

ناگ رانی نے کسی ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح گلا پھاڑ کر کہا۔ میں منکا اپنے گلے سے اُتار کر اُس کی جانب لپکا لیکن کسی جانب سے شیش ناگ انسانی روپ میں نمودار ہو کر میرے آڑے آ گیا۔

"اجنبی!" وہ کرخت آواز میں غرایا "ناگ بھون میں سرکشی کی سزا سسکتی ہوئی طویل زندگی ہے اور ناگ رانی نے اپنی جنم بھومی سے سرکشی کی ہے۔ تو اپنی بیوی کی خاطر ہر رکاوٹ توڑ کر ناگ بھون کی روایات کے خلاف یہاں آ گھسا ہے لیکن اس وقت مجھے تجھ سے سروکار نہیں۔ اگر تو نے ناگ رانی کی مدد کرنے کی کوشش کی تو تیرا بھی اسی وقت فیصلہ کر دیا جائے گا۔!"

شیش ناگ کے مفاہمانہ لہجے سے دوغلے پن کی بو آ رہی تھی۔ وہ ناگ رانی کو اور مجھے الگ الگ زیر کرنا چاہتا تھا اور اپنے اس مقصد کی خاطر مجھے وقتی طور پر فریب دے رہا تھا۔!

"مکاری تیرا ضمیر ہے شیش ناگ!" میں نے نفرت آمیز لہجے میں کہا "میرا راستہ چھوڑ دے۔ ورنہ زندگی سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔!"

شیش ناگ نے کوئی عمل کرنے کے لئے اپنا داہنا ہاتھ اوپر اُٹھانا چاہا لیکن تاریکی میں اُس کے ہاتھ کی جنبش محسوس کرتے ہی میں نے مقدس کلمات کا ورد شروع کر دیا۔ شیش ناگ کریہہ چیخ کے ساتھ زمین سے اُچھلا اور پھر نیچے آگرا۔ میں لپک کر ناگ رانی کے قریب پہنچا اور منکا اُس کے حوالے کر دیا۔

شیش ناگ کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی نادیدہ قوت اُسے بار بار زمین پر پٹخ کر ہلاک کر دینا چاہتی ہو۔

"اسے کچل دوں گی!" منکا قبضے میں آتے ہی ناگ رانی کو اذیت سے نجات مل گئی اور وہ طیش کے عالم میں زمین سے اُٹھ گئی، پھر اُس نے زمین پر سے مٹی کی ایک چٹکی اُٹھائی اور اُسے منکے سے مس کر کے شیش ناگ کی طرف اُچھال کر اونچی آواز میں کچھ اجنبی الفاظ ادا کیئے۔

شیش ناگ کے حلق سے نکلنے والی آخری چیخ بہت بھیانک تھی۔ اُس کا بدن زمین پر گر کر آخری بار بُری طرح تڑپا اور پھر انسانی بہروپ ناگ کے روپ میں آکر ساکت ہو گیا۔

مجھ پر عجیب سی خوف آور سنسنی مسلط ہو چلی تھی۔ ناگ بھون میں ہم اپنے پہلے دشمن کا خاتمہ کر چکے تھے اور اس ابتدائی فتح پر مجھے خوشی ہونی چاہیئے تھی لیکن میں ایک پُراسرار اور طلسماتی دنیا میں اجنبی مخلوق کے درمیان گھرا ہوا تھا اور مجھے آنے والے لمحات کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔!

اُسی وقت آس پاس کے درختوں سے کئی وزنی ناگ سرسراتے ہوئے نکلے اور ناگ رانی فرطِ مسرت سے بے اختیار چیخ پڑی۔ "غنیمت ہے کہ تم زندہ ہو، مجھے تمہارا انتظار تھا۔ دیکھو تمہارے بہت سے بے گناہ ساتھیوں کو مارنے والا شیش ناگ بھی اُن ہی کے پہلو میں مُردہ پڑا ہے، ناگ بھون میں اب ظلم کے خلاف بغاوت شروع ہو چکی ہے۔ یہاں زندگی اور موت کی جنگ جم کر لڑی جائے گی۔"

اِسی اثنا میں وہ سب ناگ زمین پر لوٹ کر انسانی روپ میں آچکے تھے اُن کی تعداد گیارہ تھی۔!

"ناگ رانی!" ان میں سے ایک نے سرگوشیانہ اور احترام آمیز آواز میں کہا "منصوبہ تیار ہونے سے پہلے کھلی فضا سازگار نہیں ہے۔"

"لیکن ناگ بھون میں ہر جگہ ہمارے لئے یکساں ہے!" ناگ رانی جلدی سے بولی۔

"سُنا ہے ناگ راجہ کی بہن، راجکماری تمہاری قید میں ہے۔"

ایک اور نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "اُس کی حویلی میں اُس کی مرضی کے بغیر کوئی نہیں آسکتا۔ اِس حویلی پر ناگ دیوتا کا سایہ ہے۔ اگر راجکماری ہمارا ساتھ دے تو ہم وہاں قلعہ بند ہو سکتے ہیں۔!"

"راج کماری!" ناگ رانی غصیلی آواز میں بولی۔ "وہ میری حمایت کے سوا سب کچھ کر سکتی ہے!"

میں نے غیر ارادی طور پر اپنی جیب ٹٹولی۔ راجکماری ایک معذور بھونرے کے روپ میں اب بھی میرے پاس موجود تھی۔

"تم اُسے انسانی روپ میں لاؤ۔۔۔ میں اُسے آمادہ کر لوں گا،" میں نے ناگ رانی سے کہا۔

"بے کار۔۔۔!" ناگ رانی نے کہنا چاہا لیکن اُن گیارہ میں سے ایک نے اُس کی بات کاٹ دی۔

"کوشش میں کیا حرج ہے رانی جی! وہ بھی ناگ راجہ سے بدظن رہتی ہے، ناگ بھون میں وہ بہت بڑی قوت ثابت ہو گی!"

"نکالو اسے، کہاں ہے وہ!" ناگ رانی نے قدرے بددلی کے ساتھ کہا۔

مجھے علم تھا کہ ناگ رانی محض جذبۂ رقابت کی بنا پر راجکماری کی دشمن ہوئی ہے اور اسے کسی صورت یہ بات گوارا نہیں تھی کہ راج کماری میری مدد کرے۔ اُسے اندیشہ رہا ہو گا کہ راج کماری اگر میرے سامنے ایک بار اپنی اہمیت ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئی تو پھر میرے نزدیک ناگ رانی کا کردار غیر اہم ہو کر رہ جائے گا۔

بہر حال میں نے اپنی جیب سے وہ معذور بھونرا نکال کر ناگ رانی کے حوالے کر دیا۔ ناگ رانی نے اُسے اپنی ہتھیلی پر رکھ کر غور سے دیکھا اور پھر گہرے اندھیرے میں اُس کے ہاتھ کی جنبش سے اندازہ ہوا کہ اُس نے راجکماری کو زمین پر پھینک دیا ہے۔

پھر ناگ رانی کے منہ سے کچھ غیر مانوس الفاظ ادا ہونے لگے، چند ہی سیکنڈ میں راج کماری کی انسانی آواز اُبھری۔

"بولو۔ تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" اُس نے تحقیر آمیز آواز میں پوچھا تھا۔

"ہم تیری حویلی میں پناہ چاہتے ہیں۔ ناگ راجہ سے ہر ایک بدظن ہے، تو بھی اُس سے خوش نہیں ہے، ہم اُس کی بدمزاجی سے چھٹکارا چاہتے ہیں!" اُن گیارہ میں سے ایک بولا۔

"ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں!" وہ زہریلے

اندازمیں ہنس کر بولی۔ "میں ناگ رانی کو مارنا تو نہیں چاہتی لیکن پناہ کی خاطر تمہیں اس کو بھی میری طرح معذور کرنا ہوگا۔ دیکھو میرا ہاتھوں اور پیروں سے محروم دھڑ کتنی بے بسی سے زمین پر پڑا ہوا ہے، میں اپنا انتقام چاہتی ہوں۔"

"یہ ہرگز نہ ہوگا۔" ناگ رانی پوری قوت سے چلا اٹھی۔

ناگ رانی کے حامیوں میں اس شرط پر ہیجان سا پھیل گیا اور وہ سرگوشیانہ آوازوں میں باتیں کرنے لگے۔ اُن کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ راجکماری کی شرط کے بارے میں اُن میں اختلاف رائے پیدا ہو چکا ہے۔ میرے لیے وہ بہت نازک مرحلہ تھا!

گو ناگ رانی بہت سی طاقتوں کی مالک تھی لیکن وہ ناگ راجہ کے مقابلے کی تاب نہیں لا سکتی تھی اور ناگ بھون میں کہیں بھی اُس کے لیے ناگ راجہ سے پناہ نہیں تھی۔ ناگ رانی کی حمایت کرتے ہوئے شکست اور موت میرا مقدّر نظر آ رہی تھی۔ وہ تو پھر بھی ناگ راجہ کی ہم نسل تھی، شاید اسے زندہ چھوڑ دیا جاتا لیکن مجھے ناگ بھون اپنا مدفن بنتا نظر آ رہا تھا۔ ناگ رانی شکست اور موت میں تاخیر تو کر سکتی تھی لیکن ناگ راجہ پر فتحیابی اُس کے بس سے باہر تھی۔ دوسری طرف راجکماری کی قوت تھی۔ اگر میں اُس کی ہمدردیاں جیت لیتا تو ناگ بھون میں کوئی بھی مجھ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اُس کی ممنوعہ حویلی میں اپنی طبعی عمر پوری کر سکتا تھا۔

پھر میں نے فوراً ہی ایک فیصلہ کر ڈالا... نہایت اہم اور سنسنی خیز!

"راج کماری تو نے ناگ رانی کی شان میں گستاخی کی ہے اور اب بھیانک سزا تیرا انعام ہوگی۔" میں نے غصیلی آواز میں اُسے للکارا اور پھر ناگ رانی سے مخاطب ہو گیا۔ "لاؤ منکا مجھے دو، اس معذور لڑکی پر رحم کھا کر میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی۔"

"یہ اپنے محسنوں پر وار کرنے کی عادی ہے سلطان جی! اچھا ہوگا کہ تم خود ہی اسے انجام کو پہنچاؤ۔" ناگ رانی منکا میرے حوالے کرتے ہوئے بولی۔ منکا اپنی گرفت میں لیتے ہی میں کئی قدم پیچھے سرک گیا

"ناگ رانی کے ہاتھ پیر توڑ ڈالو!" میں نے اپنے دل پر جبر کرتے ہوئے سرد لہجے میں ناگ رانی کے اُن گیارہ حامیوں سے مخاطب ہو کر کہا جن میں شورش کے آثار میں پہلے ہی محسوس کر چکا تھا۔

"سلطان جی!" ناگ رانی کے حلق سے کربناک آواز نکلی اور میں نے اپنے ہونٹ دانتوں میں بھینچ لیے۔

"راج کماری کے منہ لگنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے ناگ رانی" معذور راج کماری قہقہہ مار کر بولی۔ اسی کے ساتھ وہ سب آدمی نما ناگ کوشیلا پر ٹوٹ پڑے۔

چند ثانیوں تک فضا میں انسانی آوازیں اُبھرتی رہیں اور پھر وہاں یک بیک سانپوں کی خوفناک پھنکاریں گونجنے لگیں۔ چند ثانیوں قبل ناگ رانی کی حمایت کرنے والے اب مل کر اس کو زیر کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے!

اندھیرے کے باعث میں اس مقابلے کا منظر تو نہ دیکھ سکا لیکن آوازوں سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ ناگ رانی اُن سب کے لیے خاصا مشکل شکار ہے۔ پھر اچانک ناگ بھون کے اس حصے کی اندھیری فضا میں دل کو لرزا دینے والی بھیانک آواز گونجنے لگی اور وہاں شدید افراتفری پھیل گئی۔

اس نئی آواز نے مجھے بھی بوکھلا کر رکھ دیا۔

"ناگ راجہ آ رہا ہے۔" زمین پر پڑی ہوئی راج کماری گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "سب لوگ میری حویلی کی طرف بھاگو ورنہ یہ کہانی یہیں نمٹ جائے گی۔"

اتنی دیر میں وہاں موجود سارے ناگ دوبارہ انسانی روپ اختیار کر چکے تھے۔ انہوں نے راج کماری اور ناگ رانی کو اپنے ہاتھوں پر اُٹھایا اور تیزی سے ایک طرف دوڑ پڑے، میں بھی اُن کے پیچھے بھاگنے لگا!

اس بھیانک آواز کی گونج لحظہ بہ لحظہ تیز ہوتی جا رہی تھی اور میں گرتا پڑتا اُن کے پیچھے دوڑا جا رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں میں نے خود کو سیاہ پتھر سے بنی ہوئی ایک مضبوط اور بلند و بالا حویلی کے پھاٹک کے سامنے پایا۔

"اندر گھس پڑو۔" راج کماری تیز آواز میں بولی اور وہ سب وحشت زدہ بھیڑیوں کے غول کی طرح گرتے پڑتے اس ویران اور ہولناک حویلی میں گھس پڑے۔

میں جوں ہی اس حویلی میں داخل ہوا فضا میں گونجتی ہوئی آواز یک لخت معدوم ہو گئی۔

"اب ہم ناگ راجہ سے محفوظ ہیں۔" تاریک حویلی میں راجکماری کی آواز اُبھری۔ اُس کی آواز کی بازگشت سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ حویلی بہت بلند اور کشادہ ہے۔

"راج کماری روشنی کرو!" میں نے اونچی آواز میں اُسے مخاطب کیا۔ "اندھیرے سے اب مجھے وحشت ہو رہی ہے۔!"

"راج کماری! یہ مجھ سے بے وفائی کر چکا ہے تو تجھ سے بھی ہرگز وفا نہ کرے گا۔ یہ انسان ہے اور ہر انسان خود غرض ہوتا ہے ابھی یہ تیری طاقت کا سہارا چاہتا ہے اور بہت جلد تیرے ساتھ بھی وہی سلوک کرے گا جو اُس نے میرے ساتھ کیا ہے۔" ناگ رانی شکست خوردہ اور تلخ آواز میں بولی۔

"تجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں!" راج کماری کی آواز سنائی دی۔ پھر اُس کے منہ سے ہلکی سی سیٹی کی آواز نکلی اور وہاں روشنی کا غبار پھیل گیا۔

اِس دھندلائی ہوئی اور مدھم روشنی میں سب سے پہلے میری نظر ان خشک انسانی کھوپڑیوں پر پڑی جو اس وسیع کمرے کی چھت سے لٹک رہی تھیں۔

کوشیلا کا جسم اِس وقت صحیح سلامت تھا۔ ناگ راجہ کی آمد کے باعث وہ معذور کئے جانے سے بچ گئی تھی۔ ناگ رانی اِس وقت مجھے ملامت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر غصے کے ساتھ ہی دلی صدمے کی علامات بھی نمایاں تھیں۔!

"سلطان جی!" راجکماری ایک نرم مسند پر لٹائی جانے کے بعد بولی "تم نے میری جان بچائی اور پھر میرے اشاروں پر اُسے معذور کرنے پر رضامند ہو گئے۔ اُس کی خوش قسمتی سے اُسی وقت ناگ راجہ کے آنے کا ہنگامہ نہ کھڑا ہوتا تو یہ اِس وقت اپنے پیروں پر نہ کھڑی ہوتی۔ میں اپنی شرط منوا چکی ہوں اور اب اس کا انجام تمہاری مرضی پر چھوڑتی ہوں، جو چاہو سو کرو۔"

"اب مجھے زندہ دفن کرا دو۔" کوشیلا تلخ آواز میں بولی۔

"نہیں!" میں نے بوجھل آواز میں کہا "تم زندہ رہو گی کوشیلا۔"

"معذور بن کر!" وہ میری بات پوری ہونے سے قبل چیخ پڑی۔

"نہیں ...!" میں نے یہ کہہ کر اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔

"یہ قصہ ختم کرو۔" راجکماری اونچی آواز میں بولی "میری حویلی میں آ کر یہ نہ سمجھو کہ ناگ بھون میں اب عافیت ہی عافیت ہے ناگ راجہ اِس وقت پاگلوں کی طرح ناگ بھون میں پھنکارتا پھر رہا ہے اور ستارہ کو اپنے قدموں میں پامال کرنے کے لئے وہ اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس کے اکلوتے لڑکے کو تیل کے اُبلتے ہوئے کڑھاؤ میں ڈالنے کی تیاریاں کر چکا ہے۔"

"کسی انسان کے ناگ بھون میں گھس آنے کا واقعہ ایسا ہولناک ہے کہ ناگ بھون والوں میں بڑی تباہی کی کہانیاں پھیل رہی ہیں۔ صدیوں سے اِس دھرتی پر اجنبی قدم نہیں پڑے تھے پر ناگ راج کے زمانے میں انہونی ہوئی ہے، وہ اپنی عیاشیوں میں پڑ کر ہماری جنم بھومی کی حفاظت نہ کر سکا اور اب ہمیں اس کو ختم کرنا ہو گا۔" اُن گیارہ انسان نما ناگوں میں سے ایک عمر رسیدہ ناگ نے تشویشناک لہجے میں کہا "راجکماری اُس کی جگہ لے گی۔"

ناگ رانی اپنی اہمیت ختم ہو جانے کے باعث یک بیک جھلائی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔ غالباً وہ سمجھ چکی تھی کہ اب آنے والے لمحات میں، میں زیادہ تر معذور راج کماری پر انحصار کروں گا۔

"لیکن اب ناگ راجہ پر قابو پانے کی کیا صورت ہو گی؟" ایک اور انسان نما ناگ نے سوال کیا۔

"ٹھہرو!" معذور راجکماری پُر خیال آواز میں بولی "کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ پوجا گھاٹی میں کیا ہو رہا ہے" سب ہی لوگوں نے راجکماری کے اِس خیال کی تائید میں اپنے سروں کو جنبش دی۔

پھر راجکماری کے ہونٹوں سے خوفناک لیکن مخصوص پھنکاریں بلند ہونے لگیں۔ ان آوازوں کے آہنگ کے ساتھ ساتھ اس حویلی میں پھیلی ہوئی روشنی کبھی ماند ہو جاتی اور کبھی اُس میں تیز چکا چوند پیدا ہو جاتی تھی!۔

راجکماری گہرے انہماک کے ساتھ کافی دیر تک یہی عمل کرتی رہی اور پھر میں نے اس وسیع ہال میں ایک عجیب و غریب اور حیرت ناک منظر دیکھا۔

اس کمرے کی فضا میں روشن ذرات سے کچھ مخصوص ہیولے ترتیب پا رہے تھے۔ ابتدا میں وہ ہیولے دھندلائے ہوئے اور غیر واضح تھے۔ پھر موٹی موٹی لکیروں نے مختصر ہو کر رینگتے ہوئے زندہ سانپوں کی صورت اختیار کر لی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اِس کمرے کی فضا میں دھند کے روشن ذرات سے بنے ہوئے زندہ سانپ معلق ہو کر کلبلا رہے ہوں۔!

آہستہ آہستہ وہ منظر بالکل واضح ہو گیا!

اونچے اونچے، ہیبت اور کٹاؤ دار ٹیلوں والے دو پہاڑی سلسلوں کے درمیان وہ ایک تنگ سی گھاٹی تھی جہاں بے شمار ناگ اپنے پھنوں کو بلند کئے حرکت کر رہے تھے، اُن کے درمیان ایک بہت توانا ناگ نظر آ رہا تھا جس کے پھن کے اوپر تاج نما کلغی نظر آ رہی تھی، وہ بہت زیادہ مضطرب نظر آ رہا تھا۔

اِس ہولناک گھاٹی میں ایک انسانی ہیولا چٹانوں کے سہارے یوں ٹکا ہوا تھا جیسے اُس میں سے حرکت اور زندگی کی ہر رمق نچوڑی جا چکی ہو۔ میں نے اس انسانی ہیولے پر نظر پڑتے ہی اپنے دل میں کرب اور اضطراب کی ناقابلِ بیان لہر دوڑتی محسوس کی لیکن وہ تمام روشن سائے اتنے مختصر تھے کہ اس انسانی پیکر کی جنس یا اس کے خدوخال کی شناخت ناممکن تھی۔!

ایک جانب آگ کے شعلوں کی سی لپک کوند رہی تھی۔ اِس الاؤ پر کوئی برتن چڑھا ہوا نظر آ رہا تھا اور اُسی جگہ زمین پر ایک ننھا سا زندہ ڈھیر کلبلا رہا تھا۔

ناگ بھون پہنچ کر میں نے جو کچھ سُنا تھا اُس کی روشنی میں گھاٹی کا وہ منظر بالکل واضح تھا لیکن مجھ پر اضطراب کے باعث بے یقینی سی طاری ہو چلی تھی۔

"یہ کیا ہے راج کماری... یہ انسانی سایہ کس کا ہے؟" میں نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

راج کماری نے میری بات کا جواب دیئے بغیر اونچی آواز میں چند الفاظ ادا کئے اور وہ دھند سمٹ کر ایک منوّر نقطے میں تبدیل ہو گئی۔ اِس نقطے سے روشنی کی اتنی تیز کرنیں پھوٹ رہی تھیں کہ میرے لئے اس پر نگاہیں جمانا دشوار ہو رہا تھا۔

یہ عمل پورا ہوتے ہی راج کماری نے ایک چیخ ماری جس کی بازگشت حویلی میں دور تک گونجتی چلی گئی اور ساتھ ہی وہ روشن نقطہ پھیلنے لگا۔ اِس بار اس روشن دھند نے صرف انسانی پیکر کا روپ دھارا اور میں بے اختیار اُچھل پڑا۔ پوجا گھاٹی میں چٹانوں کے سہارے ٹکا ہوا نسوانی ہیولا میری معصوم اور وفاشعار بیوی۔ ستارہ کا عکس تھا۔ اُس کی لانبی لانبی پلکیں غنودگی اور کرب کے عالم میں بڑی بڑی غزالی آنکھوں پر جھکی پڑ رہی تھیں۔ اُس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور ایک ایک نقش میں شدید انتظار اور خوف کی علامات رچی ہوئی تھیں۔ وہ طویل صعوبتوں کے باعث بہت کمزور اور نڈھال نظر آ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ اُس نے جوں ہی اپنی پشت چٹانوں سے ہٹائی، وہ زمین پر گر پڑے گی۔

"کوشیلا... یہ کیا حالت ہو گئی اُس کی!" میں فرطِ جذبات سے رندھی ہوئی آواز میں یہ کہہ کر ناگ رانی کے شانے سے جا لگا۔

"تم نے ستارہ کی خاطر مجھ پر ظلم کرنے کی کوشش کی اور ناگ راجہ اپنے نفس کی خاطر ستارہ پر ستم ڈھا رہا ہے۔ سلطان جی! کردار الگ الگ ہیں، کہانی ایک ہی ہے!" وہ ہولے ہولے میرا سر سہلاتے ہوئے مغموم مگر تلخ لہجے میں بولی۔

"نہیں کوشیلا۔" میں اُس کے طنزیہ لہجے پر تڑپ اُٹھا۔ "کہانی بھی الگ ہے، تم میرے جذبے کو نہیں سمجھ سکتیں!"

"خیر۔ مجھے کوئی افسوس نہیں ہے۔" وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولی "میں تو تم سے کہتی تھی کہ تمہاری محبت کی خاطر میں اپنی جان بھی دے دوں گی تو افسوس نہ ہوگا... لیکن تم نے جس طرح مجھے ٹھکرایا ہے، اُس پر میں دُکھی ہوں۔ راجکماری سے اب مجھے کوئی شکایت نہیں، مجھے لگتا ہے کہ اب میرا وقت پورا ہونے والا ہے۔ ایسے وقت میں کسی سے بیر مول لینا اچھا نہیں، بس تمہاری مشکل آسان ہونی چاہیئے۔"

وہ اِس وقت اتنی شدّت سے یاسیت اور محرومی کا شکار تھی کہ اُس کے لہجے پر میں پھریری لے کر رہ گیا اور اُسے اپنے بدن سے علیحدہ کر دیا۔ اِس وقت تک فضا میں سے روشن دھند غائب ہو چکی تھی اور راجکماری متجسس انداز میں میری طرف گھور رہی تھی۔

راج کماری اور ناگ رانی کے درمیان میری حیثیت بہت نازک ہو چکی تھی اور میں ایک ایسے دوراہے پر آ پھنسا تھا جہاں ذرا سی لغزش میری تباہی کا سبب بن سکتی تھی۔ راجکماری ناگ رانی کی سخت دشمن تھی لیکن ناگ رانی اس وقت میری خاطر مصالحت پر آمادہ تھی۔ راج کماری سے مجھے خاصی مدد ملنے کی اُمید تھی اور اسی توقع پر میں نے ناگ رانی سے یک بیک آنکھیں پھیر لی تھیں لیکن ناگ رانی بھی قوتوں کی مالک تھی اور ناگ بھون تک میری رسائی بڑی حد تک اُس کی مدد اور جان سوزی کا نتیجہ تھی!

میں نے فیصلہ کر لیا کہ اُن کے سامنے کھُل کر اپنی حیثیت واضح کر دوں۔

"راج کماری!" میں نے آہستہ سے ناگ راجہ کی بہن کو مخاطب کیا۔ "تم اِس وقت حالات پر پوری طرح قادر ہو اور تم ناگ رانی کو زیر کر چکی ہو، مگر تم نے اس کا انجام مجھ پر چھوڑ کر مجھے بہت بڑی خلش سے بچا لیا ہے۔ ناگ رانی محض میری غلام نہیں میری محسن بھی ہے اور میں نے

فوری حالات کے تحت گھبرا کر نہایت خود غرضی کا مظاہرہ کیا اور مصالحت کے بجائے بے رحمی کے ساتھ ناگ رانی سے بے رخی اختیار کر لی۔" اتنا کہہ کر میں اگلے فقروں کی ترتیب کے لئے خاموش ہوا کہ راجکماری نے ایک معنی خیز ہنکارا بھرا۔

راج کماری کی اِس معنی خیز ہنکارے سے میں اتنا تو سمجھ گیا کہ وہ میری بدلی ہوئی روش پر ناخوش ہے مگر اس وقت مجھ پر اتنی شدت سے معقولیت اور احسان مندی طاری تھی کہ میں نے قلابازی کھانے کے بجائے اپنے دلی خیالات کے اظہار کا فیصلہ برقرار رکھا۔

"اب میرے لئے۔" میں نے لہجہ نرم کرتے ہوئے بات دوبارہ شروع کی "ناگ بھون میں صرف ایک مقصد ہے۔ مجھے اپنی بیوی اور بچے کو حاصل کرنا ہے اور مجھے اِس مقصد کے لئے ہر قسم کی مدد درکار ہے خواہ وہ راجکماری سے ملے یا ناگ رانی سے۔ میں اپنی محبت کا واسطہ دے کر تم دونوں سے التجا کرتا ہوں کہ اپنی رقابتوں کو بھلا دو۔ اگر میں زندہ رہا تو اس احسان کے عوض جو کچھ میری قوت میں ہے کر گزروں گا۔"

"یہ تمہارا عہد ہے!" راج کماری نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا

"ہاں!" میرا لہجہ مضبوط اور جذباتی تھا۔

"تو سنو! مجھے تم دونوں نے معذور کیا تھا۔ اب میں اِسی شرط پر سب کچھ بھلا سکتی ہوں کہ تم اور ناگ رانی ایک ایک ہاتھ اور پیر میرے حوالے کر دو!" راج کماری ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔

میرا سر چکرا گیا۔ میں سوچ بھی نہ سکا کہ وہ ایسی کڑی شرط پیش کر دے گی!

"یہ تمہارا عہد تھا!" راج کماری کی آواز میں چیلنج تھا۔

"مجھے منظور ہے!" ناگ رانی کی آواز اُبھری۔

"میں زبان ہار چکا ہوں راج کماری!" میں نے بوجھل آواز میں کہا

راج کماری زور سے ہنس پڑی۔ پھر اُس نے اپنے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکالنی شروع کر دیں یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے سینکڑوں بلائیں آپس میں برسرِ پیکار ہو گئی ہوں۔

اِن بھیانک آوازوں کے ساتھ ہی میرے بائیں ہاتھ اور بائیں ٹانگ میں درد کی ہلکی ہلکی اور میٹھی سی لہر سرایت کرنے لگی اور ذہن پر غنودگی چھانے لگی۔

یہ کیفیت نہ جانے کتنی دیر قائم رہی۔ جب آہستہ آہستہ میرے ذہن کا غبار چھٹا تو میں نے خود کو سخت زمین پر محسوس کیا۔ آنکھیں کھولیں تو ہر طرف گھوا اندھیرے کی حکمرانی تھی اور فضا سانپوں کی ہولناک پھنکاروں سے لرز رہی تھی۔ ان آوازوں کی گونج سے معلوم ہو رہا تھا کہ میں اِس وقت کسی تنگ پہاڑی غار یا درّے میں موجود ہوں!

میں نے ہڑبڑا کر اُٹھنا چاہا تو انکشاف ہوا کہ میں اپنے بائیں ہاتھ اور پیر سے معذور ہو چکا ہوں!

"میں بھی معذور ہو چکی ہوں سلطان جی" مجھے اپنے قریب ہی ناگ رانی کی دبی دبی سرگوشی سُنائی دی۔ "انسانی روپ میں یہ عیب سدا میرے ساتھی رہیں گے۔ تم اجازت دو تو میں اپنے اصل روپ میں آجاؤں"

"آجانا" میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا "لیکن اِس وقت ہم کہاں ہیں؟"

"زیادہ نہ بولو۔" اچانک راج کماری کی ہیجان آمیز آواز اُبھری "اِس وقت ہم پوجا گھاٹی کے ایک پہاڑ کی ڈھلان پر ہیں، بس تم ناگ رانی کا منکا سنبھالے رہو، ناگ بھون میں اب بڑا کٹھن وقت شروع ہونے والا ہے۔"

میں خاموشی سے اپنی جگہ پر دُبک گیا۔!

ناگ بھون ظلمات کی ڈراؤنی چادر میں لپٹا ہوا تھا، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی دینا دشوار تھا۔ فضا میں رچی ہوئی بدبودار سیلن کے ساتھ ہی خنکی کی لہر ہڈیوں میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔ نہ جانے یہ آنے والے لمحات کا خوف تھا یا وہاں واقعی سردی ہو چلی تھی! قریب اور دور سے اُبھرنے والی سانپوں، ناگوں اور اژدہوں کی غضبناک پھنکاریں، وحشتناک سیٹیاں اور خوف آور سرسراہٹیں اِس مہیب اندھیرے میں موت کے پسینوں میں نہلائے دے رہی تھیں، میرا سارا بدن سردی کے احساس کے باوجود پسینوں میں شرابور تھا۔ دل کی دھڑکنیں کھوپڑی میں دھمک رہی تھیں، کنپٹیوں اور آنکھوں میں چنگاریوں کے چٹخنے کا احساس ہو رہا تھا اور وقت گویا ایک ہی نقطے پر منجمد کر رہ گیا تھا!

میں انتظار کی صبر آزما گھڑیوں سے گزر رہا تھا کہ ناگ بھون کے کسی دور دراز گوشے سے پھنکار کی ایک دھیمی مگر سب سے نمایاں آواز بلند ہوئی جو بتدریج اونچی ہوتی جا رہی تھی!

اِس آواز کے گونجتے ہی ناگ بھون کی فضا میں مہیب سناٹا چھا گیا۔ سرسراتی، کلبلاتی اور پھنکارتی ہوئی جہنمی مخلوق کی بے شمار آوازیں یوں یکلخت خاموش ہو گئیں جیسے وہاں موت کی

حکمرانی ہو چکی ہو۔ اِس سکوتِ مرگ میں ناقابلِ بیان اذیت کا تاثر تھا اور اس مہیب سکوت میں وہ اکلوتی پھنکار اپنا تسلسل توڑے بغیر بلند سے بلند تر آہنگ اختیار کئے جا رہی تھی!

چند ہی ثانیوں میں وہ پھنکار اتنی تیز اور گونجیلی ہو گئی کہ میرے بدن کا رواں رواں جھنجھنا اُٹھا۔ سینکڑوں ہوائی جہازوں کے طاقتور انجنوں کی ہم آہنگ غراہٹ سے کہیں زیادہ پُرشور وہ پھنکار کافی دیر تک گونجتی رہی اور پھر یک بیک معدوم ہو گئی۔

وہ آواز تھم گئی لیکن کوئی نئی آواز نہ اُبھری۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ناگ بھون میں زندگی مفقود ہو چکی ہو۔ کائنات گردش کرتے کرتے یک بیک تھم گئی ہو۔ پھر کہیں کہیں سے اِکا دُکا سہمی سہمی پھنکاریں اُبھریں اور ناگ بھون کی فضائیں اپنے باسیوں کی مانوس لیکن خوف آور آوازوں سے جاگ اُٹھیں۔

"یہ ناگ پوجا کا اعلان تھا۔" راجکماری مسرت سے کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "اب چھپ کر نہیں، ڈنکے کی چوٹ پر مقابلہ ہو گا۔ میں بھی ناگ بھون کی شاہی نسل سے ہوں۔ ناگ بھون کی حکومت پر میرے اور ناگ راجہ کے حق کا فیصلہ ناگ دیوتا کرے گا اور وہ خوب جانتا ہے کہ ناگ راجہ نے اپنی عیاشی کی خاطر ایک عورت کو ناگ بھون میں لا کر نسلوں سے چلی آنے والی روایت توڑی ہے... چلو اب گھاٹی میں اترو!"

ناگ پوجا کی خبر سن کر میرا دل دھک سے رہ گیا اور میری نگاہوں میں جل منڈل میں ہونے والی اگن پوجا کے خوفناک اور پُرہیبت مناظر گھوم گئے۔ مجھے ناگ رانی سے معلوم ہو چکا تھا کہ ناگ بھون میں ہر ہزار برس کے بعد ناگ دیوتا کی پوجا ہوتی ہے جو جل منڈل میں اگن ناگ کے نام سے پوجا جاتا تھا۔ آگ کے فلک بوس الاؤ میں سے نکلنے والے زندہ آتشی ناگ کا تصور ذہن میں آتے ہی میں لرز اُٹھا۔ اتنا تو مجھے پہلے ہی اندازہ ہو چکا تھا کہ راج کماری اور ناگ راجہ کی اقتدار کی جنگ میں شاید ستارہ کا مقدر گردش میں آ جائے اور اب تو مجھے کافی حد تک یقین ہو چلا تھا کہ ناگ پوجا کے موقع پر شاید مجھے یا ستارہ کو ہی بھینٹ چڑھا دیا جائے!

"راجکماری! میرا بچہ کس حال میں ہے، ستارہ اب کیسی ہے؟" میں نے اُس کے بازو کے سہارے اُٹھتے ہوئے بے چینی کے ساتھ سوال کیا۔

"ناگ پوجا تک وہ دونوں محفوظ ہیں، پوجا کا اعلان ہونے کے بعد ناگ بھون میں سارے کام اور فیصلے چھوڑ دیے جاتے ہیں، ناگ راجہ اب کچھ نہ کر سکے گا۔" وہ مجھے سہارا دے کر اپنے ایک ساتھی کی پشت پر سوار کراتے ہوئے بولی۔

"تو کیا راجہ کو ناگ پوجا کا علم نہیں تھا؟" میں نے قدرے متحیرانہ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔ پوجا کے وقت کا علم صرف پروہت کو ہوتا ہے اور اعلان ہوتے ہی پوجا کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔" راج کماری بولی۔

"تو اب ناگ راجہ ہم پر بھی وار نہ کر سکے گا۔۔؟" میں نے چند ثانیوں کے سکوت کے بعد پوچھا۔

"نہیں۔ میرے حامیوں پر وہ وار نہ کر سکے گا، میں بہت پہلے اس سے راج لینے کا دعویٰ کر چکی ہوں۔ راج کے حقداروں میں جنگ نہیں ہوتی۔ اُن کا فیصلہ ناگ دیوتا ہی کرتا ہے۔"

میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ اب میں ناگ بھون میں کم از کم آزادانہ نقل و حرکت پر تو قادر ہو چکا تھا۔ اِس وقت پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ راجکماری کی حمایت حاصل کر کے میں نے کس قدر دانشمندانہ قدم اُٹھایا تھا!

ڈھلواں پہاڑی راستوں کے تاریک پیچ و خم سے گزرتے ہم کافی دیر تک پوجا گھاٹی کی جانب اُترتے رہے۔ اِس وقت ناگ رانی اپنے اصل روپ میں زمین پر رینگ رہی تھی۔ اس کے علاوہ راج کماری کے ہمراہ سینکڑوں ناگوں کا ایک کارواں تھا جو اس کا حامی تھا۔

ابھی ہم پوجا گھاٹی سے دور ہی تھے کہ یک بیک پورا ناگ بھون روشنی سے منور ہو گیا۔ ناگ پوجا کی روایات کے مطابق ایک ہزار برس تک گھور اندھیرے میں لپٹے رہنے کے بعد ناگ بھون پوجا کے موقع پر پُراسرار قوتوں کے زیرِ اثر خود بخود روشنی میں نہا گیا تھا!

روشنی پھیلتے ہی ایک جانب سے دو سبز سانپ کالے پتھر کی چٹانوں پر سرسراتے ہوئے راج کماری کی طرف آئے اور اپنے پھن اُس کے قدموں پر رکھ کر دھیمے دھیمے پھنکاریں مارنے لگے۔ راج کماری اس طرح کان جما کر اُن کی آوازیں سنتی رہی جیسے اُن کا مفہوم سمجھ رہی ہو، جب وہ خاموش ہو گئے تو اُس نے اپنے ہونٹ سکوڑے اور پھر اُس کے دہانے سے بھی سانپوں کی کراہت آمیز پھنکاریں خارج ہونے لگیں۔ راج کماری کے خاموش ہوتے ہی وہ دونوں سخت اور بدوضع جھاڑیوں میں روپوش ہو گئے۔

"پوجا گھاٹی میں ناگ راجہ میرا انتظار کر رہا ہے، وہ پوجا سے پہلے مجھ سے کوئی بات کرنی چاہتا ہے۔" میرے پوچھنے سے قبل ہی

راج کماری بول پڑی۔

یہ خبر پاکر میرا ماتھا ٹھنکا۔ ان دونوں میں صلح ہونے کے بعد میری رہائی، ستارہ کی آزادی اور زندگی کی ہر اُمید مفقود ہو جاتی۔ لیکن میں نے اپنے شبہات کا اظہار نہیں کیا اور راج کماری کے قوی ہیکل ساتھی کی پشت پر سوار ڈھلان سے نیچے اُترتا رہا۔!

روشنی کے باعث اب میں پہلی بار ناگ بھون کو تفصیل سے دیکھ سکتا تھا۔

ناگ بھون کی زمین، اُس کے پتھر اور مٹی بالکل سیاہ یا سیاہی مائل تھی۔ پتھروں کی نکیلی دھاریں اپنی تراش کے اعتبار سے غیر قدرتی معلوم ہوتی تھیں لیکن ان کی کثرت سے یہ خیال غلط ثابت ہوتا نظر آتا تھا۔ اس زیرِ زمین غار کی وسعت کا اندازہ لگانا دشوار ہی نہیں ناممکن تھا۔ کالی کالی چٹانوں اور نیلاہٹ مائل جنگلات کا سلسلہ حدِ نظر تک پھیلا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس ہیبت ناک غار کی بلندی اکثر مقامات پر ڈیڑھ دو سو فٹ سے بھی متجاوز نظر آرہی تھی اور اوپری حصے میں بے شمار چٹانیں اتنے خطرناک طریقے سے لٹکی ہوئی تھیں کہ اُن کے سائے میں سے گزرتے ہوئے دہشت محسوس ہوتی تھی۔ زمین کا بیشتر حصہ سیاہی مائل نیلے درختوں اور جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ زیادہ تر درختوں کی بلندی آٹھ دس فٹ سے زیادہ نہیں تھی لیکن اُن کا پھیلاؤ بلندی کے اعتبار سے کئی گنا زیادہ تھا۔ درختوں کے کھوکھلے تنوں میں سے جا بجا ناگ اور سانپ باہر آتے نظر آرہے تھے زمین پر بھی ہر طرف بھانت بھانت کے سانپوں کی ریل پیل تھی۔ اُن میں ہر رنگ، ہر نسل اور ہر جسامت کا سانپ موجود تھا!

کافی دیر کے مشقت آمیز سفر کے بعد ہم پہاڑی ڈھلان پر اُگے ہوئے گھنے جنگلات کو عبور کرکے نچلی گھاٹی میں پہنچے تو وہاں پہلے ہی سانپوں کے اس ہجوم میں دُور ہی سے مجھے ستارہ کی ایک جھلک نظر آئی۔ وہ سفید رنگ کے باریک لبادے میں لپٹی ایک اونچے پتھر پر بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی جیسے اپنے حواس میں نہ ہو۔

اُس کے قریب ہی ایک تنومند نوجوان بڑی بے چینی کے ساتھ ٹہل رہا تھا۔ مجھے یہ قیاس کرنے میں کوئی دُشواری نہیں ہوئی کہ وہی ناگ راجہ ہے!

راج کماری اور اُس کے کارواں کو دور سے دیکھتے ہی وہ دوڑتا ہوا ہماری جانب آیا۔ قریب آکر اُس نے نہایت خوشامدانہ انداز میں راج کماری سے چند رسمی فقرے کہے، لیکن جوں ہی اُس کی نظر مجھ پر پڑی اُس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"تو اس بار یہ مکار تیری پناہ میں ہے"۔ ناگ راجہ کینہ توز نگاہوں سے میری جانب گھورتا ہوا بولا "ناگ رانی کو برباد کرنے کے بعد اس نے تجھے اپنے جال میں پھانسا ہے۔!"

"تو نے کس لئے مجھے بلایا ہے؟" راج کماری نے اُس کے تبصرے کو نظرانداز کرتے ہوئے سرد اور جذبات سے عاری آواز میں سوال کیا۔

"ناگ پوجا کا اعلان ہو چکا ہے!" ناگ راجہ معنی خیز لہجے میں بولا

"ہاں تیرے اور میرے فیصلے کا وقت آپہنچا ہے!" راجکماری کا لہجہ سرد ہی رہا۔

"وہ تو اپنے وقت پر ضرور ہوگا" ناگ راجہ قدرے جھلا گیا۔

"پوجا پر بھینٹ بھی دی جاتی ہے۔ میں نے اسی کے لئے تجھے بلایا تھا۔"

"کیا مجھے بھینٹ دینے کا ارادہ ہے؟"

"نہیں!" ناگ راجہ نے تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا اور اُس کی نگاہیں مجھ پر جم گئیں۔ "اس کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے۔!"

راج کماری زور سے ہنسی "اس بار تو مجھے تیری بھینٹ چڑھتی نظر آرہی ہے"۔

"سُن راج کماری!" ناگ راجہ یک بیک غضبناک ہو گیا۔ "اگر تو نے سلطان کو میرے حوالے نہیں کیا تو پھر مجھے اُس کی بیوی کو بھینٹ چڑھانا پڑے گا... اور میں اپنے دل پر جبر کرکے یہ بھی کر گزروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔!" راجکماری یک بیک سنجیدہ ہو گئی۔ "کہو سلطان جی تمہارا کیا خیال ہے؟" اُس نے یہ کہتے ہوئے ناگ راجہ سے نظریں بچا کر مجھے اشارہ کیا۔

اِس صورتحال پر میں بوکھلا اُٹھا۔ نہ جانے راج کماری کے اشارے کے کیا معنی تھے۔ میں ہکا بکا نظروں سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ جب چند ثانیوں تک میری جانب سے کوئی جواب نہ ملا تو راج کماری خود ہی بول پڑی۔ "ٹھیک ہے راجہ جی!" اُس کا لہجہ طنز آمیز تھا۔ "میں سلطان کو تیرے حوالے کرتی ہوں!"

"اور اسے ناگ رانی کا منکا بھی میرے حوالے کرنا ہوگا" ناگ راجہ نے اگلی شرط پیش کی۔

"یہ نہیں ہوگا ... تو اس طرح ناگ رانی کو بھی بے بس کرکے اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا ہے۔!"

"خیر وہ میں دیکھ لوں گا۔۔۔ ناگ رانی زیادہ عرصے مجھ سے نہ بچ سکے گی، ناگ پوجا کے بعد مجھے ناگ بھون میں اپنے دشمنوں کا صفایا کرنا ہوگا۔"

"کون جانتا ہے کہ یہ کام کرنے کے لئے تو زندہ بھی رہتا ہے یا نہیں!" راج کماری نے استہزائیہ ہنسی کے ساتھ کہا اور پھر اُس کے اشارے پر مجھے ناگ راجہ کے قدموں میں زمین پر ڈال دیا گیا۔ اسی وقت راج کماری کے ساتھ آئے ہوئے کارواں کی ایک پُرشکوہ سفید ناگن نے زمین پر تڑپ کر کوشیلا کا روپ اختیار کرلیا۔

راج کماری اور ناگ راجہ دونوں ہی حیرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگے اور وہ بے چاری ایک ٹانگ سے لڑکھڑاتی ہوئی زمین سے اُٹھ گئی۔!

جوں ہی میری اور ناگ رانی کی نگاہیں چار ہوئیں، مقناطیسی لہروں کا ایک نادیدہ جال میرے ذہن پر حاوی ہونے لگا اور میں نیم غنودگی کی کیفیت سے دوچار ہوگیا۔ جل منڈل کے سفر کے دوران خیالات کے باہمی تبادلے کے مرحلوں پر اکثر میں اس صورتحال سے دوچار ہوچکا تھا، اس لئے مجھے کوئی تشویش لاحق نہیں ہوئی۔

چند ہی ثانیوں میں ناگ رانی کی مقناطیسی آنکھوں کے ذریعے اُس کے اَن کہے خیالات مجھ تک پہنچنے لگے اور جب اُس نے میری طرف سے اپنی نظریں ہٹائیں تو میری بہت بڑی پریشانی دُور ہوچکی تھی اور میں خود کو ناگ راجہ کے حوالے کئے جانے کے بارے میں مطمئن ہوچکا تھا۔

ناگ راجہ نے تالی بجا کر ایک طاقتور ناگ کو طلب کیا اور وہ مجھے اپنے کنڈل میں جکڑ کر خراماں خراماں اُس طرف لے چلا جہاں ناگ پوجا کے انتظامات زور شور کے ساتھ جاری تھے۔! ناگ راجہ نے ایک بار راج کماری اور اُس کے ہمراہیوں پر حقارت آمیز نظر ڈالی اور وہ بھی اسی طرف چل پڑا۔

مجھے اس سیاہ چٹان کے قریب لے جاکر اُس ناگ نے آزاد کردیا جس پر میری محبوب بیوی ستارہ غفلت کے عالم میں بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔

میری محبوب بیوی میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ اجنبی اور پُراسرار دنیا کی غیر انسانی قوتیں اس پر قابض تھیں اور اب میں بھی اُن کے چنگل میں پھنس چکا تھا۔ ناگ بھون سے نجات اور اپنی آزاد دنیا کی فضاؤں کا تصور ایک بھولے ہوئے خواب کی طرح میرے ذہن میں گھوم رہا تھا۔

میں گو اِس وقت معذور تھا لیکن ستارہ پر نظر پڑتے ہی میں فرطِ جوش سے دیوانہ ہوگیا اور بے اختیار اس چٹان سے لپٹ کر ستارہ کے پہلو میں پہنچ گیا جس پر وہ بیہوش پڑی ہوئی تھی۔

وہ حُسن کی دیوی اِس وقت تقدس اور پاکیزگی کا لازوال پیکر نظر آرہی تھی۔ سفید لبادے میں لپٹا ہوا اُس کا حسین چہرہ ملکوتی عظمت اور جلال کا مظہر نظر آرہا تھا۔ اُس کے بھرے بھرے رخساروں پر دمکنے والی حیات آفریں سُرخی اب نقاہت کی سفیدی میں بدل چکی تھی۔ ناگ بھون کی فضاؤں میں اُس پر جو ستم ڈھائے گئے اُن کی پوری کہانی اُس کے رنگ اور روپ کی تبدیلیوں میں نمایاں تھی۔

میں اُس کے قریب موجود تھا لیکن وہ ہوش و حواس کی دنیا سے روٹھ کر شاید سپنوں کی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی، اُس کی حالت اور اپنی بے بسی کا احساس ہوتے ہی میرے دل پر گھونسہ سا لگا اور میں بے اختیار اُسے پکار کر اُس سے لپٹ پڑا۔

لیکن ستارہ کہاں۔۔۔ میرا ہاتھ اس سیاہ چٹان پر پڑا، ستارہ کسی غیر مرئی سائے کی طرح یک بیک وہاں سے غائب ہوچکی تھی!

"ستارہ۔۔۔ میری ستارہ!" میں نے اپنے سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ سے بے چین ہوکر والہانہ انداز میں اُسے پکارا لیکن میری زخمی ہوئی آواز بے شمار سانپوں کی خوف آور پھنکاروں میں معدوم ہوکر رہ گئی۔ ناگ بھون کے درودیوار کی بے رحمی میری آواز کا مذاق اُڑا رہی تھی!

میری بے چین اور پیاسی نگاہیں سنگلاخ اور سیاہی مائل چٹانوں سے ٹکراتی اِدھر اُدھر بھٹکتی رہیں، لیکن وہاں نہ ستارہ کا پتہ تھا نہ میرے معصوم جگر گوشے کا نشان!

بے بسی کے شدید احساس نے مجھے دل گرفتہ کردیا اور میں اپنا سینہ تھام کر اس چٹان سے نیچے لڑھک آیا جس پر میں نے ستارہ کو دیکھا تھا۔ نیچے گرتے ہوئے میری کھوپڑی کا عقبی حصہ زمین سے ٹکرایا۔ ناقابلِ برداشت درد کی ایک ٹیس میری کھوپڑی کے عقبی حصے سے طلوع ہوکر اعصاب پر چھاتی چلی گئی اور میں ایک گھٹی گھٹی سی چیخ مار کر بے ہوشی کی شفیق آغوش میں کھو گیا جہاں نہ ناگ بھون کی بھیانک سرزمین تھی اور نہ اس اجنبی دنیا کے بے رحم باسی مجھے پریشان کرسکتے تھے۔!

میں نہ جانے کتنی دیر تک اسی حالت کا شکار رہا پھر آہستہ آہستہ میرے کانوں میں سنکھ کی مہیب آواز گونجنے لگی جیسے کوئی تندرست

کی چھوٹی سی تھیلی تھی۔ "لاش پر پہلے کس کی نظر پڑی؟" اُس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"اِن لڑکوں کی۔" اسپنس نے دو لڑکوں کی طرف اشارہ کیا۔ اِن کی عمر تقریباً ۱۲ سال تھی اور وہ بدرنگ پتلونوں میں ملبوس شیشم کے ایک بڑے درخت کے تلے کھڑے تھے۔

کمشنر دلدل سے بچتا بچاتا خشک زمین پر پاؤں رکھتا اُن کی جانب احتیاط سے بڑھا تاکہ جوتے کیچڑ میں پھنس نہ جائیں، وہ چند لمحے لڑکوں کے سامنے بڑے دبدبے سے کھڑا انھیں اچھی طرح دیکھ لینے کا موقع دینے لگا۔ پھر پوچھا: "تم یہاں دلدل میں کیا کر رہے ہو؟"

"ہم پانی کا سانپ پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔" ایک لڑکے نے جواب دیا۔

سام نے سر ہلایا۔ بیس سال پہلے وہ بھی اسی طرح دلدل میں سانپ کا پیچھا کیا کرتا تھا۔ اُس زمانے میں اس قسم کے بارہ چودہ انچ لمبے بے ضرر سانپ کو کسی ہم جماعت کے ڈیسک میں چھوڑ دینے میں بڑا لطف آتا تھا۔

"تم اسے پکڑ کر کیا کرتے؟" سام نے پوچھا۔

لڑکوں نے خفت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اور دونوں میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔

"اچھا، اسے چھوڑو۔" سام نے کہا اور رومال نکال کر اپنے اوپر کے ہونٹ سے پسینے کے چند قطرے خشک کیے "تم نے اس بوڑھے کو کتنی دیر پہلے دیکھا؟"

"آپ کے آنے سے کوئی آدھ گھنٹے پہلے۔" ایک بولا

"ہاں صاحب۔ اتنا ہی وقت ہوا ہے۔" دوسرے نے اس کی تائید کی۔ "جوں ہی ہم نے اسے یہاں پڑا دیکھا اور اس کے سر پر گانٹھ دیکھی ہم دوڑ کر سڑک پر گئے اور شہر کی طرف بھاگے۔ ہم آدھ میل تک گئے تھے کہ سامنے سے ڈپٹی کمشنر صاحب کی گاڑی آئی۔ ہم نے اسے روکا اور لاش کے بارے میں بتایا۔ وہ ہمیں کار میں یہاں لے آئے تاکہ لاش کو دیکھیں۔ اس کے بعد آپ آگئے۔"

سام نے جیب سے ایک پرانے فیشن کی گھڑی نکالی اور حساب لگایا کہ اسے جیل خانے سے چل کر یہاں پہنچنے میں کُل پینتیس منٹ لگے تھے یہ بھی بڑا اچھا ہوا۔ اُس نے سوچا۔ اگر یہ سانپ کے رسیا لڑکے لاش کو نہ دیکھ لیتے تو کل صبح تک اُس کا پتہ نہ چلتا۔ گھر والے اس کی گمشدگی سے پریشان ہوتے اور اُسے تلاش کیا جاتا۔ تب کہیں جا کر اُس کی لاش ملتی۔ صبر آزما کھینچ تان سے جان بچ گئی۔

سام مڑ کر اسپنس کے پاس گیا اور بولا: "گاڑی سے رسّی نکال کر سارے علاقے کے گرد حصار کھینچ دو اور یہیں ٹھہرو۔ میں جیل میں فون کر کے کوسی سے کہتا ہوں کہ ہسپتال میں اطلاع کر دے۔ ڈاکٹر فری مین جلد ہی پہنچ جائے گا۔" پھر اُس نے لڑکوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"ان دونوں کے نام معلوم کیے؟"

"جی ہاں۔" اسپنس نے جواب دیا۔

"میں ابھی آجاؤں گا۔" سام نے کہا اور کار کی طرف جاتے ہوئے دونوں لڑکوں کی طرف ہاتھ ہلا کر بولا: "آؤ بچو! تمہیں پولیس کار کی ایک بار پھر سیر کراؤں۔" اُس نے لڑکوں کو اُن کے گھروں پر لے جا کر چھوڑنے سے پہلے ریڈیو پر گشتی پولیس کے سربراہ کیپٹن لیسٹر کرین سے رابطہ قائم کیا۔ کرین کو وہ بیس سال سے جانتا تھا۔ وہ نہایت محنتی تھا اور پورا پورا تعاون کرتا تھا۔

"کرین! ایک قتل ہو گیا ہے اور معلوم ہوتا ہے اسے ایک آدھ گھنٹے سے زیادہ عرصہ نہیں گذرا ہے۔ کیا تم جلدی سے ہائی وے کی دونوں طرف سے ناکہ بندی کر کے ٹریفک کو چیک کر سکتے ہو؟"

"ضرور۔ ابھی لیجیے۔" کرین نے جواب دیا: "ایک منٹ ٹھہریے۔" اُس کا منہ ٹرانسمیٹر سے ہٹ گیا اور سام نے اُسے اپنے ماتحت عملے کو ہدایت دیتے سُنا۔ پھر اُس نے اونچی آواز میں سام سے کہا: "کس کا قتل ہوا ہے؟"

"ایک بوڑھا ہے۔ نام جیسپر ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے اسکے سر پر پیچھے سے ضرب لگائی ہے۔ دو لڑکوں نے لاش کو دلدل کے کنارے پڑا پایا ہے۔"

"کیا اسے لوٹ کر قتل کیا گیا ہے؟"

"میرے خیال میں یہ بات نہیں ہے کرین! اس کے پاس تھا ہی کیا! ساری پونجی اُس کے پاس ہی ہے۔"

"کوئی عینی شاہد بھی ہے؟"

"مجھے تو کوئی ملا نہیں۔" سام نے کہا: "تمہارے آدمی یہاں معائنے کے لیے آئیں گے نا؟"

"کیوں نہیں!" کرین بولا: "اور وہ کس مرض کی دوا ہیں!"

کیپٹن کرین سے بات کرنے کے بعد سام نے دونوں لڑکوں کو اُن کے گھروں پر لے جا کر چھوڑا۔ دونوں شہر کے سرے پر ایک ہی گلی میں رہتے تھے۔ پہلے تو اُس نے سوچا کہ انھیں لاش کے بارے

میں کسی کو بتانے سے منع کر دے پھر اپنا ارادہ بدل دیا کہ اس سے فائدہ کوئی نہیں۔ بات تو جنگل کی آگ کی طرح شہر میں پھیل ہی جائیگی۔ ان لڑکوں کو بھی تھوڑی سی اہمیت مل جائے تو کیا حرج ہے! اس نے ان سے کہا:

"اپنے گھر والوں کو بتا دینا کہ کیا ہوا ہے اور کہنا کہ میں یا ڈپٹی کمشنر پولیس مسٹر اسپنس کل کسی وقت بھی آئیں گے اور تم لوگوں کا بیان لیں گے۔"

"کیسا بیان؟" ایک نے پوچھا۔

"یہی کہ تم نے کیا دیکھا وغیرہ۔" اُس نے کار کا دروازہ کھول کر انھیں اُتارا۔ اور بولا: "اچھا اب گھر بھاگو۔"

لڑکے بھاگ کھڑے ہوئے تو اُس نے کار اسٹارٹ کی اور ہائی وے کی طرف ہولیا۔ کار چلاتے ہوئے اُس نے لوسی لیک سے ریڈیو پر رابطہ قائم کیا۔ لوسی، پولیس کمشنر کے دفتر میں اس وقت سے ریڈیو آپریٹر تھی جب سام پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔

"قتل ہوگیا ہے لوسی!" لوسی کے جواب دینے پر اُس نے بتایا۔ پھر اُسے ساری تفصیل بتائی۔ اسپنس کے بارے میں بتایا کہ وہ کہاں ہے اور کہا کہ ڈاکٹر فری مین کو مطلع کر دے۔ ان احکامات سے فارغ ہو کر اُس نے پوچھا کہ کیا وہ جیسپر کو جانتی ہے۔ لوسی اس چھوٹے سے شہر کے ہر آدمی کو جانتی تھی۔

"ہاں۔ ایک جیسپر ہے تو سہی!" وہ کچھ سوچتی ہوئی بولی: "اُس کی پوتی کی شادی بلارڈ کے لڑکے سے ہوئی ہے۔ میاں بیوی سال بھر سے بڈھے میاں کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔" لوسی نے اپنی اہمیت کو برقرار رکھنے کے لئے چند لمحے توقف کیا پھر کہنے لگی: "میرا خیال ہے لڑکے کے جیل سے رہا ہوتے ہی دونوں میاں بیوی بوڑھے کے ہاں اُٹھ آئے تھے۔"

سام نے ایک گہری سانس لی اور بولا: "کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ہم دونوں کو اپنی ڈیوٹیاں بدل لینی چاہئیں، لوسی! اچھا یہ لڑکا کس جیل کیوں گیا تھا؟"

لوسی کہنے لگی: "میں نے سُنا ہے کہ وہ اور ایک دوسرا لڑکا کپاس سے بھرا ہوا ایک ٹرک لے کر فرار ہوگئے تھے اور کپاس کو بیچ ڈالا تھا۔ اسے قید کی سزا ہوگئی تھی۔"

"اچھا۔ اُس کے ریکارڈ کی چھان بین کر کے مجھے بتانا اور پھر جیل کے وارڈن لیوس سے معلوم کرنا کہ اُس کا چال چلن کیسا رہا۔" وہ رُک کر سوچنے لگا کہ بات پوری ہوئی یا نہیں۔ پھر بولا: "بس اتنا ہی کافی ہے۔ یہ جیسپر کا مکان ویلز روڈ پر ہے نا؟"

"جی ہاں۔" لوسی نے جواب دیا۔

"میں تم سے پھر بات کروں گا" سام نے کہا اور بات ختم کردی۔

اُس نے ہائی وے پر پہنچ کر کار کا رُخ ویلز روڈ کی [طرف موڑ دیا] اور کار کی رفتار تیز کر دی۔ آدھ میل جا کر اُس نے کار ایک چھوٹی سڑک پر ڈال دی اور ہائی وے سے کوئی سو گز پرے ایک چھوٹے رنگ و روغن مکان کی سمت میں ہولیا۔ اس کی چھت پھونس کی [تھی۔] لکڑی کے تختوں کا بنا ہوا برآمدہ ایک طرف جھکا ہوا تھا۔ مکان [کی ایک] طرف ترکاری کا چھوٹا سا باغیچہ تھا اور دوسری طرف ایک بنجر [قطعہ۔] اُس نے غالباً دس سال سے گھاس پات کی شکل نہیں دیکھی تھی۔

سام مکان کے سامنے جا کر رُک گیا۔ اُس نے کا[ر کا] دروازہ کھلا رہنے دیا اور پرلی طرف کھڑا ہو کر ہارن بجایا۔ کھلی [فضا میں] ہارن کی آواز چبھتی سی اور گونجتی ہوئی تھی، اور میدان میں [...] اُس کے بعد چھا جانے والے سکوت میں مکان کا جالی دار دروازہ ہوا کھلا اور ایک جوان عورت باہر نکل کر برآمدے میں آئی۔ اس [...] لیکن پُرکشش تھا، ننگے پاؤں تھی اور اسکا لباس مکان کی طرح [...]

"یہ جیسپر کا مکان ہے؟" سام نے کار کی چھت [...] کو نظروں میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

لڑکی نے سر کے اشارے سے ہاں کہا اور بولی [...]

ڈاکٹر ایم اے قریشی
کی ایک اور کتاب
شائع ہوگئی ہے
پُراسرار تحریریں
قدرتی شارٹ ہینڈ
جس میں حضرت جبرائیل نے حضرت آدم کو املاء [...]
علمِ رمل پر ایک بھرپور تحقیقی کتاب [...]
لاباب ادب ۵-اے ۲/۸ ناظم آباد کراچی

کی چھوٹی سی تھیلی تھی۔ لاش پر پہلے کس کی نظر پڑی؟" اُس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"ان لڑکوں کی" اسپنس نے دو لڑکوں کی طرف اشارہ کیا۔ اِن کی عمر تقریباً ۱۲ سال تھی اور وہ بدرنگ پتلونوں میں ملبوس شیشم کے ایک بڑے درخت کے تلے کھڑے تھے۔

کمشنر دلدل سے بچتا بچاتا خشک زمین پر پاؤں رکھتا اُن کی جانب احتیاط سے بڑھا تاکہ جوتے کیچڑ میں پھنس نہ جائیں، وہ چند لمحے لڑکوں کے سامنے بڑے دبدبے سے کھڑا انھیں اچھی طرح دیکھ لینے کا موقع دینے لگا۔ پھر پوچھا "تم یہاں دلدل میں کیا کر رہے ہو؟"

"ہم پانی کا سانپ پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔" ایک لڑکے نے جواب دیا۔

سام نے سر ہلایا۔ بیس سال پہلے وہ بھی اسی طرح دلدل میں سانپ کا پیچھا کیا کرتا تھا۔ اُس زمانے میں اس قسم کے بارہ چودہ انچ لمبے بے ضرر سانپ کو کسی ہم جماعت کے ڈیسک میں چھوڑ دینے میں بڑا لطف آتا تھا۔

"تم اسے پکڑ کر کیا کرتے؟" سام نے پوچھا۔

لڑکوں نے خفت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اور دونوں میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔

"اچھا، اسے چھوڑو۔" سام نے کہا اور رومال نکال کر اپنے اوپر کے ہونٹ سے پسینے کے چند قطرے خشک کیے "تم نے اس بوڑھے کو کتنی دیر پہلے دیکھا؟"

"آپ کے آنے سے کوئی آدھ گھنٹے پہلے۔" ایک بولا

"ہاں صاحب۔ اتنا ہی وقت ہوا ہے۔" دوسرے نے اس کی تائید کی۔ "جوں ہی ہم نے اسے یہاں پڑا دیکھا اور اس کے سر پر گانٹھ دیکھی ہم دوڑ کر سڑک پر گئے اور شہر کی طرف بھاگے۔ ہم آدھ میل تک گئے تھے کہ سامنے سے ڈپٹی کمشنر صاحب کی گاڑی آئی۔ ہم نے اسے روکا اور لاش کے بارے میں بتایا۔ وہ ہمیں کار میں یہاں لے آئے تاکہ لاش کو دیکھیں۔ اس کے بعد آپ آ گئے۔"

سام نے جیب سے ایک پرانے فیشن کی گھڑی نکالی اور حساب لگایا کہ اسے جیل خانے سے چل کر یہاں پہنچنے میں کُل پینتیس منٹ لگے تھے یہ بھی بڑا اچھا ہوا۔ اُس نے سوچا۔ اگر یہ سانپ کے رسیا لڑکے لاش کو نہ دیکھ لیتے تو کل صبح تک اُس کا پتہ نہ چلتا۔ گھر والے اس کی گمشدگی سے پریشان ہوتے اور اُسے تلاش کیا جاتا۔ تب کہیں جا کر اُس کی لاش ملتی۔ صبر آزما کھینچ تان سے جان بچ گئی۔

سام مڑ کر اسپنس کے پاس گیا اور بولا: "گاڑی سے رسّی نکال کر سارے علاقے کے گرد حصار کھینچ دو اور یہیں ٹھہرو۔ میں جیل میں فون کر کے لوسی سے کہتا ہوں کہ ہسپتال میں اطلاع کرے۔ ڈاکٹر فری مین جلد ہی پہنچ جائے گا۔" پھر اُس نے لڑکوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ "ان دونوں کے نام معلوم کیے؟"

"جی ہاں" اسپنس نے جواب دیا۔

"میں ابھی آجاؤں گا" سام نے کہا اور کار کی طرف جاتے ہوئے دونوں لڑکوں کی طرف ہاتھ ہلا کر بولا "آؤ بچو! تمہیں پولیس کار کی ایک بار پھر سیر کراؤں" اُس نے لڑکوں کو اُن کے گھروں پر لے جا کر چھوڑنے سے پہلے ریڈیو پر گشتی پولیس کے سربراہ کیپٹن بیسٹر کرین سے رابطہ قائم کیا۔ کرین کو وہ بیس سال سے جانتا تھا۔ وہ نہایت محنتی تھا اور پورا پورا تعاون کرتا تھا۔

"کرین! ایک قتل ہو گیا ہے اور معلوم ہوتا ہے اسے ایک آدھ گھنٹے سے زیادہ عرصہ نہیں گذرا ہے۔ کیا تم جلدی سے ہائی وے کی دونوں طرف سے ناکہ بندی کر کے ٹریفک کو چیک کر سکتے ہو؟"

"ضرور۔ ابھی لیجیے" کرین نے جواب دیا "ایک منٹ ٹھہریے" اُس کا منہ ٹرانسمیٹر سے ہٹ گیا اور سام نے اُسے اپنے ماتحت عملے کو ہدایت دیتے سُنا۔ پھر اُس نے اونچی آواز میں سام سے کہا: "کس کا قتل ہوا ہے؟"

"ایک بوڑھا ہے۔ نام جیسپر ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے اسکے سر پر پیچھے سے ضرب لگائی ہے۔ دو لڑکوں نے لاش کو دلدل کے کنارے پڑا پایا ہے۔"

"کیا اسے لوٹ کر قتل کیا گیا ہے؟"

"میرے خیال میں یہ بات نہیں ہے کرین! اس کے پاس تھا ہی کیا! ساری پونجی اُس کے پاس ہی ہے۔"

"کوئی عینی شاہد بھی ہے؟"

"مجھے تو کوئی ملا نہیں۔" سام نے کہا: "تمہارے آدمی یہاں معائنے کے لیے آئیں گے نا؟"

"کیوں نہیں!" کرین بولا: اور وہ کس مرض کی دوا ہیں!"

کیپٹن کرین سے بات کرنے کے بعد سام نے دونوں لڑکوں کو اُن کے گھروں پر لے جا کر چھوڑا۔ دونوں شہر کے سرے پر ایک ہی گلی میں رہتے تھے۔ پہلے تو اُس نے سوچا کہ انھیں لاش کے بارے

میں کسی کو بتانے سے منع کر دے پھر اپنا ارادہ بدل دیا کہ اس سے فائدہ کوئی نہیں۔ بات تو جنگل کی آگ کی طرح شہر میں پھیل ہی جائیگی۔ ان لڑکوں کو بھی تھوڑی سی اہمیت مل جائے تو کیا حرج ہے! اس نے ان سے کہا:

"اپنے گھر والوں کو بتا دینا کہ کیا ہوا ہے اور کہنا کہ میں یا ڈپٹی کمشنر پولیس مسٹر اسپنس کل کسی وقت بھی آئیں گے اور تم لوگوں کا بیان لیں گے۔"

"کیسا بیان؟" ایک نے پوچھا۔

"یہی کہ تم نے کیا دیکھا وغیرہ۔" اُس نے کار کا دروازہ کھول کر انھیں اُتارا۔ اور بولا: "اچھا اب گھر بھاگو۔"

لڑکے بھاگ کھڑے ہوئے تو اُس نے کار اسٹارٹ کی اور ہائی وے کی طرف ہو لیا۔ کار چلاتے ہوئے اُس نے لوسی لیک سے ریڈیو پر رابطہ قائم کیا۔ لوسی، پولیس کمشنر کے دفتر میں اس وقت سے ریڈیو آپریٹر تھی جب سام پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔

"قتل ہو گیا ہے لوسی!" لوسی کے جواب دینے پر اُس نے بتایا۔ پھر اُسے ساری تفصیل بتائی۔ اسپنس کے بارے میں بتایا کہ وہ کہاں ہے اور کہا کہ ڈاکٹر فری مین کو مطلع کر دے۔ ان احکامات سے فارغ ہو کر اُس نے پوچھا کہ کیا وہ جینیپر کو جانتی ہے۔ لوسی اس چھوٹے سے شہر کے ہر آدمی کو جانتی تھی۔

"ہاں۔ ایک جینیپر ہے تو سہی!" وہ کچھ سوچتی ہوئی بولی:

"اُس کی پوتی کی شادی بلارڈ کے اوکس خاندان میں ہوئی ہے۔ میاں بیوی سال بھر سے بڈھے میاں کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔" لوسی نے اپنی اہمیت کو برقرار رکھنے کے لئے چند لمحے توقف کیا پھر کہنے لگی: "میرا خیال ہے لڑکے کے جیل سے رہا ہوتے ہی دونوں میاں بیوی بڈھے کے ہاں اُٹھ آئے تھے۔"

سام نے ایک گہری سانس لی اور بولا: "کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ہم دونوں کو اپنی ڈیوٹیاں بدل لینی چاہئیں، لوسی! اچھا یہ اوکس جیل کیوں گیا تھا؟"

لوسی کہنے لگی: "میں نے سُنا ہے کہ وہ اور ایک دوسرا لڑکا کپاس سے بھرا ہوا ایک ٹرک لے کر فرار ہو گئے تھے اور کپاس کو بیچ ڈالا تھا۔ اسے قید کی سزا ہو گئی تھی۔"

"اچھا۔ اُس کے ریکارڈ کی چھان بین کر کے مجھے بتانا اور پھر جیل کے وارڈن لیوس سے معلوم کرنا کہ اُس کا چال چلن کیسا رہا۔" وہ رُک کر سوچنے لگا کہ بات پوری ہوئی یا نہیں۔ پھر بولا: "بس اتنا ہی کافی ہے۔ یہ جینیپر کا مکان ویلز روڈ پر ہے نا؟"

"جی ہاں۔" لوسی نے جواباً کہا۔

"میں تم سے پھر بات کروں گا" سام نے کہا اور بات ختم کر دی۔

اُس نے ہائی وے پر پہنچ کر کار کا رُخ ویلز روڈ کی طرف موڑا اور کار کی رفتار تیز کر دی۔ آدھ میل جا کر اُس نے کار ایک چھوٹی سی گرد آلود سڑک پر ڈال دی اور ہائی وے سے کوئی سو گز پرے ایک چھوٹے سے بے رنگ و روغن مکان کی سمت میں ہو لیا۔ اس کی چھت پھونس کی تھی اور لکڑی کے تختوں کا بنا ہوا برآمدہ ایک طرف جھکا ہوا تھا۔ مکان کے ایک طرف ترکاری کا چھوٹا سا باغیچہ تھا اور دوسری طرف ایک بنجر قطعہ زمین تھا اُس نے غالباً دس سال سے گھاس پات کی شکل نہیں دیکھی تھی۔

سام مکان کے سامنے جا کر رُک گیا۔ اُس نے کار سے اُتر کر دروازہ کھلا رہنے دیا اور پرلی طرف کھڑا ہو کر ہارن بجایا۔ کھلی فضا میں ہارن کی آواز چیختی سی اور گونجتی ہوئی تھی اور میدان میں پھیل کر کھو گئی اُس کے بعد چھا جانے والے سکوت میں مکان کا جالی دار دروازہ چیختا چلاتا ہوا کھلا اور ایک جوان عورت باہر نکل کر برآمدے میں آئی۔ اس کا چہرہ سادہ لیکن پُرکشش تھا۔ ننگے پاؤں تھی اور اسکا لباس مکان کی طرح بدرنگ سا تھا۔

"یہ جینیپر کا مکان ہے؟" سام نے کار کی چھت پر سے مکان کو نظروں میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

لڑکی نے سر کے اشارے سے ہاں کہا اور بولی: "جی ہاں

ڈاکٹر ایم اے قریشی

کی ایک اور کتاب

شائع ہو گئی ہے

پُراسرار تحریریں

* قدرتی شارٹ ہینڈ * وہ شارٹ ہینڈ جس میں حضرت جبرائیل نے حضرت آدم کو اماں حوا کا پتہ بتایا
* علم رمل پر ایک بھرپور تحقیقی کتاب * قیمت ۔/۵ روپے

احباب ادب اے ۵ = ۲/۸ ناظم آباد کراچی ۱۸

جناب! میں روزالی اوکس ہوں مسٹر جیسپر میرے دادا ہیں۔ کیا بات ہے؟"

"تمہارے اور تمہارے دادا کے علاوہ یہاں اور کون کون رہتا ہے؟" سام نے پوچھا۔

"صرف میرے شوہر ٹامی اوکس"

"ٹامی گھر پر ہیں؟"

"نہیں جناب۔ وہ کام پر گئے ہیں۔"

"وہ کہاں کام کرتے ہیں؟"

"آج کل پریسٹن کے قریب کام کر رہے ہیں جہاں مارکیٹ بن رہی ہے۔ بلو اسٹار سیمنٹ والوں کا بجری کا ٹرک چلاتے ہیں۔"

روزالی قدرے متوحش تھی۔ "آپ بتائیں گے نہیں کہ بات کیا ہے؟"

سام نے جالی دار دروازے پر آخری متجسس نظریں ڈالیں اور کار کے گرد گھوم کر اس کے قریب گیا۔ "روزالی!" اُس نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تمہارے لیے بُری خبر لایا ہوں۔ تمہارے دادا فوت ہو گئے ہیں۔"

روزالی کا چہرہ پیلا پڑ گیا اور اس کا نچلا ہونٹ کپکپانے لگا

"اُف! نہیں!" اُس نے پیچھے ہٹ کر دروازے کا سہارا لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا فوارہ اُبل پڑا۔ "میں نے اُن سے کتنی بار کہا تھا کہ اس گرمی میں زیادہ نہ چلا کریں۔ میں کہتی رہی کہ اُن کا دل اسے برداشت نہیں کرے گا۔"

"یہ اُن کے دل کی بات نہیں ہے۔" سام نے آہستہ سے کہا۔

پھر اُس نے روزالی کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا: "کسی نے انھیں سر پہ ضرب لگائی۔"

روزالی کی آنکھیں پھیل گئیں اور اس کے سادہ سے، زرد چہرے پر بے یقینی دوڑ گئی۔ "انھیں مارا؟ آپ کا مطلب ہے کسی نے میرے دادا کو قتل کر دیا؟"

"کچھ یہی بات ہے۔" سام نے کہا: "ہمیں اُن کی لاش دلدل کے کنارے ملی۔ کچھ خیال ہے وہ وہاں کیا کرنے گئے تھے؟"

"صرف ٹہلنے گئے تھے، میرا تو خیال ہے۔" اُس نے بے بسی سے سر ہلا کر کہا: "روزانہ ٹہلنے جاتے تھے۔ گرمی ہو یا سردی یا بارش کے آثار ہوں انہیں اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ ٹہلنے وہ ضرور جاتے تھے۔ کہتے تھے کہ دن بھر بیٹھے رہنے کے علاوہ انسان کو کچھ اور بھی کرنا چاہیے۔ انھیں ہمیشہ یہی شکایت رہی کہ یہاں کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ بڑی کوشش کی کہ ٹامی کو خالی زمین پر کچھ اُگانے اور اس کے لیے کام کرنے پر آمادہ کر دیں اس طرح خود انھیں بھی اس کا ہاتھ بٹانے اور ہاتھ پاؤں ہلانے کا موقع مل جاتا۔ لیکن ٹامی۔ انھیں زمین سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ویسے بھی ہمیں یہاں زیادہ عرصہ نہیں رہنا ہے۔ ٹامی بلو اسٹار والوں کے ہاں صرف اس وقت تک کام کریں گے جب تک ہمارے پاس چار پیسے جمع ہو جائیں پھر ہم کیلی فورنیا چلے جائیں گے۔ ٹامی کا خیال ہے کہ انھیں وہاں بہت اچھی ملازمت مل جائے گی۔ یہاں رہ کر تو خاک ہاتھ نہ آئے گا۔" اُس کے سادہ چہرے پر بڑی دلکشی سے پیوست سیاہ آنکھیں سام کے چہرے کا جائزہ لینے لگیں۔ وہ بولی: "میرا خیال ہے ٹامی کا ریکارڈ آپ کے علم میں ہے۔"

سام نے سر کے اشارے سے ہاں کہا۔ "اب یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ٹامی کھیتی باڑی کا کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس کے اور تمہارے دادا کے درمیان کوئی اختلافات تھے؟"

"نہیں جناب۔ ایک بھی نہیں۔" روزالی نے زور دے کر کہا "ٹامی میرے دادا کو چاہتے تھے۔ تنخواہ ملنے پر سب سے پہلے اُن کے لیے تمباکو لاتے تھے اکثر شام کو اپنے ساتھ برآمدے میں بیٹھ کر تاش کھیلتے تھے۔ ارے ہاں۔ انھوں نے ایک بار تو یہ بھی کہا تھا کہ ہم دادا جان کو کیلی فورنیا اپنے ساتھ لے جائیں گے بشرطیکہ وہ جانا چاہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں نا، اُن کے خاندان میں صرف ہم دونوں ہی رہ گئے ہیں! میں اُن کی واحد رشتے دار ہوں" اُس نے بڑے دُکھ سے ایک ٹھنڈی سانس لی: "دادا بھلا ہمارے ساتھ جانے والے تھے! اس کا تو یہ مطلب ہوتا کہ یہ جگہ بیچ دینی پڑتی اور وہ یہ کام ہرگز نہ کرتے۔"

اُس نے گالوں پر بہتے ہوئے آنسو پونچھے "دنیا میں ایسا بھی کوئی ظالم ہے جس نے ایک ضعیف آدمی کو مار ڈالا"

سام نے نفی میں سر ہلایا اور بولا: "یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کچھ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں"۔ معاً اسے اس غریب اور سیدھی سادی عورت سے ہمدردی کا ایک گہرا احساس ہوا۔ اس نے کہا: "کچھ دیر بعد تمہارے دادا کو ہینیس کے قبرستان میں دفنانے کے لیے لے جایا جائے گا۔ میں تمہیں لے جانے کے لیے کار بھیجوں؟"

"نہیں، شکریہ۔ ٹامی اس وقت تک گھر آ جائیں گے۔ وہ مجھے ساتھ لے جائیں گے۔"

سام نے اُسے اپنے تھکے ہارے چھوٹے سے گھر کے دروازے پر کھڑا چھوڑا اور اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ ہو سکتا ہے بڈھے کے دفنائے جانے تک ٹامی گھر پہنچ جائے اور نہ بھی پہنچے۔ اس کا انحصار دو ایک باتوں کی چھان بین پر ہے۔ کار چلاتے ہوئے اُس نے ایک بات ذہن میں بٹھالی کہ اگر ٹامی گھر نہ لوٹ سکا تو وہ روزالی کو لینے کے لیے کار بھیج دے گا۔

ہائی وے پر آ کر اُس نے پریسٹن جانے کے لیے قریب ترین راستہ اختیار کیا۔ جہاں ٹامی کے ملنے کی توقع تھی۔ راستے میں اُس نے

کیپٹن کرین سے رابطہ قائم کیا۔" ناکہ بندی سے کچھ ملا کرین؟"

"صرف سیاحوں سے سامنا ہوا ہے۔" کرین نے بتایا۔" ایسا لگتا ہے کہ ساری دنیا فلوریڈا جا رہی ہے یا وہاں سے آرہی ہے۔ آپ کو کوئی بات معلوم ہوئی؟"

"کچھ امکان تو ہوا ہے۔" سام نے کہا۔" بڈھے کی پوتی کے شوہر پر شبہ ہے۔ ٹام اوکس سزا یافتہ ہے۔ مرحوم کی واحد رشتے دار یہ پوتی ہے۔ اُس کی جائیداد کی یہی اکیلی وارث ہے، بڈھے کی بیمے کی رقم بھی اسی کو ملے گی۔" "اچھا، ہمیں ہدایات دیتے رہیئے۔" کرین نے کہا۔ "گشتی گاڑی راستے میں ہے۔ تین گھنٹے میں چاروں طرف کا چکر ختم کرے گی۔"

سام نے لوسی سے دوبارہ رابطہ قائم کیا۔" سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو رہا ہے لوسی؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔" بڑھیا بولی۔" ڈاکٹر فری مین جا چکا ہے اُس نے مسٹر اسپنس سے بات کی ہے اور مجھ سے کہا ہے کہ لاش کو دفنانے کے لئے قبرستان میں ہلاری ہینیس کو بتا دوں۔ ہلاری ابھی کچھ دیر میں میت کی گاڑی کے ساتھ جائے گا۔ جیل کے وارڈن سے اوکس کے بارے میں ابھی معلوم نہیں ہوا ہے۔"

سام نے کہا۔" اچھا اب یہ کرو کہ کارپوریشن کے دفتر سے یہ معلوم کرو کہ جیسپر کی زمین کتنی ہے اور اس کی مالیت کیا ہو گی۔"

"اُس کی پوتی ہی وارث ہے نا!" لوسی نے پوچھا۔

"ابھی اس کی تصدیق کرانی ہے۔" سام نے کہا۔" بالکل خاموشی سے کرنا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اگر مجھ سے غلطی ہو جائے تو سارے شہر میں ڈھنڈورا پٹ جائے۔"

سام پندرہ منٹ بعد پریسٹن پہنچ گیا۔ مارکیٹ چوراہے سے پرلی طرف بن رہی تھی۔ تقریباً آدھی دکانیں تیار ہو چکی تھیں اور اُن کے پیچھے سیمنٹ کا پختہ راستہ کار پارکنگ کی جگہ تک جانے کے لئے بنایا جا رہا تھا۔ سام نے دیکھا کہ بلواسٹار والوں کے کئی ٹرک کھڑے ہوئے تھے اور ایک آدمی ان کی چیکنگ کر رہا تھا۔ سام نے کار سیدھے اُس کے قریب لے جا کر روکی۔

"تم بلواسٹار کے فورمین ہو؟"

"جی۔"

"میں پولیس کمشنر سام فاس ہوں۔ مجھے تمہارے ایک ڈرائیور کے بارے میں کچھ معلومات چاہئیں۔ اُس کا نام ٹامی اوکس ہے۔"

"کیا اُس نے کوئی گڑبڑ کی ہے؟"

"اگر تم اُس کے سارے دن کی مصروفیت بتا سکو تو سمجھو وہ محفوظ ہے۔"

فورمین نے اپنا رجسٹر بند کیا اور کہنے لگا۔" اُسے بجری لانے کے لئے یہاں سے جانا اور واپس آنا ہوتا ہے۔ یہ کوئی ایک گھنٹے کا کام ہے اور اس میں بجری بھرنا اور اُتارنا بھی شامل ہے۔ اب ٹرک کے رجسٹر کے مطابق اوکس نے پہلا چکر سات بجے لگایا تھا، دوسرا آٹھ بجے، تیسرا نو بجے اور دوپہر تک اسی طرح رہا۔ دوپہر کو اُس نے آدھ گھنٹہ کے لئے چھٹی کی اور کھانا کھا کر پھر اپنے کام پر لگ گیا۔ اس کا ایک چکر ساڑھے بارہ بجے، دوسرا ڈیڑھ بجے اور اسی طرح ہوتا رہا۔" فورمین نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔" اب وہ آخری چکر پر گیا ہے اور کوئی بیس منٹ میں یہاں پہنچ جائے گا اور پھر چھٹی کرے گا۔"

"کھانے کی چھٹی میں وہ کہاں جاتا ہے؟" سام نے پوچھا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتے۔" فورمین نے شانے جھٹک کر کہا۔" میرا خیال ہے یہیں رہتا ہے۔"

"جس راستے سے وہ بجری لانے جاتا ہے، شاید وہاں کہیں کھانا کھا لیتا ہو۔"

"ہو سکتا ہے۔" فورمین بولا۔

سام نے کار میں سے سڑکوں کا ایک نقشہ نکالا اور پوچھا "یہ بجری آتی کہاں سے ہے؟"

فورمین نے نقشے کو غور سے دیکھا اور ایک جگہ انگلی رکھ دی "اس جگہ سے۔ جہاں ہم کھڑے ہیں یہاں سے یہ جگہ ٹھیک اٹھارہ میل دور ہے۔"

"کبھی اوکس نے واپسی میں دیر بھی لگائی؟ چند منٹ کی سہی؟"

"نہیں جناب!" فورمین نے بڑے وثوق سے کہا۔" اگر دیر لگاتا تو اُس کی اُجرت کٹ جاتی۔"

"ٹھیک۔" سام نے سر کو جنبش دی۔" تمہاری مدد کا بہت بہت شکریہ۔ اُسے معلوم نہ ہو کہ میں نے اُس کے بارے میں جانچ پڑتال کی ہے۔"

"جیسا آپ کہیں۔" فورمین نے جواب دیا۔

سام کار میں بیٹھ کر نقشے کو دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں اس سڑک پر دوڑ رہی تھیں جو مارکیٹ سے بجری لانے کی جگہ تک جاتی تھی۔ اس سڑک پر ایسا کوئی مقام نہ آتا تھا جہاں سے اوکس دلدل سے گیارہ بارہ میل سے کم فاصلے پر ہو۔ اتنے بھاری ٹرک میں اُس کے لئے ناممکن تھا کہ کھانے کی چھٹی میں ٹرک چھوڑ کر وہاں جائے اور آدھ گھنٹے میں لوٹ بھی آئے البتہ اگر وہ ٹرک کو وہیں چھوڑ کر کار لیتا تو یہ بات ممکن ہو سکتی تھی۔

اتنے میں ریڈیو ٹرانسمیٹر نے اس کے خیالات کا تانا بانا توڑ دیا۔

لوسی کہہ رہی تھی: "میں نے اوکس کے بارے میں بلارڈ کی پولیس سے معلوم کیا ہے چیف اسمارٹ نے بڑی حیرت ظاہر کی کہ اوکس یہاں کس مصیبت میں گھر گیا ہے! انھوں نے کہا ہے کہ اوکس تو ایک سیدھی لکیر کی طرح کا لڑکا ہے اور مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ کوئی تشدّد کر سکتا ہے۔ وہ ایک زمانے میں ہنگامے اور مار دھاڑ ضرور کرتا تھا لیکن پھر اتنا سیدھا اور نیک بن گیا کہ بس۔"

"ہو سکتا ہے وہ پھر پٹری سے اُتر گیا ہو۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتی" لوسی بولی۔

"کیوں نہیں؟" سام نے پوچھا: "تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو!"

لوسی نے بڑے اطمینان سے کہا: "پولیس کا سارا ریکارڈ میری نظروں سے گذرتا ہے۔ گذشتہ اکتیس برس میں یہ اس نوعیت کا پانچواں قتل ہے قتل ہونے والے سارے بوڑھے آدمی تھے۔ سارے قتل سر پر ضرب لگا کر کئے گئے اور ساری وارداتیں اگست کے مہینے میں ہوئیں۔ سارے قتل ابھی سربستہ راز ہیں۔ موجودہ قتل بھی ایک معمّہ ہی رہے گا۔"

"اس قتل کو ابھی تین گھنٹے ہی تو ہوئے ہیں" سام نے تُرشی سے کہا: "میں اپنے وقت کا سب سے بڑا سراغ رساں تو نہیں ہوں!"

"ایسا ہی ہوگا" لوسی اتنے زور سے بڑبڑائی کہ سام نے اس کی آواز صاف سُن لی۔

"میں تمھاری اس بدتمیزی کو تمھاری ترقّی کے وقت دھیان میں رکھوں گا" سام نے دھمکی دی: "تم نے جیسپر کی جائیداد کے بارے میں معلوم کیا؟"

"جی ہاں۔ میں اپنا فرض تندہی سے انجام دیتی ہوں۔ معلوم ہوا ہے کہ جیسپر کی ساری زمین بنجر ہے اور اس کی کل مالیت چھ سو ڈالر سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ اس قابل نہیں کہ اس کی خاطر قتل کیا جائے۔"

"قتل تو اس سے کم کے لئے کیا گیا ہے" سام نے جز بز ہو کر کہا اور پھر اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھ کر سوچ میں پڑ گیا کہ لوسی نے یہ کیا بات کہہ دی ہے: "اچھا یہ بتاؤ کہ پچھلا قتل کب ہوا تھا؟" اس نے آخر پوچھ لیا

"گیارہ سال پہلے اسی مہینے میں" لوسی بولی: "اگست ۶۲ء میں ہوا تھا اور مقتول اینگس ٹیلر تھا۔ اس سے پہلے اگست ۵۵ء میں قتل ہوا اور اس کا نشانہ ارل ایڈورڈز بنا۔ اس سے چھ سال قبل اگست ۴۹ء میں لیوری اسپیئر قتل ہوا۔ اور پیچھے چلئے اگست ۴۲ء میں ڈولف نیومین کی جان لی گئی۔"

"مجھے ایڈورڈز کا کیس معلوم ہے" سام نے کہا "میں اس وقت ہائی اسکول میں تھا۔ لیکن دوسرے قتل میرے ذہن میں نہیں ہیں۔"

"نیومین کے قتل کے وقت تو تم سال بھر کے تھے اور اسپیئر مارا گیا تو دوسری جماعت میں تھے" لوسی نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا: "جب ٹیلر کی لاش ملی تو تم ویت نام میں تھے۔"

"تمھارا خیال ہے کہ یہ سارے قتل ایک ہی کڑی سے تعلق رکھتے ہیں؟ اکتیس سال میں پانچ قتل آپس میں مربوط ہیں؟"

"یہ تو روزِ روشن کی طرح ظاہر ہے" لوسی نے دبے لہجے میں کہا۔

"تم کتنے پولیس کمشنروں کے ساتھ کام کر چکی ہو؟"

"آپ ساتویں ہیں۔"

"اُن میں سے کسی نے ان قتلوں کا آپس میں تعلق ثابت نہیں کیا؟"

"اسی وجہ سے کہ جس طرح آپ نہیں کر رہے ہیں" لوسی بولی: "نیا آنے والا کمشنر پرانے کیسوں میں سر نہیں کھپاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان پانچوں قتل کے درمیان طویل عرصہ بھی رہا ہے۔ یہ تو محض اتفاق ہے کہ میں نے ان کے مابین تعلق پیدا کر لیا ہے۔"

"تم ٹی وی پر زیادہ جاسوسی فلمیں تو نہیں دیکھتی ہو لوسی؟"

"اگر آپ اس انکشاف کی اہمیت کو کم کرنا چاہتے ہیں تو یہ آپ کی مرضی ہے" لوسی نے خفگی سے کہا: "لیکن میں یہ بتائے دیتی ہوں کہ آپ اوکس کو گھیٹنے میں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

"ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی" سام بولا "مجھے تو صرف اسی قتل سے سروکار ہے اور میں یہ قطعاً ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ کسی ایک شخص نے ۴۲ء سے قتل کرنے کا آغاز کیا ہے۔"

"جو آپ بہتر سمجھیں۔"

"میں جائے واردات پر جا رہا ہوں" سام نے کہا "ابھی کچھ دیر میں واپس آتا ہوں۔"

دلدل کے پاس پہنچ کر سام نے دیکھا کہ اس کا نائب اسپنس رسّی سے سارے علاقے کو گھیرے میں لئے کھڑا ہے۔ اس حلقے سے باہر تماشائیوں کا ہجوم ہے۔ سام اُن کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا اسپنس کے پاس گیا۔

"ڈاکٹر نے اپنا کام کر لیا ہے" اسپنس نے ڈاکٹر فری مین کی طرف سر سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اب میت کو لے جانے ہی والے ہیں۔"

"گشتی گاڑی آ رہی ہے" سام نے کہا: "اُس کے آنے تک

یہاں ساری چیزیں جُوں کی توں پڑے رہنے دینا۔"

"بہتر" اسپنس بولا۔

سام ڈاکٹر فری مین کی طرف بڑھ کر بولا "ضرب کیسی ہے، ڈاکٹر؟"

"کسی سیدھی اور سخت چیز سے کھوپڑی کی پشت پر ایک ہی ضرب لگائی گئی ہے۔" ڈاکٹر نے بتایا "خون فوری طور پر زیادہ مقدار میں نکل گیا اور فوری موت واقع ہوگئی۔ اس عمر کے آدمی کے لئے یہ بہت تھا، آپ تو جانتے ہی ہیں!"

"میرا خیال اس سے کچھ مختلف ہے۔" سام نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر! تمہیں کچھ یاد پڑتا ہے اسی قسم کا ایک قتل ۱۹۶۲ء میں بھی ہوا تھا۔ ٹیلر نامی آدمی تھا!"

"جی نہیں" ڈاکٹر بولا "میں اس وقت سیفورڈ میں پریکٹس کرتا تھا۔ ڈاکٹر ڈینیلز کے مرنے کے بعد میں ۱۹۶۸ء میں یہاں آیا ہوں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ میں تو بھول ہی گیا تھا۔" سام نے ہلاری ہینیس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو لاش کو لیجانے والا ہی تھا

"تم طبی معائنے کے بارے میں اپنی رپورٹ قبرستان جاکر دوگے؟"

"ہاں، یہی کروں گا۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "ہلاری نے لاش پر خوشبوئیں وغیرہ لگانی شروع کردی ہیں تو اب یہ کام وہیں جاکر کروں گا۔"

"اچھا۔ شہر میں تم سے ملوں گا، ڈاکٹر" سام بولا۔ وہ اسٹریچر کے پاس گیا جس پر جیسپر کی لاش رکھی تھی اور ہلاری ہینیس کے لڑکے نے اس پر چادر ڈال رکھی تھی۔

"ہو، چھوٹے ہلاری!"

"جی جناب" ہلاری کے لڑکے نے اسٹریچر کا ایک سرا تھام کر کہا۔ سام نے اس کی طرف دیکھ کر اسٹریچر کا دوسرا سرا تھام لیا اور دونوں اسے اٹھائے ہوئے سڑک کی طرف لے چلے۔ سڑک پر میت لے جانے والی گاڑی کے پاس ہلاری کھڑا تھا۔ تینوں نے میت کو گاڑی میں رکھا اور ہلاری نے دروازہ بند کردیا۔ پھر وہ گاڑی کے سامنے والے حصے کی طرف آئے۔

"ہلاری تمہیں یاد ہے ۱۹۶۲ء میں ٹیلر نامی ایک آدمی کا قتل ہوا تھا؟" ہلاری نے اسے کنکھیوں سے دیکھا "ٹیلر؟ ٹیلر! ہاں یاد آیا۔ اسے بھی سر پر ضرب لگی تھی، بالکل اس آدمی کی طرح۔ ٹھیک ہے نا؟"

"مجھے تو یہی بتایا گیا ہے۔" سام بولا۔ "ارل ایڈورڈز کے بارے میں بھی معلوم ہے جسے ۱۹۶۸ء میں اسی طرح قتل کیا گیا؟"

ہلاری خوش دلی سے بولا "یہ سب بھولی بسری باتیں ہیں۔ مجھے اپنی فائلیں دیکھنی ہوں گی۔" پھر اس نے دھیمی آواز سے کہا "آپ کا خیال ہے ان قتلوں کا آپس میں کوئی تعلق ہے؟"

"میں کچھ نہیں جانتا۔ لوسی کہتی ہے کہ یہ ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔"

"لوسی! جہنم میں جائے وہ! اگر آپ اس کی باتوں میں آئیں گے تو آپ کو یہاں جیک دی ریپر کو تلاش کرنا ہوگا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو" سام نے اعتراف کیا۔ پھر اس نے ہلاری کے لڑکے کی طرف مڑ کر کہا "گاڑی کو میری کار کے پیچھے پیچھے رکھنا تمہاری مدد کے لئے آدمی دے دوں گا۔"

قبرستان سے نکل کر سام نے ایک چوراہے پر ایستادہ ایک اونچی بلڈنگ کے سامنے جاکر کار روکی اور اس کی دوسری منزل پر ایک دفتر میں جا گھسا اس پر بورڈ لگا تھا "یوٹن نیل انشورنس" نیل اس کا ہم عمر بھاری بھرکم آدمی تھا اور دونوں ایک ساتھ پڑھے ہوئے تھے۔ اس نے سام کو دیکھ کر کہا: "ہلو سام! کیسے گذر رہی ہے؟"

"ہلو، نیل، تم نے بڈھے جیسپر کے بارے میں سنا؟"

"ہاں۔ بڑے افسوس کی بات ہے" نیل بولا

"اس کے بیمے کی پالیسی تمہارے ہاں ہے؟"

"دیکھو سام یہ رازداری کی باتیں ہیں۔"

"میں جانتا ہوں، نیل! لیکن یہ بڑی اہم بات ہے۔ عین ممکن ہے کہ میں اس سے قاتل پر ہاتھ ڈال سکوں۔"

نیل نے پشت کرسی سے ٹکا دی "تمہیں شک کس پر ہے؟"

"ہوسکتا ہے۔ بہت ممکن ہے۔ ٹام اوکس نامی ایک شخص ہو۔ اس نے بڈھے کی پوتی سے شادی کی ہے۔ اگر یہ معلوم ہوجائے کہ اس پوتی کو بیمے سے کیا کچھ ملتا ہے تو میں کسی نتیجے پر پہنچ سکوں گا۔"

"پھر تو اسے ذہن سے نکال دو۔" نیل نے صاف جواب دیا۔ اس نے دراز میں سے تہ دار کاغذات نکالے اور کہا: "جیسپر کے مرنے کی خبر سنتے ہی میں نے اس کے کاغذات دیکھے۔ اس نے صرف کفنانے دفنانے کی پالیسی رکھی تھی۔ ۱۹۶۸ء سے ہر ہفتے پریمیم بھر رہا تھا۔ اس رقم سے صرف اس کے جنازے کی رسوم ادا ہوسکتی ہیں۔ پوتی کو ایک کوڑی نہیں ملے گی۔"

سام نے ایک ٹھنڈی سانس لی "لیجئے، بات ختم ہوئی" وہ جانے کے لئے مڑا "شکریہ نیل!" اور باہر نکل گیا۔

پانچ منٹ بعد وہ جیل کے دروازے پر تھا۔ بلڈنگ میں داخل ہوا تو سامنے ہی لوسی موجود تھی "تین باتیں، کمشنر! ایک: گشتی گاڑی یہاں پہنچی اور اب جائے واردات پر گئی ہے۔ دوسری؟ وارڈن نے بتایا ہے کہ اوکس

اُس کے بہترین قیدیوں میں سے تھا۔ کہتا تھا کہ اگر سارے قیدی ایسے ہی بن جائیں تو گارڈز رکھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے گی۔ اوکس کی میعادِ قید میں تخفیف ہو گئی تھی۔ اس کے خلاف کوئی شکایت نہیں تھی۔ ہر کام میں مدد کرتا تھا۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا!" سام بولا: "تیسری بات تم کیا بتانا چاہتی تھیں؟"

"ٹامی اوکس دفتر میں تمہارا انتظار کر رہا ہے۔" لوسی نے ہاتھ ہال کے کھلے دروازے کی سمت میں اٹھا کر کہا: "اُس کے ساتھ دو ملنے باز بھی ہیں۔"

سام تیوری چڑھائے اپنے دفتر کی طرف بڑھا اور اندر جا کر بولا: "مزاج بخیر، لڑکو!" اور دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

ایک نوجوان چھریرے، مضبوط جسم کا تھا۔ اُس نے خاکی کپڑے پہن رکھے تھے اور اُس کی سُورج کی تمازت سے جُھلسی ہوئی باہیں ظاہر کر رہی تھیں کہ ٹرک ڈرائیور ہے۔ دوسرے دو اس سے عمر میں بڑے اور بھاری جسم کے تھے۔ اُن کی برہنہ ٹانگوں پر خشک سیمنٹ لگا ہوا تھا۔

"میں ٹام اوکس ہوں!" نوجوان نے کہا: "مسٹر جیسپر، جن کی لاش ملی ہے، میری بیوی کے دادا تھے۔"

"پھر؟"

"میں سزا یافتہ ہوں، کمشنر! مجھے چوری کے کیس میں سزا ہوئی تھی۔ میں جانتا ہوں آپ ہر آدمی سے پوچھ گچھ کریں گے، اس لئے میں خود پیش ہو گیا ہوں۔ اس سے نہ آپ کو زحمت ہوگی نہ مجھے تکلیف ہوگی۔"

"اچھا، اب کیا کہنا چاہتے ہو؟" سام نے پوچھا۔

"میں واردات کے دن سارا وقت اپنے کام میں مصروف تھا۔" اوکس نے کہنا شروع کیا: "صبح سات بجے میں ٹرک میں بیٹھا اور نو گھنٹے بعد ساڑھے چار بجے فارغ ہوا۔ سارا دن پریسٹن کی نئی مارکیٹ اور بجری والی جگہ کے درمیان ایک ایک گھنٹے کے چکر لگاتا رہا۔ میرا فورمین اپنے رجسٹر سے اس کی تصدیق کر سکتا ہے۔ صرف میرے کھانے کا وقفہ اس کے رجسٹر میں درج نہیں ہوگا۔ یہ بارہ اور ساڑھے بارہ کے درمیان کا ہے اور یہ دونوں آدمی اس وقت میرے ساتھ تھے۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔" اُس کے ایک ساتھی نے تائید کی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" سام نے پوچھا۔

"یہ لون ٹکر ہے۔" اس کے بجائے دوسرے نے جواب دیا: "اور میرا نام بارٹ کیس ہے۔ ہم نئی مارکیٹ میں سیمنٹ اتارنے کا کام کرتے ہیں۔"

"اور تم دونوں کہتے ہو کہ کھانے کے وقفے میں اُس کے ساتھ رہے ہو؟"

"جی ہاں۔ ہم یہی کہتے ہیں۔" لون ٹکر نے کہا: "گیارہ بجے یہ چکر لگا کر آیا تو ہم ایک خالی دکان میں گرمی سے بچنے کے لئے جا بیٹھے۔"

"ہم سارا وقت وہیں بیٹھے رہے۔" بارٹ کیس نے اس کی تائید کی: "پھر جب کھانے کا وقت ختم ہوا تو ٹامی اپنے ٹرک پر چلا گیا اور چکر لگانے چل پڑا۔"

سام نے ایک لمحہ کچھ سوچا اور پھر اپنی میز کے پاس گیا: "بہت اچھا لڑکو! تم نے یہاں آ کر تعریف کے قابل کام کیا ہے۔ شاید تمہیں بعد میں ایک رسمی بیان پر دستخط بھی کرنے پڑیں۔"

"آپ جب چاہیں ہم حاضر ہیں۔" لون ٹکر نے کہا۔ تینوں جانے کے لئے مڑے لیکن سام نے اوکس کو روک لیا۔ تینوں کے قدم رُک گئے۔

"مجھے مسٹر جیسپر کے بارے میں بہت افسوس ہے، ٹام۔"

"شکریہ صاحب!" اوکس نے جواب دیا: "مجھے دادا جان سے محبت تھی۔ میں انھیں زندگی بھر بھول نہ سکوں گا۔"

"انھوں نے تمہاری بیوی کے لئے کچھ ترکہ بھی چھوڑا ہے؟ بیمہ وغیرہ؟"

"میرے خیال میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ساری عمر انھوں نے تنگدستی میں کاٹی۔ ایک ٹوٹے پھوٹے گھر کے سوا اُن کے پاس کچھ اور نہ تھا۔ وہ بھی تین چار سو سے زیادہ کا نہیں ہوگا۔ رہا بیمہ۔ تو میرا خیال ہے انھوں نے بیمہ نہیں کرایا تھا۔ اگر کرایا ہوتا تو ہمیں ضرور معلوم ہوتا۔"

تینوں کمرے سے نکل گئے تو سام لوسی کے پاس گیا۔

"فرمایئے!" لوسی نے پوچھا۔ اس کا لہجہ سوالیہ کم تھا اور اس میں جارحیت زیادہ تھی۔

"وہ بالکل بے قصور نکلا ہے۔" سام نے کہا: "اُس کی نہ بدنیتی ظاہر ہوتی ہے نہ اسے اس کا موقعہ ملا ہے۔" اُس نے ناکامی سے سر ہلایا: "بس میرے نزدیک تو ایک ہی مشتبہ آدمی تھا۔"

سام نے لوسی کے سامنے رکھا ہوا ایک بڑا سا فائل اٹھا لیا اُسے کھولا تو نظر جیسپر سے پہلے قتل ہونے والے اینگس ٹیلر کی تصویر پر پڑی۔ اس صفحے پر تاریخ ۲۹ اگست ۶۲ء پڑی تھی۔ اڑسٹھ سالہ ٹیلر کی لاش ایک کباڑ خانے کے احاطے میں ملی تھی اور اسے سر پر ضرب لگا کر ہلاک کیا گیا تھا۔ سام نے دوسرا صفحہ کھولا۔ اس پر ۲۱ اگست ۵۵ء کی تاریخ تھی اور بہتّر سالہ ارل ایڈورڈز کی تصویر تھی۔ وہ اپنے کھیت کے پاس سڑک پر پڑا ہوا

ملا تھا۔ اُسے بھی سر پر ضرب لگائی گئی تھی۔ تیسرے صفحہ کا رنگ کچھ اُڑ سا گیا تھا۔ اس پر ۲۵ اگست ۱۹۵۹ء کی تاریخ تھی۔ تصویر اکیاسی سالہ لیوری اسپیئر کی تھی۔ اس کی لاش کوڑا جمع کرنے کی جگہ پر ملی تھی جہاں وہ ردی کے ٹکڑے اکٹھا کرنے جاتا تھا۔ ہلاکت کی وجہ سر پر ضرب تھی۔ اس کے بعد ڈولف نیومین کی تصویر تھی۔ عمر ستر سال۔ اس کی لاش بھی سڑک پر ملی تھی۔ سر پر ضرب۔ مورخہ اگست ۱۹۶۲ء۔"

"ساری وارداتیں اگست کی ہیں۔" لوسی بولی۔ "سارے بوڑھے آدمی ہیں۔ سارے قتل ایک ہی طریقے سے کئے گئے۔ کسی کا سراغ نہ مل سکا۔"

"اُسے اتفاق بھی تو کہا جا سکتا ہے۔" سام ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس نے فائل بند کر دیا اور وہاں سے ہٹ گیا۔

"کیا آپ وثوق سے کہتے ہیں؟" لوسی نے پوچھا۔ "آپ کو پورا یقین ہے کہ یہ محض اتفاق ہے؟"

سام اُسے گھورنے لگا۔ اس کا حلق اچانک خشک ہو گیا اور کلیجے میں چھریاں سی چلنے لگیں۔ "مجھے یہی یقین کرنا ہوگا، لوسی! یا پھر یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ہمارے درمیان اکتیس سالوں سے ایک جنونی قاتل رہ رہا ہے۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں یہ تسلیم کر لوں؟"

دونوں ایک دوسرے کو دیر تک ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ دونوں کا ذہن اس بات کے نتائج پر دوڑ رہا تھا کہ سارے شہر پر لوگوں پر، اُن کی پُرسکون زندگی پر اس کا کیا اثر ہوگا!

آخر لوسی نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔ "نہیں۔ میں سمجھتی ہوں آپ ایسا نہیں کر سکتے۔"

"پھر بھی" سام نے کہا۔ "جو بھی یہ حرکت کرتا رہا ہے، اب تھک گیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے جلیبر آخری آدمی ہو۔"

"ہو سکتا ہے۔" لوسی بے اعتمادی سے بولی۔ "ہو سکتا ہے۔"

٭

شام کا دھندلکا چھا گیا تو پولیس کی گشتی گاڑی گرد و نواح کا سارا چکر ختم کر چکی تھی اور اسے جائے واردات سے دُور دور تک کوئی مشتبہ آدمی نہیں ملا تھا۔ ڈاکٹر فری مین نے اپنی رپورٹ پیش کر دی تھی۔ کیپٹن کرین اپنی ناکہ بندی ختم کر کے دفتر میں لوٹ چکا تھا۔ جائے واردات پر ڈپٹی کمشنر پولیس نے رسّی کا حصار اُٹھا لیا تھا اور اس کا کام ختم ہو گیا تھا۔ روزالی اور ٹام اوکس جنازے میں شرکت کے لئے شہر آئے تھے۔

گورکن ہلاری ہینیس اور اس کا لڑکا میّت کو دفنانے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آ گئے اور ہلاری نے بوتل کھولی۔

"اس طرح کام ہوتا ہے بیٹے!" ہلاری نے لڑکے سے کہا:

"میں نے تمہیں سارا کاروبار سمجھا دیا ہے اور اب تم اُس کا مالی نتیجہ بھی جان گئے ہو۔" اُس نے دو گلاس بھرے اور ایک لڑکے کو دے کر بولا۔ "صرف اتنا یاد رکھو بیٹے۔" اُس نے ایک گھونٹ بھرا۔ "سال میں اٹھارہ جنازوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ عموماً یہ تعداد نہ صرف پوری ہوتی ہے بلکہ کسی کسی سال اس سے زیادہ بھی ہو جاتی ہے اور ہمارا گذارہ بڑی اچھی طرح ہو جاتا ہے لیکن کبھی کبھار ایسا سال بھی آتا ہے کہ لوگ اس طرح نہیں مرتے جیسے انھیں مرنا چاہیئے۔ پہلے اکثر ایسا ہوا ہے جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا ہے ۱۹۶۲ء میں، اس سے پہلے ۱۹۵۹ء میں۔ پھر ۱۹۶۹ء آیا تھا اور اس سے پہلے ۱۹۶۲ء گذر چکا ہے۔"

اُس نے ایک بڑا سا رجسٹر اُٹھا کر اپنے بیٹے کے سامنے رکھ کر کھولا۔ "ہمارا مالی سال ۳۱ اگست کو ختم ہوتا ہے۔ مہینے کے وسط میں تمہیں سال بھر کے کاروبار کا جائزہ لینا ہوگا کہ جنازوں کی مطلوبہ تعداد پوری ہوئی ہے یا نہیں۔ یعنی تم نے اپنا کوٹہ پورا کیا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں کیا ہے تو تمہیں مدد کے لئے اردگرد نظریں ڈالنی ہوں گی۔ عموماً کوٹہ پورا کرنے کے لئے تمہیں صرف ایک آدمی کی خدمات درکار ہوں گی۔ مجھے تو صرف ایک ہی آدمی کی ضرورت پڑتی رہی۔ تمہارے دادا کہتے تھے کہ ایک مرتبہ انھیں اگست میں تین جنازوں کی کمی رہی اور انھیں سڑک پر بھی دوڑا کر بیک وقت تین کنواری بہنوں کو ختم کرنا پڑا۔ جانے وہ سچ کہتے تھے یا جھوٹ!" ہلاری نے پلکیں بار بار جھپکائیں۔ "پاپا ہمیشہ رائی کا پہاڑ بناتے تھے۔ خدا ان کی مغفرت کرے۔"

اس نے بڑا سا گھونٹ بھرا اور بولا: "تاہم جیسا کہ میں نے کہا ہے، اگست کے وسط میں تمہیں اپنے کاروبار کا جائزہ لینا ہوگا۔ کسی بڈھے کو منتخب کر لو، اس طرح لوگ اس کی کمی کو زیادہ محسوس نہیں کریں گے زیادہ تر لوگ یہی کہیں گے کہ وہ ایک لمبی عمر گذار چکا تھا۔ بیمہ کمپنی والے بھی کوئی فکر نہیں کریں گے کیونکہ وہ بیس یا تیس سال تک پریمیم ادا کرتا رہا ہوگا۔"

"آپ بیمے کے بارے میں کس طرح معلوم کریں گے؟" بیٹے نے پوچھا۔ "یہ بڑا آسان ہے۔" ہلاری بولا۔ "کسی جمعرات کی صبح کو لیوٹ نیل کی تاک میں رہو۔ اس دن وہ اپنا ہفت روزہ دورہ کرتا ہے جیسا کہ اس کے باپ اور دادا کرتے تھے۔ اس کا پیچھا کرو اور ایک گھنٹے کے اندر اندر تمہیں دس آدمی مل جائیں گے۔ ایک بات خاص طور سے یاد رکھو۔ اپنا کام بہت پہلے شروع کر دو۔ پندرہ اگست سے لگ جاؤ اور تم مالی سال ختم ہونے سے پہلے اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گے۔"

"میں ضرور یاد رکھوں گا، ڈیڈی!" بیٹے نے فرماں برداری سے کہا اور اپنے گلاس سے گھونٹ بھرا۔ گھونٹ حلق سے نیچے اتارتے ہوئے اُسے یوں لگا کہ مستقبل کی تمام تر ذمہ داریوں کے بوجھ سے اُس کی کمر دوہری ہو گئی ہے۔

نامحسوس

لوڈنگ گیٹ پر میرے سامنے جو لڑکی کھڑی تھی وہ نہایت خوبصورت متناسب اور چھریرے جسم کی مالک تھی۔ جلد کی رنگت تانبے کی مانند تھی۔ چہرے کے خدوخال انتہائی دلکش تھے۔ ستواں ناک کی نوک پر دھوپ کی تمازت سے چڑھا ہوا رنگ اترنے لگا تھا۔ لائن میں کھڑے ہوئے میں نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ طیارے میں سوار ہونے کے بعد میں اُس کے قریب بیٹھنے کی کوشش کروں گا۔

قسمت نے میرا ساتھ دیا۔ طیارے پر چڑھنے کے بعد میں نے دیکھا کہ کھڑکیوں کے پاس کی تمام سیٹیں سوائے ایک کے گھر چکی ہیں۔ جب اس لڑکی نے وہ سیٹ اپنے لئے منتخب کرلی تو میرے لئے بڑی فطری سی بات تھی کہ میں اس کے برابر بیٹھ جاؤں اور چونکہ عام طور پر مسافر کنارے کی نشست پر بیٹھنا پسند نہیں کرتے اس لئے یہ توقع بہت کم تھی کہ کوئی اُس کی اور میری تنہائی میں دخل انداز ہوگا۔ میں نے فوراً ہی بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ جب ہوائی جہاز پرواز کرتا ہے تو میں کچھ نروس ہو جاتا ہوں۔ البتہ جب طیارہ فضا میں بلند ہوگیا اور طیارہ کی میزبان لڑکی مسافروں کو خوش آمدید کہہ چکی تو میں لڑکی کی طرف متوجہ ہوا۔

"ہیلو۔ ہمسفر" میں نے کہا "مجھے البرٹ شیلٹن کہتے ہیں"۔

اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ مگر گہری نظر سے جائزہ لینے کے بعد غالباً اس نتیجہ پر پہنچی کہ میں ایک شریف اور بے ضرر انسان ہوں۔

"کیسے مزاج ہیں البرٹ" اُس نے جواب دیا "میرا نام ڈائنا وارٹن ہے"۔

"کیوں نہ ہم ذاتی نوعیت کی معلومات سے پہلے فارغ ہوجائیں" میں بولا

"کیا مطلب ؟"

"میں طیارے کے سفر کے دوران عموماً اپنے ہمسفر سے باتیں کرنے کا عادی ہوں" میں نے جواب دیا "اور گزشتہ تجربات کی روشنی میں میرا اندازہ ہے کہ دوران گفتگو بہت سی باتیں اپنے متعلق بیان کروں گا اور بہت سی باتیں تمہارے بارے میں سننے کو ملیں گی۔ چنانچہ اگر ہم یہ باتیں پہلے کرلیں تو دوسرے دلچسپ موضوعات کے لئے زیادہ وقت بچا سکیں گے۔ میری عمر پچیس سال ہے۔ کنوارا ہوں۔ دو ماہ قبل میں نے یو۔سی۔ ایل۔ اے سے گریجویشن کیا ہے۔ اور اتنی دیر سے تعلیم مکمل کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اٹھارہ سال سے اکیس سال کی عمر تک میں فوج میں تھا

اطہر ندیم

اس وقت میں بفیلو جا رہا ہوں تاکہ ایلپٹن ڈٹکٹیو ایجنسی میں اپنی ڈیوٹی جوائن کرسکوں۔ اتفاق سے یہ ایجنسی میرے ماموں کی ملکیت ہے۔ ان کا نام فریڈ ایلپٹن ہے۔ چونکہ تم خود بھی بفیلو کی رہنے والی ہو اس لئے ممکن ہے تم نے ان کا نام سنا ہو۔"

اس نے ایک مرتبہ پھر مجھے چونک کر دیکھا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں بفیلو کی رہنے والی ہوں؟" اس نے پوچھا۔

"معمولی بات ہے مائی ڈیر واٹسن" میں نے جواب دیا "جب تم قطار میں میرے آگے کھڑی تھیں تو گیٹ پر ٹکٹ دکھاتے وقت میں نے تمہارے کندھے پر سے جھانک کر دیکھا تھا۔ تمہارا ٹکٹ واپسی ٹکٹ تھا اور بفیلو سے جاری کیا گیا تھا۔"

"بڑی دلچسپ باتیں کرتے ہو۔" اس نے شوخ نگاہوں سے مسکراتے ہوئے کہا "بالکل شرلاک ہومز کی طرح۔ مگر ظاہر ہے کہ جب تم ایک سراغ رساں ایجنسی میں ملازمت کرنے جا رہے ہو تو تم سے ایسی ہی باتوں کی توقع کرنا چاہیئے۔ میرا خیال ہے کہ تم نے اپنی ڈگری بھی شاید کرمنالوجی میں حاصل کی ہوگی۔"

"جی نہیں میرا مضمون فلسفہ تھا" میں نے جواب دیا "مگر چونکہ آجکل ہماری سوسائٹی میں فلسفیوں کی زیادہ کھپت نہیں ہے اس لئے بدرجۂ مجبوری میں نے اپنے ماموں کی پیشکش منظور کرلی۔ ویسے اس میدان میں بھی فلسفہ خاصی مدد کرسکتا ہے۔"

"میں تمہارے اس اندازے سے بہت متاثر ہوئی ہوں جو تم نے میرے بفیلو کی باشندہ ہونے کے بارے میں لگایا تھا" ڈائنا بولی "معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری قوتِ مشاہدہ کافی تیز ہے۔ کیا تم میرے متعلق کچھ اور باتیں بتا سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں۔" میں نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "مثلاً میں بتا سکتا ہوں کہ تم جنوبی کیلیفورنیا صرف تفریح کرنے آئی تھیں۔"

"اوہ۔ یہ بات تمہیں کیسے معلوم ہوئی؟"

"تین وجوہ سے" میں نے جواب دیا "پہلی بات تو یہ کہ اگر تم کام کی تلاش میں یہاں مستقل قیام کے خیال سے آئی ہوتیں تو واپسی ٹکٹ نہ خریدا ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ اگست کا مہینہ عموماً تفریح کا مہینہ سمجھا جاتا ہے۔ تیسرا نکتہ یہ کہ تمہاری رنگت ظاہر کرتی ہے کہ تم نے خاصا وقت ساحلِ سمندر پر دھوپ میں لیٹے یا بیٹھے ہوئے گذارا ہے۔ ایسا کوئی سیر و تفریح کے لئے آنے والا ہی کرسکتا ہے۔"

"بہت خوب" اس نے دلچسپی سے کہا "کچھ اور بتاؤ۔"

"ضرور۔" میں نے سر ہلایا "یہاں تم اپنے منگیتر سے بھی ملنے آئی تھیں۔ مگر روانگی سے کچھ قبل تم نے اپنی منگنی توڑ دی۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ تم میرا پیچھا کرتے رہے ہو۔" اس نے مشکوک نظروں سے مجھے گھورا۔

"ہرگز نہیں۔ میں نے آج سے پہلے تمہیں دیکھا تک نہیں۔" میں نے جواب دیا "یہ بات کہ تم نے اپنی منگنی توڑ دی ہے مجھے اس طرح معلوم ہوئی کہ تمہارے الٹے ہاتھ کی اس انگلی پر جس میں منگنی کا چھلا پہنا جاتا ہے سفید داغ موجود ہے جس کی گولائی اور موٹائی بالکل منگنی کے چھلے کی طرح ہے۔ اور اس جگہ جلد کی سفیدی ظاہر کرتی ہے کہ اگر تم نے چھلا پہلے اتارا ہوتا تو یہ جگہ بھی تانبے کی رنگت اختیار کرلیتی۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ اسے تم نے روانگی سے کچھ قبل ہی اتارا ہے۔"

ڈائنا نے ایک ہلکا سا قہقہہ بلند کیا۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تمہاری وضاحت کے بعد بات کتنی آسان معلوم ہوتی ہے" اس نے کہا "کوئی اور انکشاف بھی کروگے یا بس؟"

"میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ تمہارا منگیتر یا تو یو۔سی۔ ایل۔ اے۔ میں کرمنالوجی کی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ یا پھر اسی نوعیت کا کوئی مضمون وہاں پڑھاتا ہے۔"

"بہت خوب۔ یہ اندازہ تم نے کس بات سے لگایا؟"

"تمہاری اس بات سے کہ تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں نے کرمنالوجی کے مضمون میں ڈگری حاصل کی ہے" میں نے بتایا "بفیلو میں رہتے ہوئے تمہیں یہ بات کس طرح معلوم ہوسکتی تھی کہ یو۔سی۔ ایل۔ اے میں یہ مضمون بھی پڑھایا جاتا ہے۔ سوائے اس صورت کے کہ یا تو تمہارا قریبی تعلق وہاں کے کسی طالبعلم سے ہو یا پروفیسر سے۔"

"خدا کی پناہ۔ تم تو واقعی بہت ہوشیار اور ذہین آدمی ہو۔"

"میں نے جو کچھ بتایا وہ بہت ہی معمولی باتیں ہیں جو کوئی بھی شخص ذرا سی توجہ اور مشاہدے سے بتا سکتا ہے۔" میں نے کہا "اب ایک آخری انکشاف اور۔ تم نے بفیلو کی یونیورسٹی سے ایک سال قبل بی اے کیا ہے اور غالباً نرسنگ میں۔"

"اور شاید اس کی وضاحت بھی دوسری باتوں کی طرح بالکل سادہ اور عام ہوگی۔ کیوں؟" اس نے طنز کیا۔

"نہیں۔ اس کا تعلق میرے ذاتی تجربے سے زیادہ ہے" میں بولا "فوج میں ملازمت کے آخری سال میری ملاقات ایک نرس سے

ہوئی تھی جس نے بفیلو یونیورسٹی سے بی اے کیا تھا۔ اُس نے اپنے سیدھے ہاتھ میں جس طرح کی کلاس انگوٹھی پہنی ہوئی تھی، بالکل اسی طرح کی انگوٹھی تم نے اپنے سیدھے ہاتھ میں پہن رکھی ہے۔ جہاں تک سال کا تعلق ہے تو وہ تمہاری انگوٹھی پر اتنا واضح طور پر کھدا ہوا ہے کہ میرے لئے پڑھنا کچھ مشکل نہیں تھا۔"

"تم واقعی بہت حیرت انگیز آدمی ہو۔" ڈائنا نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

اگرچہ وہ مجھے رفتہ رفتہ اتنا ہی پسند کرتی جا رہی تھی جتنا میں اُسے لیکن اُس نے ازخود اپنی ذات کے بارے میں کوئی بات نہیں بتائی اور گفتگو ان نتائج سے آگے نہیں بڑھی جو میں نے اپنے مشاہدے سے اخذ کئے تھے۔ مثال کے طور پر اس نے اپنے سابقہ منگیتر کے بارے میں کچھ کہا اور نہ یہی وضاحت کی کہ اُن کی منگنی کیوں ٹوٹ گئی تھی۔ میں نے بھی مزید کریدنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ البتہ اُس نے یہ ضرور بتایا کہ بفیلو میں اُس کا گھر فلمور کے علاقہ میں واقع ہے۔ اتنا ہی نہیں اُس نے اپنا فون نمبر بھی بتا دیا۔

ہم لاس اینجلیز سے گیارہ بجکر پچاس منٹ پر روانہ ہوئے تھے جب پانچ بجکر پچاس منٹ پر طیارہ ڈیٹورٹ پہونچا تو ہم گہرے دوست بن چکے تھے۔ طیارے کے ڈیٹورٹ سے پرواز کے تھوڑی دیر بعد میں ٹوائلٹ سے واپس لوٹ رہا تھا تو میں نے پچھلی سیٹ پر دو آدمیوں کو دیکھا جنھوں نے ایک دوسرے کے ہاتھوں کو ہتھکڑیوں سے باندھ رکھا تھا۔ دونوں کی عمر پینتالیس پچاس سال کے درمیان معلوم ہوتی تھی۔ یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں تھا کہ ان دونوں میں پولیس افسر کون ہے اور مجرم کون۔ کنارے کی سیٹ والا شخص لازمی پولیس افسر تھا۔ کیونکہ اُس نے ہتھکڑی اپنے بائیں ہاتھ کی کلائی میں پہن رکھی تھی جبکہ دوسرے شخص کا سیدھا ہاتھ جکڑا ہوا تھا۔ وہ بہت دُبلا اور لمبا سا آدمی تھا اور کسی حد تک ابراہم لنکن سے مشابہ نظر آ رہا تھا۔ دوسرا آدمی بھی لمبا تھا مگر اُس کا جسم بھاری تھا چہرہ پر گوشت اور جلد تانبہ کی رنگت کی تھی۔

طیارے کی میزبان مسافروں سے کھانے کے آرڈر لے رہی تھی۔ میں نے سُنا کہ ان دونوں نے اپنے کھانے کے ساتھ کافی کا آرڈر بھی دیا۔ میں نے اور ڈائنا نے سوئس اسٹیک کا آرڈر دیا۔ اور جب میزبان چلی گئی تو میں نے ڈائنا کو ان دونوں مسافروں کے بارے میں بتایا۔

"قیدی کا حلیہ کیا ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"ایسا جو پچاس سال کے کسی بھی شخص پر منطبق ہو سکتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

اس اثنا میں کھانا آ گیا اور ہم دوسری باتیں کرنے لگے۔

کھانے کے وقفہ کے بعد جب میزبان برتن جمع کر رہی تھی، پچھلی سیٹ سے کچھ گھبرائی ہوئی آوازوں نے ہمیں گھوم کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ طویل قامت زرد رُو پولیس آفیسر اپنے ساتھی کے بے حس و حرکت جسم کو اٹھا کر قطار کی درمیانی جگہ میں لٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے اپنی کلائی سے ہتھکڑی کھول دی تھی۔ مگر دوسرے آدمی کا ہاتھ ابھی آزاد نہیں ہوا تھا۔ پھر اُس نے جھک کر اُس کی نبض دیکھی۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر میزبان بھی لپکی ہوئی آئی۔ پولیس آفیسر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"میرا خیال ہے کہ اس پر دل کا دورہ پڑا ہے۔" وہ بولا۔ "نبض کی رفتار بیحد سست اور کمزور ہے۔"

ہماری طرح طیارے کے دوسرے مسافر بھی اپنی اپنی سیٹوں سے اُٹھ کر دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان ہی میں سے ایک چھریرے جسم کا آدمی جو بظاہر بڑا شریف نظر آ رہا تھا اور جس کی عمر چالیس پینتالیس سال کی معلوم ہو رہی تھی آگے بڑھا۔

"میں ڈاکٹر ہوں" اُس نے کہا

میزبان فوراً ایک طرف ہٹ گئی۔ پولیس افسر نے ڈاکٹر سے اپنا تعارف سارجنٹ کو پلینڈ کے نام سے کرایا۔ ڈاکٹر نے بیہوش آدمی کی نبض دیکھی۔ پھر ایک پلک اُٹھا کر اس کا معائنہ کیا اور پھر اس کے گریبان کے بٹن کھولتے ہوئے میزبان کی طرف دیکھا۔

"میرا بیگ میری سیٹ کے نیچے رکھا ہے مہربانی کر کے وہ لا دو"

میزبان نے جلدی سے بیگ اٹھا دیا۔ ڈاکٹر نے اسے کھول کر اسٹیتھسکوپ نکالا اور مریض کے دل کی دھڑکن سننے لگا۔

"خوش قسمتی سے طیارہ پر آکسیجن پہنچانے کا انتظام ہے۔" اُس نے میزبان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہم بفیلو کس وقت پہونچیں گے؟"

"اس وقت سات بجے ہیں۔" میزبان نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی "طیارہ پونے آٹھ بجے بفیلو اُترے گا۔"

"گویا ابھی پینتالیس منٹ باقی ہیں" ڈاکٹر بولا "میرا مشورہ ہے کہ تم پائلٹ سے کہہ کر ریڈیو کے ذریعہ ایئرپورٹ پر پیغام بھجوا دو وہاں ایک ایمبولنس مریض کو سٹی اسپتال لے جانے کے لئے موجود ہونا چاہیئے۔ ایمبولنس کے ساتھ کسی مددگار کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود بھی سٹی ہسپتال میں کام کرتا ہوں۔ اس لئے مریض کے ساتھ میں خود جاؤں گا

پھر سارجنٹ بھی ہمراہ ہوں گے۔ یہ پیغام دینے کے بعد مجھے ایک کمبل لا دو۔ مریض کو گرم رکھنے کی ضرورت ہے۔"

"بہت اچھا ڈاکٹر" میزبان نے جواب دیا اور پائلٹ کے کیبن کی جانب بڑھ گئی۔ ڈاکٹر سارجنٹ کی طرف متوجہ ہوا۔

"اسے اٹھا کر سیٹ پر لٹا دو تاکہ آکسیجن دی جا سکے۔" اس نے کہا پھر میری طرف دیکھا" طاقتور نوجوان معلوم ہوتے ہو۔ ذرا سہارا تو دو۔"

ہم تینوں نے مل کر مریض کو پشت کے بل سیٹ پر لٹا دیا۔ ڈاکٹر نے سیٹ کے ساتھ ہی لگا ہوا آکسیجن ماسک نکال کر اس کے منہ پر چڑھا دیا اور پھر اپنے آلے سے اس کے دل کی دھڑکن سننے لگا۔

"حالت زیادہ خراب نہیں ہے تو کچھ بہتر بھی نہیں ہے" وہ بولا "مناسب ہوگا کہ اس کی ہتھکڑی کھول دی جائے۔"

سارجنٹ نے اپنی جیب سے ایک چابی نکال کر ہتھکڑی کھول دی اور پھر دونوں چیزیں اپنی جیب میں رکھ لیں۔

"میرا نام مارٹن اسمتھ ہے۔" ڈاکٹر نے بتایا

"تم سے مل کر خوشی ہوئی" سارجنٹ نے ہاتھ ملاتے ہوئے جواب دیا "خوش قسمتی ہی ہے کہ تم جہاز پر موجود تھے۔"

"میرا نام البرٹ شیلٹن ہے" میں نے از خود اپنا تعارف کرایا۔

ڈاکٹر نے میرے تعاون کے لئے شکریہ ادا کیا۔

"یہ تو میرا اخلاقی فرض تھا۔" میں نے جواب دیا "ویسے میری سیٹ کی ساتھی ایک نرس ہے۔ ضرورت ہو تو اس کی مدد بھی مل سکتی ہے۔"

"نہیں سردست اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" ڈاکٹر نے چونک کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا اور پھر بالمقابل کی نشست کی طرف دیکھا جہاں اس وقت صرف ایک آدمی بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر نے مریض کے قریب رہنے کا عذر پیش کرتے ہوئے اس سے کسی دوسری سیٹ پر بیٹھنے کی درخواست جسے اس نے بڑی خوشی سے مان لیا۔

"اب تم چاہو تو کھڑکی کے قریب بیٹھ سکتے ہو۔" ڈاکٹر نے سارجنٹ سے کہا "تاکہ مریض کی حالت دیکھنے کے لئے مجھے تمہیں بار بار پریشان نہ کرنا پڑے۔"

"ضرور" سارجنٹ نے جواب دیا "ابھی ابھی ایک خیال میرے ذہن میں آیا ہے۔ ذرا اس کی تصدیق یا تردید کر لوں۔"

اور پھر مریض پر جھکتے ہوئے سارجنٹ کو بلینڈ نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ آخر کار وہ ایک جیب سے کوئی چھوٹی سی شیشی برآمد کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس میں کوئی رقیق مادہ بھرا ہوا تھا۔ سارجنٹ نے شیشی ڈاکٹر کے ہاتھ میں دے دی۔ اپنی سیٹ سے اچک کر دیکھتے ہوئے میں نے اس کا لیبل پڑھا۔ اس پر ایسی شکر کی گولیوں کا نام لکھا ہوا تھا جس میں کیمیاوی عمل سے انتہائی مٹھاس مرتکز کر دی جاتی ہے۔

"یہ تو عام گولیاں ہیں" ڈاکٹر بولا "جنھیں شکر کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔"

"کھانے کے وقت وہ یہ گولیاں کافی میں ڈالنا چاہتا تھا" سارجنٹ نے بتایا "شیشی دیکھنے کے بعد میں نے اجازت دیدی۔ مگر ابھی ابھی مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے اس شیشی میں کسی اور طرح کی گولیاں ہوں اور اس نے نیویارک واپس جانے اور اپنی سزا میں مزید بیس سال کے اضافے سے بچنے کے لئے خودکشی کرنی چاہی ہو۔"

"ہوں" ڈاکٹر نے سوچنے کے انداز میں شیشی کا ڈھکنا کھولا اسے سونگھ کر دیکھا "اگر ایسی کوئی بات ہے تو میں یہ شیشی بھی اپنے ساتھ ہسپتال لے جاؤں گا تاکہ وہاں لیبارٹری میں تجزیہ کر کے معلوم کیا جا سکے۔ اس طرح تو کچھ بتانا ممکن نہیں۔" اس نے شیشی اپنی جیب میں ڈال لی۔

"لیکن اگر یہ شخص حراست میں تھا تو اس کے پاس یہ شیشی کہاں سے آ گئی۔" اس نے سوال کیا۔

"دوبارہ گرفتار کئے جانے سے پہلے یہ کئی ہفتے آزاد رہا ہے۔" سارجنٹ نے جواب دیا "چھ ہفتے قبل یہ سنگ سنگ کے جیل خانے سے فرار ہو گیا تھا۔ اور صرف ایک ہفتہ ہوا کہ اسے ویسٹ کوسٹ پر پکڑا گیا ہے۔ ممکن ہے اس عرصہ میں اس نے یہ سوچ کر کہ دوبارہ گرفتاری سے موت بہتر ہے کسی وقت یہ شیشی خرید کر ضرورت کے وقت کام آنے کے لئے رکھ چھوڑی ہو۔"

"یہ کس جرم میں سزا کاٹ رہا تھا؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"اس پر تین درجن سے زیادہ ڈکیتیوں کا الزام تھا" سارجنٹ نے بتایا "کیا تم نے ولی دی پیرٹ ڈائل کا نام نہیں سنا۔"

"ہاں کچھ خیال تو آتا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا "مگر یہ تو کئی سال کی بات ہے۔"

"تقریباً بارہ سال کی۔" سارجنٹ نے جواب دیا "یہ ڈوئل نامی گروہ کا سردار تھا۔ گروہ میں آٹھ نو بدمعاش شامل تھے۔ ولی اور دو مجرموں کے علاوہ باقی سب یا تو جیلوں میں ہیں یا مر چکے ہیں۔ جو دو باقی ہیں ان میں ایک ولی کا چھوٹا بھائی جم ہے اور دوسرا اس کا کزن ایڈی

گرین۔ یہ دونوں مفرور ہیں۔ ایڈی گرین تو کبھی پکڑا ہی نہیں گیا۔ چنانچہ پولیس کے پاس اُس کا کوئی فوٹو بھی نہیں ہے۔ البتہ جم کا ریکارڈ موجود ہے میں نے اُس کا فوٹو بھی دیکھا ہے۔ اس کی صورت ولی سے بہت ملتی ہے۔"

میں پیچھے کھڑا ہوا ان کی باتیں سُن رہا تھا۔ "ولی کا نام ولی دی پیرٹ کیسے پڑا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ ڈاکہ مارتے وقت کسی طوطے کی طرح مسلسل ٹرّاتا رہتا تھا" سارجنٹ نے جواب دیا۔ "کبھی بینک کے ملازمین سے باتیں کرتا۔ گاہکوں کو طرح طرح کی ہدایات دیتا اور خواتین سے معذرت طلب کرتا۔ بدصورت عورتوں سے کہتا کہ وہ انتہائی حسین نظر آرہی ہیں وغیرہ وغیرہ۔"

"اور ایڈی گرین؟"

دراصل وہ ڈاکو سے زیادہ نوسرباز معلوم ہوتا تھا۔" سارجنٹ نے بتایا۔ "اُس کے کام کرنے کا طریقہ کچھ ایسا ہی تھا جس بینک میں ڈاکے کا پروگرام ہوتا وہ جا کر اُس کے منیجر سے ملاقات کرتا۔ کہتا کہ وہ ایک صنعتکار ہے اور شہر میں اپنی فیکٹری کی برانچ قائم کرنا چاہتا ہے اور کیا بینک میں اتنی گنجائش ہے کہ وہ دس لاکھ ڈالر ماہانہ کی تنخواہوں کا انتظام اور حساب کتاب رکھ سکے۔ نتیجہ میں منیجر اُسے متاثر کرنے کی غرض سے اپنے یہاں کے حفاظتی اور دوسرے انتظامات پوری تفصیل سے اُسے سمجھاتا اور کہتا کہ وہ اس کے بینک میں اپنا اکاؤنٹ کھولے تو اس کی رقم ہر طرح محفوظ رہے گی۔"

اس وقت طیارے کی میزبان کمبل لے کر واپس آئی۔

"پائلٹ نے تمہارا پیغام پہنچا دیا ہے" اُس نے ڈاکٹر کو بتایا "ایمبولنس مقررہ وقت پر ایرپورٹ آجائے گی۔ اُس نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ ڈرائیور کے علاوہ کسی آدمی کی ضرورت نہیں ہوگی۔"

"ٹھیک ہے" ڈاکٹر نے اظہارِ خوشنودی کے طور پر سر ہلایا۔ اور کمبل مریض کو اُڑھا دیا۔

"اب اس کی حالت کیسی ہے؟" میزبان نے پوچھا۔

"اچھی نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا "مگر بہرحال وہ ابھی زندہ ہے۔"

میزبان واپس چلی گئی۔ ڈاکٹر نے سارجنٹ کی طرف دیکھا۔

"کیا تم ایمبولنس پر میرے ساتھ چلو گے" اُس نے پوچھا۔

"یقیناً"

"مریض کی حالت ایسی تو نہیں کہ وہ بھاگ سکے۔ پھر وہاں ہسپتال میں بھی قیدیوں کا وارڈ الگ ہوتا ہے صحت یاب ہونے پر بھی وہ وہاں سے فرار نہیں ہو سکتا۔ یوں بہرحال یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔"

"جی ہاں۔ میں اپنے قیدی کے ساتھ ہی رہنا پسند کروں گا" سارجنٹ نے جواب دیا۔

"اگر اس کی یہ حالت کسی زہر کے استعمال کے بجائے سچ مچ دل کے دورے کا نتیجہ ہو تو کم سے کم ایک ماہ تک اسے ہسپتال میں رہنا ہوگا۔ تم اتنی مدّت تک تو اس کے ساتھ نہیں رہو گے۔"

"جی نہیں ایسی صورت میں اسے بفیلو پولیس کی نگرانی میں دے کر واپس لوٹ جاؤں گا اور جب وہ دوبارہ سفر کرنے کے قابل ہو جائے گا۔"

"ممکن ہے اسے میرے چارج میں ہی دے دیا جائے۔"

ڈاکٹر نے کہا "اگر تم مجھے اپنا کارڈ دیدو تو میں تمہیں اُس کی حالت سے مطلع کرتا رہوں گا۔"

سارجنٹ نے اپنا بٹوہ نکال کر اس کی جیبیں ٹٹولیں۔ "اتفاق سے اس وقت میرے پاس کوئی کارڈ نہیں ہے۔" اُس نے جواب دیا۔

"کوئی کاغذ دو تو میں اس پر اپنا نام و پتہ لکھ دوں۔"

ڈاکٹر نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ہوائی ٹکٹ کا لفافہ برآمد کیا اور سارجنٹ کے ہاتھ میں دے دیا۔ سارجنٹ نے لفافہ اپنے گھٹنے پر رکھا اور قلم نکال کر اس پر لکھنے لگا۔ اس فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈائنا نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"جب تم نے انھیں میری خدمات کی پیشکش کی تو میں ڈر ہی گئی تھی۔" وہ بولی "میں رجسٹرڈ نرس نہیں ہوں۔"

"مگر تم تو کہہ رہی تھیں کہ ہو" میں نے اسے تعجب سے دیکھا۔

"میں نے نہیں تم نے کہا تھا" اُس نے جواب دیا "اور میں نے اس خیال سے اس کی تردید نہیں کہ تم اس وقت سراغرسانی کے موڈ میں تھے کہیں میرے انکار سے تمہارے جذبات کو ٹھیس نہ پہونچے۔"

"اوہ" مجھے کچھ مایوسی ہوئی مگر پھر سنبھل کر بولا "بہرحال ڈاکٹر نے تمہاری ضرورت نہیں سمجھی۔"

اچانک میرے ذہن میں کوئی خیال ابھرا اور میں چونک کر سیدھا ہو گیا۔

"کیا بات ہے۔" ڈائنا نے پوچھا۔

"میں نے ابھی سارجنٹ کو پلینیڈ کو قلم سے لکھتے دیکھا تھا" میں نے بتایا "اور جانتی ہو وہ بائیں ہاتھ سے لکھ رہا تھا۔"

"تو پھر؟"

"تو پھر یہ کہ اُس نے قیدی کو اپنے بائیں ہاتھ سے کیوں

باندھ رکھا تھا؟"
"ہاں یہ بات ہے تو عجیب سی" ڈائنا کچھ غور کرنے کے بعد بولی
"حقیقت یہ ہے" میں بالکل آہستہ بات کر رہا تھا "کہ ہمارے پاس صرف سارجنٹ کو بلینڈ ہی کا بیان ہے کہ وہ پولیس افسر ہے اور دوسرا شخص ایک مجرم اور اُس کا قیدی ہے"
"میں سمجھی نہیں۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"
"ذرا دونوں کو غور سے دیکھو" میں نے سرگوشی میں کہا "قیدی کی کھال کی رنگت تانبے کی طرح ہے۔ یہ قطعی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ دس سال تک جیل میں رہ چکا ہے۔ اس کے مقابلے میں سارجنٹ کا چہرہ بالکل زرد پڑا ہوا ہے"
"وہ چھ ہفتے قبل جیل سے فرار ہوا تھا" ڈائنا نے جواب دیا۔
"یہ مدت چہرے کی رنگت دھوپ کی تمازت سے تانبے کی طرح کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس کے علاوہ جو لوگ نیویارک میں رہتے ہیں اُن کے چہرے عام طور پر زرد ہو جاتے ہیں"
"جو لوگ دفتروں یا فلیٹوں میں مقید رہتے ہیں اُن کے یقیناً ہو جاتے ہوں گے" میں نے کہا "لیکن ایک پولیس افسر کا چہرہ زرد ہونے کی کوئی وجہ نہیں جسے زیادہ تر باہر رہنا پڑتا ہے"
"جو کچھ تم اندازہ لگا رہے ہو اگر وہ درست ہو" ڈائنا کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی "تو پھر اس پر عمل کرنا اس کے لئے کیسے ممکن ہوا؟"
میں نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنے خیالات کو ترتیب دینے کے لئے تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔
"فرض کرو" آخر میں نے کہا "کہ دونوں آدمی بائیں ہاتھ سے کام کرنے والے ہیں۔ اس صورت میں حقیقی سارجنٹ کو بلینڈ قیدی کو اپنے داہنے ہاتھ کے ساتھ جکڑے گا تاکہ اس کا بایاں ہاتھ ضرورت پڑنے پر ریوالور نکالنے کے لئے آزاد رہے۔ میرا اندازہ ہے کہ شیشی میں کسی قسم کا زہر ہے جو ولی نے کسی نہ کسی طرح سارجنٹ کی کافی میں ڈال دیا۔ اس کے بعد سارجنٹ کے بیہوش ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ پھر اُس کے بیہوش ہوتے ہی اس کا بٹوہ نکال کر اپنی جیب میں رکھ لیا اور اپنا بٹوہ اس کی جیب میں ڈال دیا۔ اس کا ریوالور کھول کر خود اپنی کمر سے باندھ لیا۔ پھر زہر کی شیشی بھی اس کی جیب میں ڈال دی۔ سارجنٹ کی جیب سے چابی حاصل کر کے اپنے ہاتھ کی ہتھکڑی کھول لی مگر اس کے ہاتھ میں بندھی رہنے دی۔"
"یہ بات تھی تو اُس نے خود ہی ڈاکٹر کی توجہ زہر کی شیشی کی طرف مبذول کیوں کرائی؟" ڈائنا نے اعتراض کیا۔
"اس لئے کہ جب ہسپتال میں مریض کے تفصیلی معائنہ کے بعد یہ ظاہر ہو کہ اس پر دل کا دورہ نہیں پڑا بلکہ اسے زہر دیا گیا ہے تو کوئی اس نام نہاد سارجنٹ پر شبہ نہ کرے، کیونکہ وہ پہلے ہی نہ صرف زہر کی شیشی بلکہ اس کے بارے میں ایک ممکن کہانی بھی بیان کر چکا ہے۔ بفیلو میں کوئی سارجنٹ کو بلینڈ کا صورت آشنا نہیں۔ وہ بڑی آسانی سے اپنے قیدی کو پولیس کی نگرانی میں دے کر اس سے قبل کہ کوئی یہ جان سکے کہ مریض ہی اصل میں سارجنٹ کو بلینڈ ہے کہیں بھی فرار ہو سکتا ہے۔"
"سوائے اس صورت کے کہ مریض کو ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہوش آجائے" ڈائنا نے کہا۔
"ہاں۔ یہ امکان ضرور موجود ہے" میں نے اعتراف کیا "شاید اسی لئے ہمارا زرد چہرہ دوست اس کے ساتھ ایمبولنس میں ہسپتال جانے پر مصر ہے کہ اسے راستے میں ہوش نہ آسکے۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ ہم بھی کوئی بہانہ کر کے ان کے ساتھ ہی چلیں"
"وہ کس لئے؟" ڈائنا چونکی۔
"اس لئے کہ نام نہاد سارجنٹ کو بلینڈ اگر راستے میں اپنے مریض کو ختم کرنے کی کوشش کرے تو اسے روک سکیں"
"کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ تم ایئرپورٹ سے پولیس کو فون کر کے اپنے خدشات سے آگاہ کر دو۔ وہ خود کوئی انتظام کر لے گی"
"اور جب تک وہ کوئی انتظام کرے گی مریض دوسرے جہان کو سدھار چکا ہوگا" میں نے جواب دیا "شاید تمہیں یہ خطرہ ہے کہ ایمبولنس میں جانے سے خود ہمیں کوئی نقصان نہ پہنچے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ جب تک ہمارے دوست کو یہ اطمینان ہے کہ کوئی اس پر شبہ نہیں کر رہا۔ وہ کوئی حماقت نہیں کرے گا اور مریض کی حالت ایسی ہے کہ مجھے یقین نہیں کہ اسے ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہوش آسکے۔ میں صرف اس لئے ساتھ جانا چاہتا ہوں کہ ہماری موجودگی اسے کوئی مزید قدم اٹھانے سے باز رکھے گی اب بتاؤ کہ تم آمادہ ہو۔ یا نہیں؟"
"لیکن ہم ایمبولنس میں کیسے جاسکیں گے"
"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو" میں نے جواب دیا "وہ تمہیں نرس خیال کر رہے ہیں۔ اور میں نے ابھی تک اپنے بارے میں نہیں بتایا کہ میں کون ہوں"
میں اٹھ کر پچھلی سیٹ کی طرف گیا۔ ڈاکٹر ایک مرتبہ پھر مریض کے دل کی حرکت کا معائنہ کر رہا تھا۔
"ڈاکٹر" میں نے اسے مخاطب کیا "میں یو۔ سی۔ ایل۔ اے میں میڈیکل کا طالب علم ہوں اور میری ساتھی رجسٹرڈ نرس ہے۔ ہم ایمبولنس میں مریض کے ساتھ جانے کے لئے اپنی خدمات پیش کرتے ہیں"

"اس طرح ایمبولنس میں زیادہ آدمی ہو جائیں گے۔" سارجنٹ نے اعتراض کیا۔

"نہیں خیر جگہ تو بہت ہو گی۔" ڈاکٹر بولا "ہسپتال سے ایمبولنس کے ساتھ صرف ڈرائیور ہی آئے گا۔"

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے نام نہاد سارجنٹ کو یہ بات کچھ پسند نہیں آئی۔ مگر چونکہ وہ ڈاکٹر کی بات رد نہیں کر سکتا تھا اس لئے خاموش ہو گیا۔ بفیلو میں جب ہمارا طیارہ ایرپورٹ پر اترا تو حسب توقع ایمبولنس انتظار کر رہی تھی۔ سب سے پہلے مریض کو اتارا گیا۔ میں نے ڈاکٹر اسمتھ اور نام نہاد سارجنٹ نے جسے میں ولی دی پیرٹ سمجھ رہا تھا مریض کو اسٹریچر پر ڈال کر ایمبولنس میں سوار کرا دیا۔ ڈائنا بھی ہمارے ساتھ تھی۔ ایرپورٹ پولیس کے ایک جوان نے بھی ہمارے ساتھ جانے کی کوشش کی مگر ڈاکٹر نے منع کر دیا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ڈاکٹر نے دروازہ بند کیا اور ڈرائیور کو چلنے کی ہدایت کی۔ روانہ ہوتے وقت ایمبولنس کی سرخ روشنی بھی جل رہی تھی اور سائرن بھی بج رہا تھا مگر ایرپورٹ کے گیٹ سے کچھ دور پہنچتے ہی ڈرائیور نے دونوں چیزیں بند کر دیں۔

"ڈرائیور" اچانک ڈائنا بولی "یہ تم شمال کی جانب کیوں گھوم رہے ہو؟"

ڈرائیور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دزدیدہ نظروں سے میں دیکھ رہا تھا کہ ڈاکٹر اسمتھ اپنا بیگ کھول رہا ہے۔ مگر بیشتر توجہ زرد چہرہ والے آدمی پر مرکوز تھی کہ اگر وہ کوئی غلط حرکت کرے تو اسے روکا جا سکے۔ اور اس نے کی۔ وہ ڈاکٹر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس کا سیدھا ہاتھ کوٹ کے اندر غائب ہوا اور پھر باہر نکلا اور اس میں اعشاریہ ۳۸ بور کا سرکاری ریوالور دبا ہوا تھا۔

فوج میں ہمیں اس قسم کی صورت حال سے نپٹنے کی خاص تربیت دی گئی تھی۔ میں نے پھرتی سے زرد چہرہ آدمی کی کلائی پر ہاتھ مارا اس کے منہ سے ایک کراہ سی نکلی اور دوسرے لمحہ ریوالور میرے قبضہ میں تھا۔

"شکریہ" ڈاکٹر نے بڑے کھرے لہجہ میں کہا "میں تو سمجھ رہا تھا کہ یہ مجھے کامیاب نہیں ہونے دے گا۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا اور میرا منہ لٹک گیا۔ ڈاکٹر اعشاریہ ۴۵ بور کے بھاری ریوالور سے ہم سب کو زد میں لئے ہوئے تھا۔

میں نے اپنی گود میں پڑے ہوئے ریوالور کو حسرت سے دیکھا۔

"میں کچھ سمجھا نہیں" میں بولا

"مگر میں سمجھ گیا ہوں" سارجنٹ کو بلینڈ نے اپنی کلائی سہلاتے ہوئے کہا "ڈاکٹر اسمتھ حقیقت میں لیڈی گرین کا دوسرا نام ہے۔ اور یہ دل کا مصنوعی دورہ فرار کے منصوبہ کا ایک حصہ تھا۔"

"بالکل ٹھیک" اچانک اسٹریچر پر لیٹے ہوئے مریض نے بڑی پھرتی سے میرا ریوالور اٹھا لیا "شیشی میں اسپارٹین سلفیٹ تھا۔ اس کے استعمال کرنے سے دل کی حرکت وقتی طور پر کمزور پڑ جاتی ہے ممکن ہے کوئی ڈاکٹر دل کے دورے کے فریب میں نہ آئے مگر ایک عام آدمی کو بہ آسانی دھوکا دیا جا سکتا ہے۔" اس نے نقلی ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

"تم نے ان دونوں کو ایمبولنس میں آنے کا موقع کیوں دیا" اس نے پوچھا۔

"میرا خیال تھا کہ ایرپورٹ پولیس کا کوئی آدمی بھی ہمارے ساتھ آنے کی کوشش کرے گا جیسی کہ اس نے کی بھی لیکن ان لوگوں کی موجودگی ایمبولنس میں جگہ کی تنگی کا معقول عذر ثابت ہوئی"

"کیا تم بتاؤ گے کہ تم نے میرا ریوالور کیوں چھینا" سارجنٹ نے مجھ سے سوال کیا۔

"مجھے افسوس ہے سارجنٹ" میں نے شرمندگی سے جواب دیا۔ "میرا خیال تھا کہ تم اصل میں ولی دی پیرٹ ہو اور تم نے کسی طرح اصلی سارجنٹ کو بیہوش کر کے اس کی شخصیت اختیار کر لی ہے۔"

"یہ خیال تمہیں کیسے ہوا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"میں نے تمہیں بائیں ہاتھ سے لکھتے ہوئے دیکھا۔ اس کے علاوہ تم نے قیدی کو اپنی الٹی کلائی کے ساتھ باندھ رکھا تھا پھر تمہارا چہرہ بھی بہت پیلا نظر آ رہا تھا۔ میں سمجھا کہ یہ زردی ایک طویل مدت تک جیل میں بند رہنے کی وجہ سے ہو سکتی ہے۔"

"میں الٹے ہاتھ سے لکھتا ہوں اور سیدھے ہاتھ سے نشانہ لگاتا ہوں" سارجنٹ نے بتایا "اور چہرے کی زردی اس لئے ہے کہ میں نیویارک میں رات کی شفٹ میں کام کرتا ہوں۔"

"اوہ" ظاہر ہے کہ میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا۔

"یہاں حالات قابو میں ہیں جم؟" ولی نے ڈرائیور کو مخاطب کیا "تمہیں تو کوئی دشواری پیش نہیں آئی"

"بالکل نہیں" جم نے جواب دیا۔ "جیسے ہی ایمبولنس قریب آئی میں نے ٹرک سے اس کا راستہ بند کر دیا۔ اس میں صرف ڈرائیور تھا۔ جسے باندھ کر ٹرک میں ڈالنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ یہاں سے کچھ دور سیڈان کار تیار کھڑی ہے۔ اس میں سوار ہو کر اس سے پہلے کہ کسی کو حقیقت کا علم ہو ہم بہ آسانی کینیڈا پہنچ سکتے ہیں۔"

"یہ تمہارا چھوٹا بھائی جم ہے" سارجنٹ نے ولی سے پوچھا

"ہاں" ولی نے اثبات میں سر ہلایا "ہم ڈوئل خاندان کے لوگ ہمیشہ ساتھ ساتھ رہنا پسند کرتے ہیں"

"ہمارے بارے میں تمہارا کیا پلان ہے"

"اچھا سوال ہے سارجنٹ" ولی مسکرایا "تم میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے"

مجھے سردی کی ایک تیز لہر اپنے پورے جسم میں رینگتی محسوس ہوئی۔ میں نے معذرت خواہانہ نظروں سے ڈائنا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں مگر وہ بڑے حوصلے سے مسکرائی۔ ولی نے اپنے ساتھی ایڈی کی جانب دیکھا اور یہ دیکھ کر کہ وہ ہم سب کو بڑی اچھی طرح زد میں لئے ہوئے ہے اپنا ریوالور کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ جعلی ڈاکٹر کا ریوالور۔ اُس کے گھٹنے پر ٹکا ہوا تھا۔ نال اس طرح اٹھی تھی کہ اسے ضرورت کے وقت کسی بھی جانب موڑا جاسکتا تھا۔ ڈائنا نے ایڈی کی طرف دیکھ کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا "کیا میں اپنے بیگ سے رومال نکال سکتی ہوں"

"بڑے شوق سے" ایڈی نے اجازت دے دی۔

ڈائنا نے اپنا بیگ کھول کر اُس میں ہاتھ ڈالا۔ اور پھر جو اُس کا ہاتھ باہر نکلا تو اس میں اعشاریہ ۳۰ بور کا ایک ویسا ہی ریوالور دبا ہوا تھا جیسا میں نے سارجنٹ کے پاس دیکھا تھا۔ اتنا ہی نہیں اس سے پہلے کہ ایڈی کوئی حرکت کر سکے ڈائنا ریوالور اس کی طرف تان چکی تھی میں تو خیر حیران تھا ہی ایڈی بھی کسی بت کے مجسمے کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا رہ گیا۔

"اگر تم نے اپنا ریوالور نکالنے کی کوشش کی" ڈائنا بڑی سپاٹ آواز میں ولی سے مخاطب تھی۔ "تو میں پہلے تمہارے کزن ایڈی کو شوٹ کروں گی اور پھر تمہیں بھی گولی ماردوں گی۔ اور تم ایڈی۔ اپنے ریوالور کا سیفٹی کیچ لگاکر اسے میری طرف پھینک دو" وہ اتنے آہستہ لہجہ میں بول رہی تھی۔ ڈرائیور جم اس کی بات نہیں سن سکتا تھا۔

ایڈی نے ناچار حکم کی تعمیل کی۔ ڈائنا نے اس کا ریوالور سارجنٹ کو بلینڈ کو دے دیا۔ پھر ولی کی جیب سے سارجنٹ کا اپنا ریوالور نکال کر اسے بھی سارجنٹ کے حوالے کر دیا۔ سارجنٹ نے اپنا ریوالور ہاتھ میں آتے ہی اس کی نال جم کی پیٹھ سے لگاکر ایمبولنس رکنے اور پھر اپنا ریوالور نکال کر دینے کی ہدایت کی۔ جم کو بھی اس حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔

جب تک تینوں ڈاکوؤں کو مکمل طور پر قابو میں نہیں کر لیا گیا میں نے یا سارجنٹ کو بلینڈ نے اس مسئلہ میں سر کھپانے کی کوشش نہیں کی کہ ڈائنا کے پاس ریوالور کہاں سے آگیا۔ سارجنٹ نے ولی کے ہاتھ اس کی پشت کی جانب کر کے باندھ دیئے۔ پھر ایڈی کی ٹائی کھول کر اُس کے ساتھ اور ولی کی ٹائی کھول کر جم کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ آخر کار جب ان تینوں کو ایمبولنس میں بھر دیا گیا تو سارجنٹ نے ڈائنا کی طرف دیکھا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ نرسیں بھی ریوالور لے کر سفر کرتی ہیں" وہ بولا

"میں نرس نہیں ہوں" ڈائنا نے جواب دیا "میرا تعلق پولیس سے ہے"

"پولیس سے!" میں نے حیرت سے دوہرایا۔

"ہاں تمہیں کوئی اعتراض ہے" وہ عجیب لہجہ میں بولی۔

"بالکل نہیں" میں نے جواب دیا "اس کے برعکس اگر محکمہ پولیس کا کوئی رکن کسی پرائیویٹ سراغرساں کا دوست ہو تو یہ اُس کی خوش قسمتی سمجھی جاتی ہے۔ پھر تم جیسا دوست"

"اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ میں نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے تو شاید تمہارے یہ جذبات نہ رہیں"

"کیا؟" میں چونکا۔

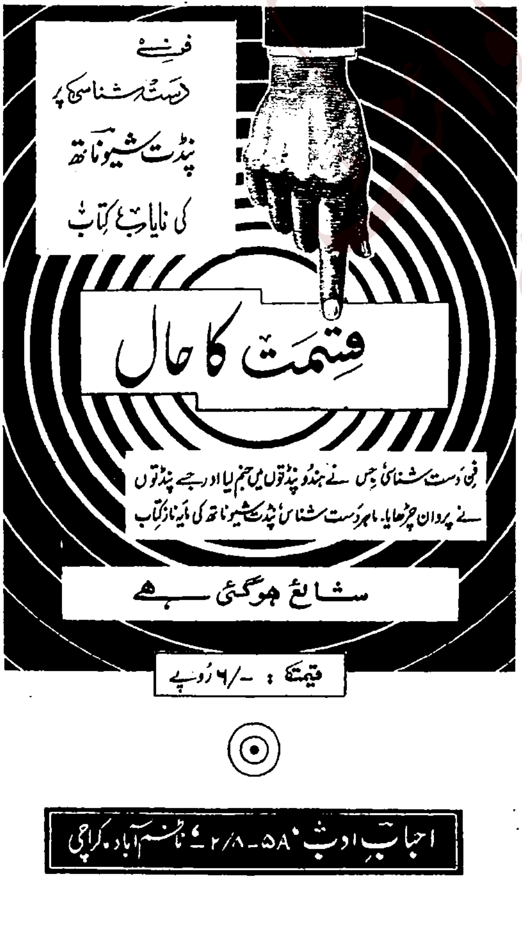

"ہم اس مسئلہ پر بعد میں گفتگو کریں گے۔" ڈائنا نے جلدی سے کہا "پہلا کام تو ان مجرموں کو پولیس ہیڈ کوارٹر پہونچانا ہے"

"ٹھیک ہے" سارجنٹ نے تائید کی اور میری طرف دیکھا "کیا تم ایمبولنس چلا سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں"

"تو پھر تم ایمبولنس ڈرائیو کرو۔ میں پچھلے حصّہ میں قیدیوں کی نگرانی کرتا رہوں گا۔ مس وارٹن چاہیں تو تمہارے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ سکتی ہیں۔"

چنانچہ ڈائنا میرے ساتھ آ بیٹھی۔ ایمبولنس روانہ ہوئی۔

ہم کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔

"تم کیا کہہ رہی تھیں؟" آخر مجھے بولنا ہی پڑا۔

"تم ضرور مجھ پر ناراض ہو گے" وہ کچھ شرمندگی سے بولی "بات یہ ہے کہ جب تم اپنی سُراغ رسانی کا مظاہرہ کر رہے تھے تو میں نے کئی باتوں میں جھوٹ بولا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ جھوٹ نہیں بولا محض خاموش رہ کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ تمہارے اندازے درست ہیں جبکہ وہ غلط تھے۔"

"اوہ" میں نے کہا "کونسے اندازے؟"

"مثلاً یہ کہ میں لاس اینجلیز میں سیر و تفریح کے لئے نہیں گئی تھی۔" ڈائنا نے بتایا "میں یو۔ سی۔ ایل۔ اے میں کرمنالوجی کا کورس پڑھ رہی ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ میں نے کئی ہفتہ ساحل سمندر پر گذارے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میری رنگت تانبے کی طرح ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے بفیلو یونیورسٹی میں نہیں پڑھا بلکہ فریڈونیا اسٹیٹ کالج میں تعلیم حاصل کی ہے۔"

"تب پھر بفیلو یونیورسٹی کی انگوٹھی کیوں پہنے ہوئے ہو؟"

"یہ میری نہیں، میرے ایک دوست لڑکے کی ہے۔" اس نے جواب دیا "یہاں ایک دستور یہ بھی ہے کہ لڑکیاں لڑکوں کی تعلیمی انگوٹھیاں اپنی منگنی والی انگلی میں پہن لیتی ہیں۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ کسی ایک لڑکے کے ساتھ باہر جا رہی ہیں اور ادھر ادھر بھٹکنے کے لئے تیار نہیں اس لئے بیکار کوشش نہ کی جائے۔"

"مگر یہ انگوٹھی تم اپنی منگنی والی انگلی میں نہیں پہنے ہو۔" میں نے اعتراض کیا۔

"درست ہے۔" ڈائنا نے جواب دیا "لیکن ایک دن قبل تک اسی انگلی میں تھی۔ میرے دوست کو یہ پتہ نہیں کہ میں نے اسے دوسری انگلی میں پہننا شروع کر دیا ہے۔"

"اوہ۔ گویا تمہارا منگیتر لاس اینجلیز میں نہیں رہتا اور تم نے اپنی منگنی اسے بتائے بغیر ختم کر دی ہے۔"

"منگنی نہیں" ڈائنا نے کہا "جیسا کہ میں نے کہا یہ صرف کسی ایک لڑکے کے ساتھ باہر جانے کی علامت ہے جو بعد میں منگنی کے اعلان میں بھی تبدیل ہو سکتی ہے۔ مگر جہاں تک میرے دوست کا تعلق ہے تو میں کئی ماہ سے اس کے ساتھ ترک تعلق پر غور کر رہی تھی لیکن چونکہ کوئی اور ایسا شخص نہیں تھا جو اس کی جگہ لے سکتا اس لئے میں نے انگوٹھی اتارنے کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں کی۔"

"تو پھر اب کیوں اتار دی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"جب ہم لوڈنگ گیٹ کے سامنے قطار میں کھڑے تھے تو میں نے تمہاری نگاہوں سے اندازہ لگایا کہ تم مجھے پسندیدگی سے دیکھ رہے ہو۔ میں نے سوچا ممکن ہے طیارے میں تم میرے برابر کی سیٹ پر بیٹھنے کی کوشش کرو اور ایسی صورت میں شاید تمہیں میری منگنی کی انگلی میں انگوٹھی دیکھ کر مایوسی ہو چنانچہ میں نے اسے اتار کر سیدھے ہاتھ میں پہن لیا۔"

یہ انکشاف کہ جب میں طیارے میں اس پر اپنی سراغرسانی کا رعب ڈال رہا تھا تو وہ دل ہی دل میں میری سادہ لوحی پر مسکرا رہی ہوگی مجھے اس سے برہم نہیں کر سکا۔ جیسا کہ اسے اندیشہ تھا۔ البتہ اُس نے میرے احساس برتری کو ضرور ٹھیس پہونچائی تھی۔ اُس کا یہ کہنا کہ میرے اندازے غلط تھے دراصل اُس کی ایک اور مہربانی ہی تھا ورنہ حقیقت میں میرا صرف ایک ہی خیال درست تھا کہ وہ بفیلو کی رہنے والی ہے اور بس۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ بات بڑی حوصلہ افزا تھی کہ اُس نے میری پسندیدگی کا اس حد تک خیال کیا کہ اپنے ہاتھ سے انگوٹھی اتار دی۔ اس کا مطلب تھا کہ میری پسندیدگی یک طرفہ نہیں بلکہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ چنانچہ ممکن ہے کہ سراغرسانی اور مشاہدے سے اندازہ لگانے کے فن میں میں اتنا کامیاب ثابت نہ ہوا ہوں لیکن اتنا تو آپ بھی تسلیم کریں گے کہ میرے اندر کوئی خوبی ایسی ضرور ہے کہ جو ڈائنا جیسی حسین رفیقۂ حیات حاصل کرنے میں کامیابی کی منزل تک پہونچا سکتی ہے۔

خوابوں کا شہزادہ

جب روحی نے طغرل بے سے شادی کی تو اس نے شادی کی شرائط کو چنداں اہمیت نہیں دی —— اسے اپنے باس سے محبّت نہیں تھی تاہم وہ اسے بڑی حد تک پسند کرتی تھی۔ اسے پوری توقع تھی کہ شادی کے بندھن اتنی آسانی سے نہیں ٹوٹیں گے۔ پینتیس سال کی عمر کو پہونچ کر اس نے بھی کسی رومانی خوابوں کے شہزادے کے خواب دیکھنے چھوڑ دیئے تھے اور اب یہی خواہش رہ گئی تھی کہ باقی ماندہ زندگی محض آسودگی سے گزر جائے۔ رومان کا شیش محل تو ملنے سے رہا۔ اس نے ایک اچھی گرہستن ثابت ہونے کا مصمم ارادہ کر رکھا تھا

آزرہ وقار

شادی کی شرائط یہ تھیں کہ اگر روحی نے شوہر سے طلاق لینے کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ ورثے اور گذارے کی رقم کے دعوے سے دستبردار ہو کر ہی ایسا کر سکے گی! اسکی شادی کو جتنا عرصہ گزرے گا، اس کو سالانہ دو ہزار پونڈ کے حساب سے یکمشت ملنے والی رقم پر اکتفا کرنا ہوگا۔ اس رقم کی ادائیگی کے بعد سارے معاملات ختم ہو جائیں گے اور طغرل بے مزید کسی قسم کے لین دین کا ذمّہ دار نہیں ہوگا۔ اس کے وکیل نے روحی کو یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ اگر طغرل بے نے ایسا کوئی قدم اُٹھایا تو ان شرائط کا اطلاق نہیں ہوگا۔ یہ شرائط صرف روحی کے لئے تھیں۔ علاوہ ازیں اگر انہیں اولاد ہوئی تو وہ اپنے قانونی حق سے محرُوم نہیں رہے گی۔ خواہ طلاق روحی ہی کیوں نہ لے۔

طغرل بے کی ایسی شرائط رکھنے کی معقول وجہ تھی۔ اسکی سابقہ بیوی نے جو روحی ہی کی طرح اس کی سیکریٹری رہ چکی تھی۔ شادی کے صرف ایک سال بعد ہی اسے تقریباً دو لاکھ پونڈ کی چوٹ دی تھی۔

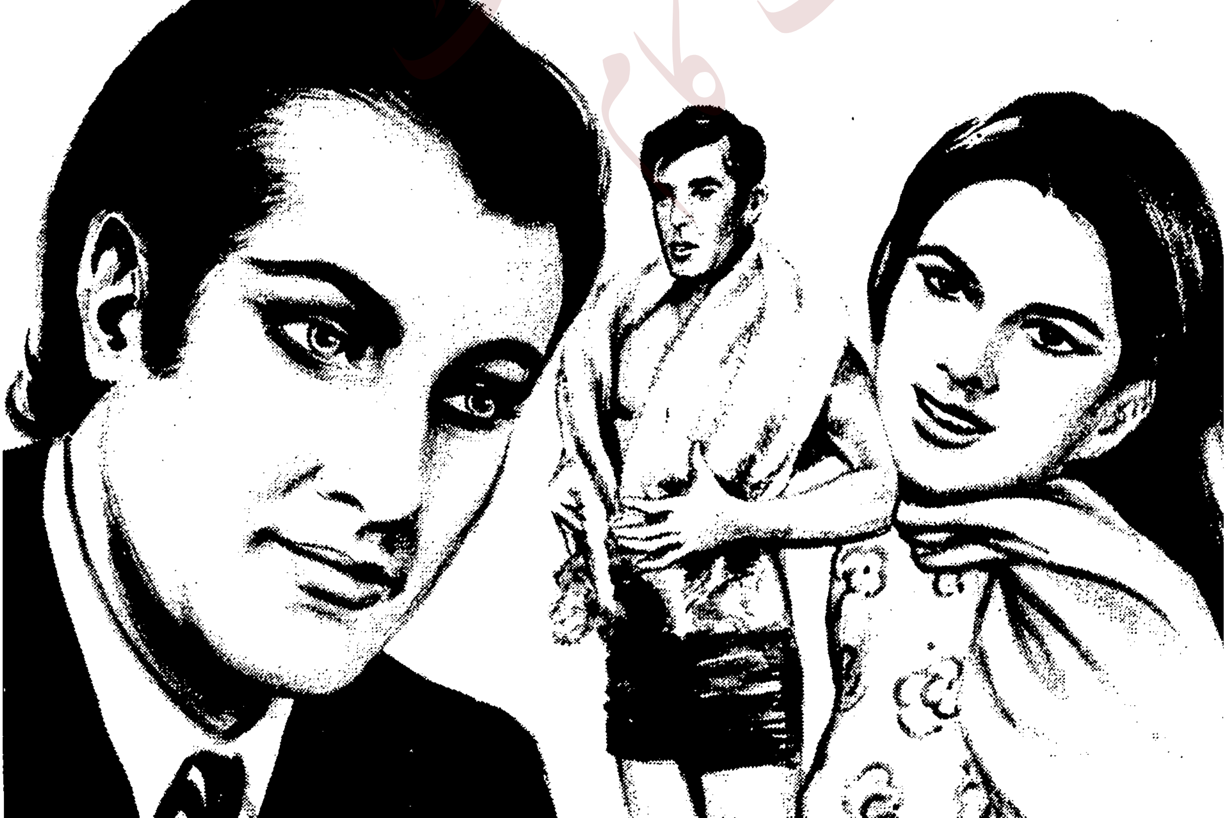

ہر چند کہ اس سانحے کے دس سال بعد روحی اس کی سیکریٹری بنی۔ وہ شادی سے کتراتا ہی رہا۔ روحی کے نزدیک اس کا ان شرائط پر اصرار کرنا حماقت کی دلیل تھی لیکن وہ شادی سے اتنا ہراساں نظر آتا تھا کہ روحی ان شرائط کو تسلیم نہ کر کے ایک خوشگوار مستقبل سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتی تھی ـــــــ دراصل بات یہ تھی کہ وہ ان شرائط سے قطعی خائف نہیں تھی۔ وہ اپنی طرف سے اس رشتے کو توڑنے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی تھی اور اگر بالفرض طغرل بے ایسا کرتا تو روحی کے قانونی حقوق محفوظ تھے ہی۔ بہر کیف اسے طغرل بے سے ایسی توقع تھی بھی نہیں۔ وہ وجیہہ ضرور تھا اور سفید ہوتے ہوئے بالوں میں اس کی نمایاں شخصیت خاصی جاذبیت رکھتی تھی۔ اس کے باوجود روحی اس سے پندرہ سال چھوٹی اور بے حد خوبصورت تھی۔ طغرل بے اس پر بے حد فریفتہ تھا۔

اور پھر ـــــ شادی کے پانچ سال بعد اس کے خوابوں کا شہزادہ آنکلا۔ یہ صولت تھا۔ دونوں کا ملاپ ہوا تو اس میں قصور طغرل بے کا تھا۔

طغرل بے معذور بچّوں کی پرورش کے ایک رفاہی ادارے کا چیئرمین تھا۔ یہ اس کے متعدّد خیراتی کاموں میں سے ایک کارِ خیر تھا۔ جب ادارے نے بچّوں کو تیراکی سکھانے کا پروگرام بنایا تو اس نے رضاکارانہ طور پر اپنا ذاتی تالاب پیش کر دیا۔ یہ تالاب اس کے گھر میں تھا۔ اس نے تیراکی سکھانے والے کی تلاش اور اس کے معاوضے کی ذمّہ داری بھی اپنے

سرلی صولت اس کی کمپنی میں نیا نیا ملازم ہوا تھا۔ جب اس نے دفتر والوں کو حکم دیا کہ وہ ملازمین کا ریکارڈ دیکھ کر بتائیں کہ ان میں سے کسی کو تیراکی کے بارے میں بھی تجربہ ہے تو انہوں نے صولت کا نام تجویز کیا۔ اس نے ملازمت کے لئے دی گئی درخواست میں تجربے۔ کے خانے میں لکھا تھا کہ اسے ذاتی محافظ کی حیثیت سے کام کرنے کا پانچ سالہ تجربہ ہے اور ریڈ کراس کے زیرِ آب تحفّظ کے انسٹرکٹر کا سرٹیفکیٹ بھی ہے۔

طغرل بے نے ہفتے کے روز دوپہر کے ایک بجے سے تین بجے تک بچّوں کو تیراکی سکھانے کی ذمّے داری اسے سونپی۔

مئی کی پندرہ تاریخ کو اس کا اپنی نئی ذمّے داری کا پہلا دن تھا۔ روحی کو علم تھا کہ صولت نامی کوئی شخص یہ تربیت دینے آ رہا ہے لیکن وہ اُس دن کسی لنچ پر مدعو تھی ـــــــ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کا شوہر نووارد کا استقبال کرنے کے لئے موجود نہیں ہو گا۔ کیونکہ وہ ہفتے کے روز گاف کھیلا کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے گھر کی ملازمہ سمن کو ہدایات دیں کہ جب صولت اور بچّے پہنچ جائیں تو وہ انہیں نہانے کا لباس تبدیل کرنے کی جگہ بتا دے۔ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

تین بجے وہ لوٹی تو دیکھا کہ بچّوں کو لانے اور لے جانے کے لئے جو بس آئی .... تھی، وہ ان کے کاروں والے گیراج کے قریب بالکل راستے میں کھڑی ہے۔ اس نے اپنی کار گھما کر صدر دروازے پر کھڑی کر دی تاکہ بس کے پیچھے ہٹنے میں رکاوٹ نہ رہے۔ کار سے اتر کر وہ سیدھی نہانے کے تالاب پر گئی۔

بیگم زرّیں بچّوں کو تالاب سے باہر لانے والوں کے کام کی نگرانی کر رہی تھی۔ وہ طغرل بے کے ایک شریک کار کی بیوی تھی اور اس ادارے میں رضاکارانہ طور پر کام کرتی تھی۔ پانچ سے آٹھ سال تک کی عمر کے کوئی بیس بچّے تھے۔ تالاب سے نکل کر وہ تہہ خانے کے دروازے سے کھیلوں کے کمرے میں گئے جہاں انھیں لباس تبدیل کرنا تھا۔

ایک لمحے کے لئے رُوحی کو جیسے کسی انجانے جرُم کا احساس سا ہوا۔ اتنے سارے معذور بچّوں کو دیکھ کر اس کے دل میں ترحّم کی جگہ عبرت کی لہر دوڑ گئی لیکن اس نے اپنے اس احساس کو پی کر درمیانہ عمر کی بیگم زرّیں کو بڑی خوش مزاجی سے خوش آمدید کہا۔

"کیسی ہو رُوحی ؟" بیگم زرّیں نے اپنی تمام تر توجّہ بچّوں پر مبذول کرتے ہوئے کہا "ارے ادھر اُدھر نہ ہو جانا بچّو! دس منٹ میں بس چلنے ہی والی ہے۔" وہ ایک پانچ سالہ بچّی کو بیساکھی اُٹھانے میں مدد دینے کے لئے لپکی۔

معًا روحی کی نظریں تالاب کے سرے پر نہانے کے کپڑوں میں ملبُوس ایک شخص پر پڑیں۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور روحی کا دل جانے کیوں دھڑکنے لگا۔ وہ دراز قد اور چھریرے جسم کا تھا۔ اس کے بازوؤں کی مچھلیاں اُبھری ہوئی تھیں اور بدن کسرتی تھا۔ سیاہ بال پانی میں بھیگ کر گھنگھریالے ہو رہے تھے اور اس کے دلکش چہرے سے سادگی ٹپک رہی تھی۔ کوئی تیس سال کا لگتا تھا۔

روحی اس عمر سے گذر چکی تھی۔ جب پہلی نظر میں محبّت ہو جانے کی بات پر یقین کر لیا جاتا ہے لیکن وہ سوچ رہی تھی کہ پہلی نظر میں محبّت ہو جانے کی لذّت اسے کیوں نہ مل سکی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار ایسا مرد دیکھا تھا جس کے مقناطیسی خدوخال نے اس کے رگ وپے میں ہلچل مچا دی تھی۔

اس نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کے لئے خود کو یہ

باور کرانا چاہا کہ وہ اس سے عمر میں یقیناً پانچ سال چھوٹا ہو گا اور اسے ہمیشہ بڑی عمر کے مرد پسند رہے ہیں لیکن معاً اسے ایک ماہر نفسیات کا مضمون یاد آ گیا جس نے لکھا تھا کہ چونکہ اوسطاً پانچ سال کے ازدواجی تعلقات کے بعد مرد کے قویٰ مضمحل ہونے لگتے ہیں، اس لئے بیوی کو شوہر سے پانچ سال بڑا ہونا چاہئے۔ روحی نے اس وقت مضمون نگار سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ لیکن اب وہ سوچ رہی تھی کہ ماہر نفسیات نے ٹھیک ہی تو کہا تھا۔

اس نے نووارد کے قریب جاکر دھڑکتے ہوئے دل سے کہا "آپ یقیناً مسٹر صولت ہیں۔"

اس شخص کی دلفریب مسکراہٹ میں اس کے سفید دانتوں کی جگمگاہٹ بھی شامل ہو گئی۔ "جی ہاں محترمہ! اور آپ کی تعریف؟"

"..... میں بیگم طغرل ہوں!"

اس نے تعجب سے روحی کو دیکھا جس میں تحسین بھی تھی۔ اور جستجو بھی کہ طغرل بے کی عمر کا آدمی اپنے سے اتنی چھوٹی دلکش حسینہ سے شادی کرنے میں کامیاب کیسے ہو گیا؟ یہ خیالات اس کی زبان پر نہیں آ سکتے تھے اور وہ رسمی طور پر بولا "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی محترمہ!"

اس وقت تک بیگم زریں بچوں کو اندر لے جا چکی تھی اور وہ دونوں تنہا رہ گئے تھے۔

"غالباً آپ میرے شوہر کی کمپنی میں ملازم ہیں، وہاں کیا کام کرتے ہیں آپ؟"

"مشینوں کو متحرک رکھنے کے لئے ان کے نیچے دھات کی جو پلیٹیں ہوتی ہیں، ان میں برمے سے سوراخ کرتا ہوں۔"

"اوہ!" روحی کے منہ سے نکلا "یہ تو بڑا دلچسپ کام ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا کہ اس نے کیسی بے معنی بات کی تھی دراصل صولت کی مقناطیسی شخصیت کے سامنے وہ خود کو بالکل سولہ سال کی لڑکی سمجھنے لگی تھی۔ اس نے اس بات کو فوراً محسوس کیا اور بالغ نظری کا ثبوت دیتے ہوئے کہا "تو آپ پلیٹ بنانے کی ورکشاپ میں کام کرتے ہیں؟"

صولت نے ایک ابرو اٹھا کر اس پر ناقدانہ نظر ڈالی "میرا خیال ہے آپ نے سب کچھ دیکھ بھال رکھا ہے!"

"میں کمپنی میں دو سال کام کر چکی ہوں۔ شادی سے پہلے میں اپنے شوہر کی سیکرٹری تھی۔"

"یہ بات ہے!" صولت بولا "مجھے یہ معلوم نہیں تھا۔ لیکن ابھی مجھے یہاں زیادہ عرصہ بھی تو نہیں گزرا ہے۔ چند ہفتے ہوئے آیا ہوں" اس نے گھر کی طرف دیکھا "میرے خیال میں دوسروں کی طرح اب مجھے بھی کپڑے پہن لینے چاہئیں۔"

لمحات کو طوالت دینے کے لئے وہ پھر بیس سال پیچھے لوٹ گئی اور بولی "میرا ابھی ذرا ڈبکی لگانے کا خیال تھا۔ اگر آپ تھک نہ گئے ہوں تو میرا ساتھ دیجئے..... اگر چاہیں تو!"

صولت نے اس پر بھرپور نظر ڈالی۔ اس کے چہرے کے تاثرات اتنے واضح تھے کہ روحی اس کی نیت بھانپ گئی۔ وہ اپنی مردانہ وجاہت کے اثر سے بخوبی آگاہ تھا کہ کتنی ہی عورتوں نے خود کو اس کے حوالے کر دیا تھا ــــ وہ جان گیا کہ وہ اسے روکے رکھنے کے لئے مری جا رہی ہے۔ اس دعوت میں کشش ضرور تھی لیکن خطرہ بھی تھا۔ آخر وہ اسکے شوہر کا ملازم تھا۔

اسے آمادہ کرنے کے لئے روحی نے ایک اور ترکیب لڑائی "تالاب کے کنارے اناناس کے جوس کا ایک ایک گلاس بھی ہو جائے۔ کھیلوں کے کمرے میں سب سامان رکھا ہے۔ آپ ذرا زحمت کر کے گلاس تیار کریں۔ اتنی دیر میں میں نہانے کا لباس پہن کر آتی ہوں۔"

صولت کی مہم جوئی کی پھر سے احتیاط سے تجاوز کر گئی۔

"بہت اچھا۔" آخر اس نے فیصلہ کر لیا "پہلے ذرا میں ملازمہ سے دو گلاس کہہ دوں۔ آپ کو دیر تو نہیں ہو رہی ہے نا؟"

"ارے کوئی بات نہیں۔" صولت نے مزے لیتے ہوئے اس لہجے میں کہا جیسے وہ اسے جتانا چاہتا ہے "مجھے معلوم ہے، تم اس بہانے آنے میں دیر لگانا چاہتی ہو تاکہ اتنی دیر میں زریں بچوں کو لے کر چلی جائے۔"

روحی کا چہرہ ایک بار پھر سرخ ہو گیا۔ تیر نشانے پر بیٹھتا دیکھ کر وہ ہنس پڑا "اطمینان سے آئیے" اس نے کہا "ان کے جانے تک میں یہیں ٹھہروں گا اور پھر اندر جاکر گلاس تیار کر دوں گا۔"

وہ اندر گئی تو سمن نے اسے بتایا کہ طغرل بے کا چند منٹ ہوئے کنٹری کلب سے فون آیا تھا اور انہوں نے کہا ہے کہ آپ انہیں کلب کے بارمیں فون کر لیں۔ جب اس نے فون کیا تو طغرل بے نے پوچھا "شام کو کوئی پروگرام تو نہیں ہے؟"

"میرا تو کوئی پروگرام نہیں ہے۔" روحی نے جواب دیا۔ "اگر آپ کا ہو تو بتائیے۔ ویسے میرا ارادہ رات کا کھانا گھر پر ہی کھانے

ہر چند کہ اس سانحے کے دس سال بعد روحی اس کی سیکرٹری بنی۔ وہ شادی سے کتراتا ہی رہا۔ روحی کے نزدیک اس کا ان شرائط پر اصرار کرنا حماقت کی دلیل تھی لیکن وہ شادی سے اتنا ہراساں نظر آتا تھا کہ روحی ان شرائط کو تسلیم نہ کر کے ایک خوشگوار مستقبل سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتی تھی ——— دراصل بات یہ تھی کہ وہ ان شرائط سے قطعی خائف نہیں تھی۔ وہ اپنی طرف سے اس رشتے کو توڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اور اگر بالفرض طغرل بے ایسا کرتا تو روحی کے قانونی حقوق محفوظ تھے ہی۔ بہرکیف اسے طغرل بے سے ایسی توقع تھی بھی نہیں۔ وہ وجیہہ ضرور تھا اور سفید ہوتے ہوئے بالوں میں اس کی نمایاں شخصیت خاصی جاذبیت رکھتی تھی۔ اس کے باوجود روحی اس سے پندرہ سال چھوٹی اور بے حد خوبصورت تھی۔ طغرل بے اس پر بے حد فریفتہ تھا۔

اور پھر—— شادی کے پانچ سال بعد اس کے خوابوں کا شہزادہ آنکلا۔ یہ صولت تھا۔ دونوں کا ملاپ ہوا تو اس میں قصور طغرل بے کا تھا۔

طغرل بے معذور بچوں کی پرورش کے ایک رفاہی ادارے کا چیئرمین تھا۔ یہ اس کے متعدد خیراتی کاموں میں سے ایک کارِ خیر تھا۔ جب ادارے نے بچوں کو تیراکی سکھانے کا پروگرام بنایا تو اس نے رضاکارانہ طور پر اپنا ذاتی تالاب پیش کر دیا۔ یہ تالاب اس کے گھر میں تھا۔ اس نے تیراکی سکھانے والے کی تلاش اور اس کے معاوضے کی ذمہ داری بھی اپنے سر لی۔ صولت اس کی کمپنی میں نیا نیا ملازم ہوا تھا جب اس نے دفتر والوں کو حکم دیا کہ وہ ملازمین کا ریکارڈ دیکھ کر بتائیں کہ ان میں سے کسی کو تیراکی کے بارے میں بھی تجربہ ہے تو انہوں نے صولت کا نام تجویز کیا۔ اس نے ملازمت کے لئے دی گئی درخواست میں تجربے کے خانے میں لکھا تھا کہ اسے ذاتی محافظ کی حیثیت سے کام کرنے کا پانچ سالہ تجربہ ہے اور ریڈ کراس کے زیرِ آب تحفظ کے انسٹرکٹر کا سرٹیفکیٹ بھی ہے۔

طغرل بے نے ہفتے کے روز دوپہر کے ایک بجے سے تین بجے تک بچوں کو تیراکی سکھانے کی ذمے داری اسے سونپی۔

مئی کی پندرہ تاریخ کو اس کا اپنی نئی ذمے داری کا پہلا دن تھا۔ روحی کو علم تھا کہ صولت نامی کوئی شخص یہ تربیت دینے آ رہا ہے لیکن وہ اُس دن کسی لنچ پر مدعو تھی ——— اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کا شوہر نو وارد کا استقبال کرنے کے لئے موجود نہیں ہوگا کیونکہ وہ ہفتے کے روز گالف کھیلا کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے گھر کی ملازمہ سمن کو ہدایات دیں کہ جب صولت اور بچے پہنچ جائیں تو وہ انہیں نہانے کا لباس تبدیل کرنے کی جگہ بتا دے۔ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

تین بجے وہ لوٹی تو دیکھا کہ بچوں کو لانے اور لے جانے کے لئے جو بس آئی ... تھی، وہ ان کے کاروں والے گیراج کے قریب بالکل راستے میں کھڑی ہے۔ اس نے اپنی کار گھما کر صدر دروازے پر کھڑی کر دی تاکہ بس کے پیچھے ہٹنے میں رکاوٹ نہ رہے۔ کار سے اتر کر وہ سیدھی نہانے کے تالاب پر گئی۔

بیگم زریں بچوں کو تالاب سے باہر لانے والوں کے کام کی نگرانی کر رہی تھی۔ وہ طغرل بے کے ایک شریک کار کی بیوی تھی اور اس ادارے میں رضاکارانہ طور پر کام کرتی تھی۔ پانچ سے آٹھ سال تک کی عمر کے کوئی بیس بچے تھے۔ تالاب سے نکل کر وہ تہہ خانے کے دروازے سے کھیلوں کے کمرے میں گئے جہاں انہیں لباس تبدیل کرنا تھا۔

ایک لمحے کے لئے روحی کو جیسے کسی انجانے جرم کا احساس سا ہوا۔ اتنے سارے معذور بچوں کو دیکھ کر اس کے دل میں ترحم کی جگہ عبرت کی لہر دوڑ گئی لیکن اس نے اپنے اس احساس کو پی کر درمیانہ عمر کی بیگم زریں کو بڑی خوش مزاجی سے خوش آمدید کہا۔

"کیسی ہو روحی؟" بیگم زریں نے اپنی تمام تر توجہ بچوں پر مبذول کرتے ہوئے کہا "اسے ادھر اُدھر نہ ہو جانا بچو! دس منٹ میں بس چلنے ہی والی ہے۔" وہ ایک پانچ سالہ بچی کو بیساکھی اٹھانے میں مدد دینے کے لئے لپکی۔

معاً روحی کی نظریں تالاب کے سرے پر نہانے کے کپڑوں میں ملبوس ایک شخص پر پڑیں۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور روحی کا دل جانے کیوں دھڑکنے لگا۔ وہ دراز قد اور چھریرے جسم کا تھا۔ اس کے بازوؤں کی مچھلیاں اُبھری ہوئی تھیں اور بدن کسرتی تھا۔ سیاہ بال پانی میں بھیگ کر گھنگھریالے ہو رہے تھے اور اس کے دلکش چہرے سے سادگی ٹپک رہی تھی۔ کوئی تیس سال کا لگتا تھا۔

روحی اس عمر سے گذر چکی تھی۔ جب پہلی نظر میں محبت ہو جانے کی بات پر یقین کر لیا جاتا ہے لیکن وہ سوچ رہی تھی کہ پہلی نظر میں محبت ہو جانے کی لذت اسے کیوں نہ مل سکی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار ایسا مرد دیکھا تھا جس کے مقناطیسی خدوخال نے اس کے رگ و پے میں ہلچل مچا دی تھی۔

اس نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کے لئے خود کو یہ

باور کرانا چاہا کہ وہ اس سے عمر میں یقیناً پانچ سال چھوٹا ہوگا اور اسے ہمیشہ بڑی عمر کے مرد پسند رہے ہیں لیکن معاً اسے ایک ماہر نفسیات کا مضمون یاد آگیا جس نے لکھا تھا کہ چونکہ اوسطاً پانچ سال کے ازدواجی تعلقات کے بعد مرد کے قویٰ مضمحل ہونے لگتے ہیں، اس لئے بیوی کو شوہر سے پانچ سال بڑا ہونا چاہئیے۔ روحی نے اس وقت مضمون نگار سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ لیکن اب وہ سوچ رہی تھی کہ ماہر نفسیات نے ٹھیک ہی تو کہا تھا۔

اس نے نو وارد کے قریب جا کر دھڑکتے ہوئے دل سے کہا

"آپ یقیناً مسٹر صولت ہیں۔"

اس شخص کی دلفریب مسکراہٹ میں اس کے سفید دانتوں کی جگمگاہٹ بھی شامل ہوگئی۔ "جی ہاں محترمہ! اور آپ کی تعریف؟"

"..... میں بیگم طغرل ہوں!"

اس نے تعجب سے روحی کو دیکھا۔ جس میں تحسین بھی تھی۔

اور جستجو بھی کہ طغرل بے کی عمر کا آدمی اپنے سے اتنی چھوٹی دلکش حسینہ سے شادی کرنے میں کامیاب کیسے ہوگیا؟ یہ خیالات اس کی زبان پر نہیں آسکتے تھے اور وہ رسمی طور پر بولا "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی محترمہ!"

اس وقت تک بیگم زریں بچوں کو اندر لے جا چکی تھی اور وہ دونوں تنہا رہ گئے تھے۔

"غالباً آپ میرے شوہر کی کمپنی میں ملازم ہیں، وہاں کیا کام کرتے ہیں آپ؟"

"مشینوں کو متحرک رکھنے کے لئے ان کے نیچے دھات کی جو پلیٹیں ہوتی ہیں، ان میں برمے سے سوراخ کرتا ہوں۔"

"اوہ!" روحی کے منہ سے نکلا "یہ تو بڑا دلچسپ کام ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا کہ اس نے کیسی بے معنی بات کی تھی دراصل صولت کی مقناطیسی شخصیت کے سامنے وہ خود کو بالکل سولہ سال کی لڑکی سمجھنے لگی تھی۔ اس نے اس بات کو فوراً محسوس کیا اور بالغ نظری کا ثبوت دیتے ہوئے کہا "تو آپ پلیٹ بنانے کی ورکشاپ میں کام کرتے ہیں؟"

صولت نے ایک ابرو اُٹھا کر اس پر ناقدانہ نظر ڈالی "میرا خیال ہے آپ نے سب کچھ دیکھ بھال رکھا ہے!"

"میں کمپنی میں دو سال کام کر چکی ہوں۔ شادی سے پہلے میں اپنے شوہر کی سیکرٹری تھی۔"

"یہ بات ہے!" صولت بولا۔ "مجھے یہ معلوم نہیں تھا۔ لیکن ابھی مجھے یہاں زیادہ عرصہ بھی تو نہیں گذرا ہے۔ چند ہفتے ہوئے آیا ہوں۔" اس نے گھڑی کی طرف دیکھا "میرے خیال میں دوسروں کی طرح اب مجھے بھی کپڑے پہن لینے چاہئیں۔"

لمحات کو طوالت دینے کے لئے وہ پھر بیس سال پیچھے لوٹ گئی اور بولی "میرا ابھی ذرا ڈبکی لگانے کا خیال تھا۔ اگر آپ تھک نہ گئے ہوں تو میرا ساتھ دیجئے..... اگر چاہیں تو!"

صولت نے اس پر بھرپور نظر ڈالی۔ اس کے چہرے کے تاثرات اتنے واضح تھے کہ روحی اس کی نیت بھانپ گئی۔ وہ اپنی مردانہ وجاہت کے اثر سے بخوبی آگاہ تھا کہ کتنی ہی عورتوں نے خود کو اس کے حوالے کر دیا تھا ___ وہ جان گیا کہ وہ اسے روکے رکھنے کے لئے مری جا رہی ہے۔ اس دعوت میں کشش ضرور تھی لیکن خطرہ بھی تھا۔ آخر وہ اسکے شوہر کا ملازم تھا۔

اسے آمادہ کرنے کے لئے روحی نے ایک اور ترکیب لڑائی

"تالاب کے کنارے اناناس کے جوس کا ایک ایک گلاس بھی ہو جائے۔ کھیلوں کے کمرے میں سب سامان رکھا ہے۔ آپ ذرا زحمت کر کے گلاس تیار کریں۔ اتنی دیر میں میں نہانے کا لباس پہن کر آتی ہوں۔"

صولت کی مہم جوئی کی بھر پور احتیاط سے تجاوز کر گئی۔

"بہت اچھا۔" آخر اس نے فیصلہ کر لیا۔

"پہلے ذرا میں ملازمہ سے دو لفظ کہہ دوں۔ آپ کو دیر تو نہیں ہو رہی ہے نا؟"

"ارے کوئی بات نہیں۔" صولت نے مزے لیتے ہوئے اس لہجے میں کہا جیسے وہ اسے جتانا چاہتا ہے کہ مجھے معلوم ہے، تم اس بہانے آنے میں دیر لگانا چاہتی ہو تاکہ اتنی دیر میں زریں بچوں کو لے کر چلی جائے

روحی کا چہرہ ایک بار پھر سرخ ہوگیا۔ تیر نشانے پر بیٹھتا دیکھ کر وہ ہنس پڑا "اطمینان سے آیئے۔" اس نے کہا "ان کے جانے تک میں یہیں ٹھہروں گا اور پھر اندر جا کر جوس تیار کروں گا۔"

وہ اندر گئی تو سمن نے اسے بتایا کہ طغرل بے کا چند منٹ ہوئے کنٹری کلب سے فون آیا تھا اور انہوں نے کہا ہے کہ آپ انہیں کلب کے بار میں فون کرلیں۔ جب اس نے فون کیا تو طغرل بے نے پوچھا "شام کو کوئی پروگرام تو نہیں ہے۔"

"میرا تو کوئی پروگرام نہیں ہے۔" روحی نے جواب دیا۔

"اگر آپ کا ہو تو بتایئے۔ ویسے میرا ارادہ رات کا کھانا گھر پر ہی کھانے

کھانے کا ہے۔ اس کے بعد چند خطوط وغیرہ لکھوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ یہاں بھی یار لوگوں نے تاش کا پروگرام بنا رکھا ہے اور چاہتے ہیں کہ کھیل جلد شروع ہو جائے۔ اگر بُرا نہ مانو تو وقت بچانے کے لئے میں کھانا یہیں کھا لوں۔"

"اے ضرور!" وہ بولی۔ "پھر تو آپ دیر سے آئیں گے نا؟"

"شاید دیر بھی ہو جائے۔" طغرل بیگ نے کہا۔ "لیکن میں تمہاری نیند خراب نہیں کروں گا۔"

ریسیور رکھ کر اس نے سمن کو بتایا کہ صاحب رات کو کھانا گھر نہیں کھائیں گے اور دوسری بات یہ کہ اسے سخت پیاس لگ رہی ہے۔ "میں شربت خود تیار کر لوں گی۔" اس نے کہا۔ "تم سارا کام ختم کر لو تو جب جی چاہے چلی جانا۔"

"پھر میں ابھی چلی جاتی ہوں۔" سمن جلدی سے بولی۔ "سارا کام ختم ہو گیا ہے۔"

اس نے لباس خوابگاہ میں جا کر تبدیل کیا۔ پہلے اس نے

آج کل
ہپناٹزم کی مخفی طاقت کو روس امریکہ اور برطانیہ جیسے ترقی یافتہ ممالک خاص طور پر اعلیٰ قسم کے
کھیل تماشوں میں استعمال کرنے کے علاوہ طب و جراحت میں زیادہ استعمال کر رہے ہیں بلا تکلیف زچگیاں اور بڑے آپریشن روزمرہ کا معمول بن گئے ہیں کمزور قوتِ ارادی، احساسِ کمتری، نروس نس اور دیگر بیشمار نفسیاتی امراض کا جدید ترین علاج آج ہپناٹزم کو ہی سمجھا جاتا ہے چونکہ آجکل ترقی یافتہ ممالک کے عام لوگ بھی ہپناٹزم کی پراسرار قوت کے حیرت انگیز اثرات سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں اس لئے جب انکی کسی مسئلہ میں کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی تو وہاں ہپناٹزم کی پراسرار قوت کو ہی آخری حربے کے طور پر استعمال کر کے اس سے اپنا کام نکال لیتے ہیں، انشورنس کے ایجنٹ اور بزنس مین اپنے گاہک نہایت آسانی سے بنا لیتے طالب علم اپنے امتحان میں شاندار کامیابی حاصل کرنے اور محبت کے متوالے اپنی ہاری ہوئی بازی جیتنے میں اسے خوب خوب استعمال کرتے ہیں اس فن کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ پولیس اور سراغرساں اسکی مدد سے مجرموں اور جاسوسوں سے پوشیدہ راز اگلوا لیتے ہیں سچ تو یہ ہے کہ ہپناٹزم دورِ جدید کا سائنٹفک "جادو" ہے جو انسان کے ہر موقع پر بہت کام آتا ہے۔ اگر آپ اس حیرت انگیز فن کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں یا اس کو باقاعدہ طور سے سیکھنا چاہتے ہیں تو پچاس پیسے کے ٹکٹ بھیجکر "باتصویر معلوماتی کتابچہ" معہ داخلہ فارم طلب کیجئے۔ کامران انسٹی ٹیوٹ آف ہپناٹزم
74 زولوجیکل گارڈن (S) نشتر روڈ کراچی

نہانے کا مختصر ترین سوٹ پہنا۔ لیکن جب قدِ آدم آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیا تو اسے احساس ہوا کہ اس لباس میں اس کے جسمانی خطوط ابھی دعوتِ نظارہ دینے سے رہے۔ چنانچہ اس نے جلدی سے قدرے لمبا کالے رنگ کا سوٹ پہن لیا۔

اس نے خود کو آئینے میں زاویہ بدل بدل کر دیکھا اور یہ رائے قائم کی کہ پینتیس سال کی ہونے کے باوجود ابھی اس میں کشش باقی ہے اس کے قدرتی طور پر سنہری بالوں میں بڑھاپے کا سفید تار ابھی شامل نہیں ہوا تھا۔ وقت کی تمازت نے اس کی گلابی رنگت کو پھیکا نہیں کیا تھا۔ اس پر ابھی شباب کی تازگی باقی تھی۔ وزن میں مزید دس پونڈ کی بیشی بھی کوئی قباحت نہیں تھی۔ دو ہفتوں کی مناسب خوراک یہ بھی کرا دیگی۔

خوابگاہ کے دریچے سے اس نے بس کو اور سمن کو جاتے دیکھا۔ سب لوگوں کے جانے کے بعد ہی وہ نیچے اتری۔

صولت جوس کے گلاس سامنے رکھے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے روحی پر ایک گہری تنقیدی نظر ڈالی۔ اس کی نظریں اسکے سر سے آہستہ آہستہ پھسلتی ہوئی پاؤں تک پہنچیں۔ ان نظروں میں بے باکی زیادہ اور ستائش کم تھی۔ جیسے وہ اسے نظروں ہی نظروں میں پی جانا چاہتا ہو۔ روحی کا چہرہ تیسری مرتبہ سرخ ہو گیا اور وہ مسکرا دیا اس نے روحی کو گلاس دیتے ہوئے کہا۔ "محبت کے نام۔"

روحی کی بھنویں اوپر اٹھیں اور اس نے پھریری لیتے ہوئے اسے دہرایا۔ "محبت کے نام۔"

انہوں نے خالی گلاس میز پر رکھ دیئے اور ایک دوسرے کی آنکھوں کے جام پینے لگے۔ صولت کی نظریں اسے ٹٹول رہی تھیں، اسے تول رہی تھیں اور اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ صولت کے چہرے کے آثار چڑھاؤ پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ ابھی کتنا انتظار کرنا پڑے گا۔ کتنا۔

شاید صولت نے بھی اس کے دل کی بات پڑھ لی کیونکہ اس نے مزید انتظار کرنا ضروری نہ سمجھا۔ اس نے روحی کو بڑی ملائمت سے اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔ لیکن اس کے پہلے بوسے میں ایسی کوئی ملائمت نہیں تھی۔ اس میں ایک ایسا وحشیانہ پن تھا کہ روحی کے سارے جسم میں چنگاریاں چٹخنے لگیں۔ تالاب میں جا کر جسم کو ٹھنڈک پہنچانے کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔

شروع شروع میں روحی کے لئے بات جسمانی آسودگی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ دونوں اپنا زیادہ تر وقت ہوٹلوں میں

میں چھپ چھپ کر رنگ رلیاں مناتے گذارتے تھے۔

روحی کے لئے صولت سے ملنے کی خاطر وقت نکالنا چنداں مشکل نہ تھا۔ طغرل بے اپنے کاروباری منصوبوں میں اتنا مصروف رہتا تھا کہ اس کی زیادہ تر شامیں گھر سے باہر گزرتی تھیں۔ اس کے علاوہ اس نے بیوی کی حرکتوں پر نظر رکھنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ روحی ہفتے میں کئی کئی بار رات کے کم از کم دو چار گھنٹے باہر گذار آتی۔ ہفتے کی رات کو تو کھلی چھٹی تھی۔ طغرل بے کو کلب میں تاش کھیلنے کی لت تھی اور روحی رات گئے گھر لوٹتی۔

دونوں جب خاموش جسمانی لذّت سے خوب سیر ہو گئے تو انکی زبانوں کے تالے کھلے۔

ان کے ابتدائی مکالمے محض ایک دوسرے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی حد تک تھے۔ روحی نے اسے بتایا کہ کسطرح اسکا بچپن لوگوں کے ہاں گزرا، کامرس اسکول میں تعلیم حاصل کی اور پھر سالہاسال تک اسٹینوگرافی اور سکریٹری شپ کے صبر آزما پاپڑ بیلنے تب کہیں جاکر طغرل بے کی پرائیویٹ سکریٹری بننا نصیب ہوا جس کا خوشگوار نتیجہ یہ نکلا کہ دو سال بعد اس کی بیوی بن گئی۔

صولت نے بتایا کہ اس کا لڑکپن کھیتوں میں ایک سخت گیر باپ کے زیر حکومت گزرا۔ سولہ برس کا ہوا تو گھر سے بھاگ نکلا اور فوج میں رہ کر ہی ہائی اسکول کا ڈپلومہ لیا۔ اس نے مختصراً بتایا کہ چھ سال بعد ایک "معمولی" بات پر اسے فوج کی ملازمت چھوڑنی پڑی۔ اس نے اس معمولی بات کی وضاحت نہیں کی لیکن اس نے روحی کو یقین دلایا کہ وہ باعزت طور پر فوج سے سبکدوش ہوا تھا۔ ہر چند کہ اسے سارجنٹ سے سپاہی بنا دیا گیا تھا، اس کی سبکدوشی پھر بھی کسی الزام کے بغیر تھی۔

صولت کے بقول اس نے فوج کے اسلحہ خانے میں کام کیا تھا۔ ہائی اسکول کا امتحان پاس کرنیکے علاوہ وہیں اس نے مشینوں کے کل پرزے بنانے کا کام بھی سیکھ لیا تھا۔ اسے فوج سے نکلے آٹھ سال ہوگئے تھے۔ تب سے وہ چاروں سمتوں میں گھوم کر متعدد کارخانوں اور فیکٹریوں میں مختلف کام کرتا رہا ہے۔ وہ کہیں ٹک کر کام اس لئے نہیں کرتا کہ گرمیوں میں وہ کام چھوڑ دیتا ہے اور کسی نہ کسی کا ذاتی محافظ بن کر پیسے کماتا ہے۔

اپنے اس رائیگاں پس منظر میں اس نے اپنے ایک دیرینہ عزم کا اظہار کیا کہ وہ کبھی نہ کبھی اپنا ذاتی کاروبار شروع کرے گا۔ یہ کاروبار مشینری کا ہوگا کیونکہ اسے ہر قسم کی مشینوں کا خاصہ وسیع تجربہ ہے۔ اس کے علاوہ جگہ جگہ کی خاک چھاننے کی وجہ سے ان کاروباری حلقوں میں اسکے خاصے دوستانہ مراسم ہو گئے ہیں جہاں منصوبوں کا خرچ حکومت برداشت کرتی ہے یا معاہدے پر کام کراتی ہے جس سے صنعت کاروں کے قدم جمتے ہیں اسے پورا یقین تھا کہ ان حلقوں کی وساطت سے وہ اپنی اسٹنڈرڈ کے مطابق دولت کمالے گا۔ ضرورت صرف اس بات کی تھی کہ اسے کام شروع کرنے کے لئے کہیں سے تھوڑی مدد مل جائے۔ اس نے روحی کو پوری طرح یقین دلایا کہ پانچ سال میں وہ لکھ پتی بن جائے گا۔

جوں جوں روحی صولت کے قریب آتی گئی وہ اس کے دل میں اترتا گیا۔ جون کے اواخر میں اس نے محسوس کیا کہ وہ صولت کے بغیر پل بھر بھی نہیں رہ سکتی۔ اس کی محبت اب جسمانی آسودگی کے لئے نہیں رہی تھی بلکہ ایسی محبت بن گئی تھی جہاں عورت اپنا مقام تبدیل کر کے محبوبہ سے بیوی بن جانا چاہتی ہے۔

جب صولت نے بھی بتایا کہ وہ اسے شدت سے چاہتا ہے تو بیگم طغرل بے کی حیثیت سے اسے جتنی عیش و عشرت میسّر تھی، وہ سب بے معنی ہو کر رہ گئی۔ صولت اس سے خوابوں کے شہزادے کے روپ میں نہیں مل سکا تھا لیکن اب ــــ جبکہ وہ اس روپ میں اس کے سامنے تھا۔ وہ طغرل کے محل کو چھوڑ کر اس کے جھونپڑے میں رہنا اپنے خواب کی تعبیر سمجھتی تھی۔

صولت شادی کے بارے میں اتنی تیز رفتاری سے سوچنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس نے روحی کو بتایا کہ وہ اس سے شادی ضرور کرنا چاہتا ہے۔ لیکن انہیں جذباتیت سے ہٹ کر عملی طور پر حالات کو دیکھنا ہوگا۔ طلاق کا خاطر خواہ فیصلہ ہونے سے پہلے طغرل بے سے ناطہ توڑ کر صولت کا دامن تھامنا، اس کی فاش غلطی ہوگی۔ فی الحال تو محبّت کا راز افشا ہونے میں بھی خطرہ ہے۔

"ہمارے کھلم کھلا ساتھ رہنے کے دو نتائج نکلیں گے، جانِ من" اس نے سکون سے کہا "ایک تو یہ کہ مجھے نوکری سے جواب مل جائے گا اور دوسرے یہ کہ تمہیں ایک کوڑی لئے بغیر طلاق مل جائے گی۔ پھر ہم کھائیں گے کہاں سے؟"

روحی نے کچھ دیر غور کیا اور بولی "میرے دماغ میں تو تمہارے ساتھ رہنے کے سوا اور کوئی بات آتی ہی نہیں۔ بتاؤ پھر میں کیا کروں؟"

"جب تک طلاق نامہ تمہارے ہاتھوں میں نہ آجائے اور اپنا حق نہ لے لو، اس وقت تک ہمیں تعلقات کو خفیہ رکھنا ہوگا۔ اگر عدالت کے علم میں یہ بات آگئی کہ تم دوسری شادی کرنے کے لئے طغرل بے سے طلاق لینے کی منتظر تھیں تو تمہیں اس سے کوڑی بھی نہیں ملے گی لیکن

اگر تم شوہر کے ظلم و ستم کی ماری ایک مصیبت زدہ بیوی ہو تو تم قانون کے ذریعے اسے ناکوں چنے چبوا سکتی ہو۔ میں نے چھان پھٹک کر لی ہے۔ اس کی پہلی بیوی اس سے اسی طرح دو لاکھ پونڈ وصول کر چکی ہے۔"

اس دلیل نے روحی کو خاموش کر دیا۔

"اور اب اس ملک میں طلاق نام کی کوئی چیز رہی ہی نہیں۔ اسے شادی کی تنسیخ کہا جاتا ہے اور اس کے لئے ایک ہی وجہ کافی ہے۔ شدید اختلافات، یعنی اس بات کا ثبوت فراہم نہیں کرنا پڑے گا کہ شوہر مار پیٹ کرتا ہے یا اس نے گھر کی ملازمہ سے دست درازی کی یا اس قسم کا کوئی اور الزام۔ عدالت کو صرف یہ بتانا کافی ہوگا کہ شوہر کے ساتھ گزارہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے بھی کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ قانون یہ درد سر مول لینا نہیں چاہتا کہ قصور وار کون ہے اور کون بے قصور! اگر تم آج ہی کوئی وکیل کر لو تو ایک مہینے کے اندر اندر شوہر سے چھٹکارا پا سکتی ہو۔"

روحی بدستور خاموش تھی۔

"کیا بات ہے؟" صولت نے کوئی جواب نہ پاکر پوچھا۔

روحی نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بولی "میں سمجھتی ہوں کہ میرا ہاتھ اس رقم تک نہیں پہنچ سکتا ـــــ جو اس کی پہلی بیوی نے حاصل کی تھی، مجھے تو دس ہزار سے زیادہ کی اُمید نہیں ہے۔"

صولت نے حیرت سے دیکھا "دس ہزار؟ کیسی عجیب بات کی تم نے! تمہارا شوہر کروڑپتی ہے۔ تم کیا بات کر رہی ہو۔"

اب روحی نے اسے شادی کے شرائط نامے کے بارے میں بتایا جس پر اس کے دستخط موجود تھے۔

صولت نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا "تم نے اس شرائط نامے پر دستخط کر دیئے تھے؟ کیا تم اتنی بیوقوف بھی ہو سکتی ہو۔"

روحی بھونچکی رہ گئی۔ پھر ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ صولت نے جھٹ اسے آغوش میں لے لیا۔

"چھی چھی، یہ کیا کر رہی ہو۔" اس نے روحی کو پچکارا "معاف کر دو، تمہیں بے وقوف کہہ دیا۔"

"یہ بات نہیں ہے۔" روحی نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھتی تھی کہ تم مجھے میری وجہ سے پیار کرتے ہو، دولت کے لئے نہیں اور میں طغرل سے چھٹکارا پالوں گی۔"

"میں تم سے اور صرف تم سے پیار کرتا ہوں۔" صولت نے احتجاج کیا "لیکن دولت کو چھوڑنا بھی تو عقل مندی نہیں ہے۔ میں تو یہی خواب دیکھ رہا ہوں کہ اپنا ورکشاپ کھولوں گا۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تمہیں ساری زندگی ایک مزدور کی تنخواہ میں گزارنے دوں گا۔ میں تو تمہیں ہیروں سے جگمگاتا دیکھنا چاہتا ہوں!"

روحی کی سسکیاں تھم گئیں۔ اس نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے اپنی آنکھیں خشک کیں اور سر صولت کے سینے سے لگا دیا "تمہاری ورکشاپ پر کتنی رقم لگے گی؟" اس نے پوچھا "کیا کام شروع کرنے کے لئے دس ہزار کافی نہیں ہوں گے؟"

صولت کے ہونٹوں پر ایک غمزدہ مسکراہٹ پھیل گئی "مجھے کام حاصل کرنے کے لئے جن کمپنیوں کے پیچھے بھاگنا ہوگا، وہ بہت بڑی بڑی ہیں روحی! وہ کسی للو پنجو کو گھاس نہیں ڈالتیں۔ کام ہی ایسا دیں گی جس پر ہزاروں کی لاگت آئے۔ وہ کسی ایسے آدمی کو موقع نہیں دیں گی جو اس پیمانے پر کام نہ کر سکتا ہو۔ میرے ذہن میں تو کچھ اور ہی نقشہ تھا۔"

روحی نے ایک ٹھنڈی سانس لی "طغرل مجھے اتنا کب دینے لگا؟ یہ حقیقت ہے کہ وہ شرائط نامے کی رقم سے ایک حبہ بھی زیادہ نہیں دے گا۔ وہ ذاتی اخراجات میں تنگ دل نہیں ہے۔ لیکن کاروباری معاملات میں بہت سخت ہے۔"

صولت نے بُرا سا منہ بنایا "پھر ہمیں کوئی ایسی ترکیب نکالنی پڑے گی جس سے طلاق سے پہلے تم اس سے کچھ رقم بٹور سکو۔"

"مثلاً؟"

صولت کچھ سوچ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے پوچھا "اس نے اپنے وصیت نامے میں تمہارے لئے کچھ رکھا ہے؟"

روحی سمٹ کر اس کے بازوؤں کے حلقے سے نکل گئی اور ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگی "مجھے یقین ہے کہ تم نے مذاق کیا ہے!"

"بلاشبہ مذاق کیا ہے۔" صولت طنزیہ مسکراہٹ سے بولا۔ "میری جان اور کیا ہو سکتا ہے؟"

"تمہارے اس مذاق سے یوں لگا کہ تم مجھے بیوہ بنانے کی سوچ رہے ہو، میں اس قسم کی لغویت کو پسند نہیں کرتی۔"

صولت نے دیکھا کہ وہ اُکھڑ گئی ہے، تو وہ بولا "یہ ایک بھدّے مذاق سے زیادہ کچھ نہ تھا، میری روح! کیا میں قاتل نظر آتا ہوں؟"

اس کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ روحی پگھل گئی۔ اس کے سینے کا بوجھ اُتر گیا اور وہ پھر اس سے چمٹ گئی۔ دیر تک ان کی زبانیں گنگ رہیں۔ اور دل بولتے رہے۔

آخر صولت نے اس سکوت کو توڑا "تو کیا قتل سے کم کسی جُرم کے لئے تم اخلاقی قدروں کو نظر انداز کر سکتی ہو؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ طغرل بے سے کچھ رقم بٹورنے میں کہاں تک آگے بڑھ سکتی ہو؟"

"جرم کی کوئی بات نہ کرو!" روحی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میں جیل جانے کا خطرہ کسی صورت میں مول نہیں لوں گی۔"

"دیکھو نا! میرے دماغ میں جو بات آئی ہے ممکن ہے وہ جرم ہو لیکن اس میں جیل جانے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ خواہ کیسے ہی حالات کیوں نہ ہوں۔ اغوا ہونے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔"

روحی نے اپنے جسم کو پھر سمیٹ لیا۔ "اغوا؟ ارے اس میں بھی جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔"

"صرف اسی صورت میں کہ اغوا درحقیقت ہو، جانِ من! اگر ہم مصنوعی اغوا کا کھیل کھیلیں اور خدانخواستہ پکڑے بھی گئے تو زیادہ سے زیادہ جعل سازی کا الزام لگے گا اور یہ بات عقل میں نہیں آتی کہ کوئی شخص اپنی بیوی کو جعل ساز قرار دے سکتا ہے۔ تم اپنے شوہر کو مجھ سے زیادہ بہتر جانتی ہو۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ اگر ہم نے اسے تمہارے اغوا کا چکر دیا تو وہ تمہیں جعل سازی کے مقدمے میں پھنسا دے گا؟"

روحی کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر بولی "میں کہہ نہیں سکتی کہ وہ کیا کرے گا۔ ہو سکتا ہے مجھے لات مار کر نکال دے، یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مجھے معاف کر دے۔ وہ تو میرا دیوانہ ہے۔ ہاں ایک بات کا پورا یقین ہے کہ مقدمے وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑے گا کیونکہ وہ چاہے گا کہ بات دب جائے طغرل بہت بُردبار آدمی ہے۔ وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ دنیا کو اپنا تماشا دکھاتے۔"

"پھر تو کوئی خطرہ نہیں ہے۔" صولت نے اطمینان سے کہا "ہم یہ تجربہ کر لیں گے۔"

روحی کچھ ہچکچا رہی تھی لیکن صولت نے اسے مطمئن کر دیا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر پکڑے گئے تو صرف تھوڑی سی پریشانی ہوگی۔ جب وہ رضامند ہو گئی تو یہ طے کرنا رہ گیا کہ کتنی رقم کا مطالبہ کیا جائے صولت کا خیال تھا کہ ڈھائی لاکھ پونڈ کے لئے قسمت آزمائی جائے۔

"اقوہ! طغرل اتنا کہاں سے دینے لگا" روحی نے پورے وثوق سے کہا "میں نہیں سمجھتی کہ ایک لاکھ سے زیادہ کا مطالبہ کیا جائے۔"

"میں نے تو یہ اس لئے کہا تھا کہ بقول تمہارے وہ تم پر جان دیتا ہے! ہمارا مطالبہ یہ ہوگا کہ وہ رقم دے دے یا تمہاری لاش لے جائے تمہارا خیال ہے کہ وہ تمہاری زندگی کی قیمت کے لئے کوئی حد مقرر کریگا۔"

"یہ بات قطعی نہیں ہے۔ لیکن تمہیں یہ دیکھنا ہوگا کہ طغرل کا ذہن کس طرح کام کرتا ہے۔ وہ گھٹیا آدمی نہیں ہے لیکن بڑے اخراجات میں پائی پائی کا حساب رکھتا ہے اور اچھی طرح ٹھونک بجا کر سودا کرتا ہے مثلاً اگر اسے نئی کار خریدنی ہو تو ایک دوکان سے دوسری دکان پر جائیگا اور اچھی طرح گھوم پھر کر اطمینان بخش چیز لے گا۔"

"اس مثال کا ہمارے معاملے سے کیا تعلق؟"

"میں صرف یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ ہمارے مطالبے کا ردِّعمل کیا ہوگا۔ تم اسے بڑے اخراجات کی مد میں شامل کرو گے۔ نہیں کرو گے کیا؟"

"کرنا تو پڑے گا۔" صولت نے اعتراف کیا "اچھا تو پھر اس کا کیا ردِّعمل ہوگا؟"

"یہ غالباً مطالبے کی رقم پر منحصر ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اگر ایک لاکھ تک کی رقم ہوگی تو وہ کوئی جال بچھائے یا پولیس کو خبر کئے بغیر تمہاری ہدایات پر عمل کرے گا۔ میری واپسی کے لئے وہ اس رقم کو مناسب خیال کریگا کہ اس طرح اغوا کرنے والے بھی ناراض نہیں ہوں گے۔" اگر اس سے زیادہ مانگ بیٹھو گے تو وہ مجھے اور دولت کو ترازو کے پلڑوں میں رکھے گا یہ بات نہیں کہ اسے مجھ سے محبت نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ اسے دولت سے بھی اتنی ہی محبت ہے۔"

"تو مطلب یہ ہوا نا کہ وہ زیادہ رقم دینے سے انکار کر دے گا؟"

"اقوہ! دینے کو تو وہ دے بھی دے گا۔ لیکن ایسے حالات پیدا کرنے کی پوری پوری کوشش کرے گا کہ رقم واپس ملنے کے امکانات بھی رہیں۔ ہو سکتا ہے وہ خفیہ پولیس کو مدد کے لئے بلائے یا ہمارا فون ٹیپ کرائے۔ گویا کسی قسم کا جال بھی پھیلا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہمارا پلڑا ہلکا رہے تو ہم محفوظ رہیں گے۔ کیا تم ایک لاکھ سے بھی ورکشاپ نہیں کھول سکتے؟"

"اس رقم سے میں کم آمدنی کے لئے تو خاصا کام چلا سکتا ہوں" صولت نے تسلیم کیا "چلو یہی ٹھیک ہے۔ تم اپنے شوہر کو بہتر سمجھتی ہو۔ ہم ایک لاکھ پر ہی صبر کئے لیتے ہیں۔"

صولت کو منصوبہ بنانے میں ایک ہفتہ لگ گیا۔ پھر اس نے ایک پوری شام روحی کو ساری بات اچھی طرح ذہن نشین کرانے میں صرف کی۔ اگلے روز انہوں نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی ٹھانی۔ دوپہر سے کچھ پہلے روحی اچانک شوہر کے دفتر پہنچ گئی۔ طغرل بے پرائیوٹ سیکریٹری کو کچھ لکھوا رہا تھا

اس کی موجودہ سیکریٹری تقریباً پچیس سال کی ایک حسین و جمیل دوشیزہ تھی۔ طغرل بے اپنی سیکریٹری بنانے کے لئے ہمیشہ خوبصورت عورتیں منتخب کرتا تھا۔ ان ہی سے وہ دو کو اپنی بیوی بنا چکا تھا۔ یہ نئی سیکریٹری بھی اس کے اس شغل سے مستثنیٰ نہیں تھی۔

وہ اپنے باس کی بیگم سے بے تکلف نہیں تھی، لہٰذا روحی کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ اُٹھنے لگی۔

"میں تمہارے کام کا ہرج نہیں کروں گی۔" اس نے جلدی سے کہا۔ وہ چاہتی تھی کہ لڑکی بھی ان کی باتیں سُن لے" صرف ایک منٹ لوں گی ــــ تم بیٹھو ــــ"

سیکریٹری نے باس کی طرف دیکھا اور اس کا اشارہ پاکر بیٹھ گئی۔ "کیا بات ہے پیاری؟" اس نے بیوی سے پوچھا۔

"مجھے فرزین کے ہاں کھانے پر جانا ہے۔ راستے میں دیکھا تو بیگ میں بٹوہ نہیں ہے۔ کچھ پیسے چاہئیں۔"

طغرل بے نے جیب میں سے چند نوٹ نکال کر اسے دیتے "بس اتنی سی بات ہے؟"

"جی ہاں۔ اب آپ اپنا کام جاری رکھئے۔ وہ جانے کے لئے مُڑی لیکن مُعارک کر بولی" بے! ایک تشویش ناک بات ہوئی ہے۔ اسمبلی ہال سے شاہراہِ حکمت تک تمام راستے ایک غنڈہ میری کار کا پیچھا کرتا رہا گھر سے نکلتے ہی میں نے اسے کار کے آئینے میں دیکھ لیا تھا۔"

طغرل بے سہم سا گیا" تمہیں پورا یقین ہے کہ کسی شریف آدمی کو بھی اسی سمت میں اور اسی رفتار سے نہیں جانا تھا؟"

"یہ نہیں ہوسکتا۔ راستے میں میں ایک دوکان پر رکی اور وہیں معلوم ہوا کہ بٹوہ بھول آئی ہوں۔ لہٰذا جب آگے بڑھی تو وہ کار پھر پیچھے پیچھے چلی آرہی تھی۔ وہ یہاں کار پارکنگ کی جگہ تک میرے پیچھے آیا۔ میں اتر کر اندر آگئی تو وہ آگے بڑھ گیا۔"

طغرل بے کا ڈر کچھ کم ہوا۔ اس نے کہا" تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ غنڈہ ہی تھا؟ اس نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی۔ مثلاً ہارن بجاکر تمہیں پریشان کیا ہو یا کوئی اور بات ...."

"ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی، لیکن وہ غنڈے کے علاوہ اور کون ہوسکتا تھا؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ بہرحال خواہ کوئی ہو۔ یہ اچھی بات نہیں ہوئی۔ تم نے اسے غور سے دیکھا بھی؟"

روحی نے نفی میں سر ہلایا" بس اتنا ہی کہہ سکتی ہوں کہ بھاری بھرکم آدمی تھا۔ میں آئینے میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکی۔ وہ سیاہ رنگ کی فورڈ میں تھا اور جب کار پارکنگ کی جگہ سے آگے بڑھا تو میں نے کار کا نمبر نوٹ کرلیا۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا۔ ذرا بتاؤ تو نمبر تاکہ میں پولیس کو مطلع کروں؟"

"ایف۔ ایچ بی ۵۴۸"

طغرل بے نے سیکریٹری کی طرف دیکھا۔ اس نے نوٹ بک میں نمبر نوٹ کرلیا" میں معلوم کرلوں گا کہ تمہارا یہ غنڈہ کون ہے۔" اس نے روحی سے کہا" موٹر کاروں کے لائسنس کے دفتر میں میرا ایک دوست ہے"

روحی مطمئن تھی کہ یہ مرحلہ بخیر و خوبی گذر گیا۔ جب کار پارکنگ کی جگہ پر سیاہ رنگ کی فورڈ کھڑی ملے گی تو یہ فرض کرلیا جائے گا کہ پیچھا کرنے والے نے روحی کی واپسی کا انتظار کیا اور جب وہ آئی تو اسے خود اس کی کار میں لے گیا۔ فورڈ ملنے میں دیر نہیں لگے گی۔ کیونکہ روحی جانتی تھی، کیا ہوگا۔ جب وہ فرزین کے ہاں نہیں پہنچے گی تو وہ اس کے گھر فون کرے گی۔ سمن اسے بتائے گی کہ وہ تو گھر سے کب کی چل پڑی ہے پھر وہ طغرل بے سے بھی پوچھے گی کہ روحی اس کے دفتر تو نہیں گئی ہے۔ اس سے طغرل بے کو فوراً روحی کا خیال آئے گا اور وہ کار پارکنگ کی جگہ پر آدمی دوڑائے گا۔

کار ملنے کے بعد اور اس کی رجسٹریشن کے بارے میں بھی معلوم ہوجانے سے بھی کچھ حاصل نہ ہوگا کیونکہ کار چوری کی ہے۔

صولت نے جو منصوبہ بنایا تھا وہ کارگر بھی تھا اور سادہ بھی۔ گذشتہ رات اس نے کار ایک جگہ سے اُڑائی تھی اور اسے کمپنی کے دفتر سے کچھ فاصلے پر ایک گلی میں چھوڑ گیا تھا۔ اب روحی کو صرف یہ کرنا تھا کہ اپنی کار میں اس جگہ جاتی اور چوری کی کار میں بیٹھ جاتی۔ وہ اسے لے جا کر پارکنگ کی جگہ پر کھڑی کر دیتی اور پھر اپنی کار کی طرف پیدل لوٹتی۔

صولت کے منصوبے سے نہ صرف روحی کے اغوا کی کہانی کو تقویت ملتی تھی بلکہ اس سے صولت پر کسی قسم کے شک و شبہے کا امکان بھی ختم ہوجاتا تھا۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ جب روحی غائب ہوئی تو وہ پچاس آدمیوں کے درمیان ورکشاپ میں کام کر رہا تھا۔

پروگرام کے مطابق روحی نے اپنی کار چڑیا گھر کے قریب کھڑی کی۔ بیگ میں سے مصنوعی بالوں کی وگ اور گہرے رنگ کے گاگلز نکال کر لگائے اور قریب ترین بس اسٹاپ پر پہنچی۔ وہاں سے وہ قرافص جانے والی بس پر سوار ہوگئی۔

صولت کے حساب کے مطابق روحی کی کار جب چڑیا گھر کے پاس ملے گی تو یہ فرض کرلیا جائے گا کہ اغوا کرنے والے نے روحی کو یہاں تک اس کی کار میں لاکر، کار چھوڑ دی اور اسے لے کر کہیں غائب ہوگیا۔

روحی بس سے اُتری اور تین بلاک چھوڑ کر اس اقامت گاہ میں پہنچی جس میں صولت نے ایک فلیٹ کرائے پر لے رکھا تھا۔ اس نے صولت کی دی ہوئی چابی سے دروازہ کھولا اس وقت آس پاس کوئی نہ تھا۔

فلیٹ میں بیٹھک، خوابگاہ اور باورچی خانہ تھا۔ باورچی خانہ بیٹھک کے ساتھ تھا۔ صولت نے ریفریجریٹر اور ایک الماری میں کھانے پینے کا سامان کافی مقدار میں بھر رکھا تھا۔

روحی نے وگ اور گاگلز اتار رکھے۔ کھانا کھایا اور ٹیلیویژن دیکھنے بیٹھ گئی۔

صولت نے چھ بجے شکل دکھائی اور اسے بتایا کہ کیا کچھ ہوا۔

"اچھی خبر بھی ہے اور بُری بھی" اس نے کہا "پہلے اچھی خبر سنو۔ تمہارے شوہر کو میرا فون کرنا بڑا کامیاب رہا۔ تین بجے کافی پینے کے لئے وقفہ ہوا تو میں نے ایک پبلک کال بوتھ سے اسے فون کیا۔ میں نے اپنی آواز ایسی بدل لی کہ تم بھی نہ پہچان پائیں۔ تمہاری سہیلی فرزین نے اسے بتادیا ہوگا کہ تم کھانے پر اس کے ہاں نہیں پہنچیں کیونکہ میرے فون کرنے پر اس نے حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ یوں لگتا تھا کہ اسے اس فون کا انتظار ہی تھا۔ وہ ایک لاکھ دینے پر رضامند ہوگیا لیکن پہلے یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ تم خیریت سے ہو۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ وہ آج رات دس بجے گھر پر رہے تم اس سے فون پر بات کرو گی۔"

"اچھا" اب بُری خبر کیا ہے؟"

"تمہارا یہ خیال کہ وہ پولیس کو مطلع کئے بغیر ایک لاکھ دیدیگا غلط نکلا۔ میں اپنے فون کا ردِعمل معلوم کرنے کے لئے اس کے کمرے کے دروازے کو نظر میں رکھے ہوئے تھا۔ فون کرنے کے تقریباً پندرہ منٹ بعد پولیس کا آدھا محکمہ وہاں آدھمکا۔"

روحی کا رنگ اُڑ گیا "لیکن خبروں میں تو یہ بتایا نہیں گیا۔ میں سارا وقت ٹی۔ وی دیکھتی رہی ہوں۔"

"یہ کوئی بات نہیں۔ پولیس نے خبر چھپائی ہوگی۔ وہ جانتے ہیں کہ اس کا نتیجہ خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔ خیر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں مال حاصل کرنے کے لئے جو طریقہ اختیار کررہا ہوں، اس میں پولیس ہانپتی رہ جائے گی۔"

رات ساڑھے نو بجے وہ اپنی پناہ گاہ سے نکلے۔ روحی نے وگ کے ساتھ گاگلز لگا رکھے تھے۔

پبلک کال بوتھ سے روحی نے نمبر ملایا تو دوسری طرف طغرل بے تھا۔

روحی نے آواز کو گلوگیر بناکر کہا "سرتاج! مجھے بات کرنے کے لئے صرف ایک منٹ ملا ہے۔ میں یہ نہیں بتاسکتی کہ کہاں ہوں اور نہ آپ کے سوالات کا جواب دے سکتی ہوں۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں دی جا رہی ہے لیکن اس وقت میرے پشت سے ریوالور کی نالی لگی ہوئی ہے اور یہ آدمی کہہ رہا ہے کہ اگر آپ نے رقم نہ دی تو یہ مجھے جان سے مار ڈالے گا۔ خدا کے لئے انکار نہ کرنا بے!"

"میں ضرور دوں گا، پیاری" طغرل بے نے اسے تسلی دی۔ "تم مطمئن رہو۔"

صولت نے روحی کے ہاتھ سے ریسیور لیا اور درشت لہجہ بناکر بولا "اب تو تم مطمئن ہو کہ تمہاری بیوی زندہ ہے اب تمہیں جو کرنا ہے وہ غور سے سنو! کل صبح بنک کھلتے تو تم چیک کیش کراؤ گے اور ایک لاکھ پونڈ کے بیس بیس کے نوٹ لو گے۔ انہیں اپنے بریف کیس میں دفتر لے جاؤ گے اور ڈاک کا انتظار کرو گے۔ مزید ہدایات ڈاک سے مل جائیں گی۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔

جب وہ کار میں بیٹھے تو روحی نے کہا "میرا خیال تھا کہ تم ساری ہدایات فون پر دو گے۔"

"یہی کروں گا۔ ڈاک کا چکر اس لئے چلایا ہے کہ پولیس اس کا فون ٹیپ نہ کر رہی ہو۔ اور میں دوبارہ فون کروں تو کہیں پکڑا نہ جاؤں۔ اسی غلطی نے تو اس احمق عزت بیگ کو پکڑوا دیا تھا۔ وہ اپنی بیوی کی تدفین کے تین گھنٹے بعد ہی اپنی محبوبہ کو فون کر بیٹھا تھا۔ اس کے فون کی نگرانی کی جارہی تھی۔"

"یہ عزت بیگ کون ہے؟"

صولت فوراً سنبھل کر بولا "فوج میں میرا کمانڈنگ آفیسر تھا۔ اسی کی حماقت سے فوج میں میرا مستقبل تباہ ہوا۔ مارشل کے دماغ میں یہ احمقانہ بات سما گئی کہ عزت بیگ نے میرے ذریعے اپنی بیوی کو قتل کرایا۔ اسے یہ شبہہ اس بنا پر ہوا کہ میرے بنک میں چار ہزار پونڈ جمع کرانے سے ایک روز پہلے اس نے اپنے اکاؤنٹ میں سے پانچ ہزار پونڈ نکالے تھے میرے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم کہ اس نے پیسے بنک سے کیوں نکالے۔ البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ اس نے بیوی کا پتہ صاف کرنے کے لئے کرائے کا آدمی ضرور حاصل کیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ اس سے چھٹکارا پانا چاہتا

تھا۔ بہر حال اس میں میرا ہاتھ نہیں تھا۔ میں پیسوں کے لئے ایسا گھناؤنا کام نہیں کر سکتا۔"

"تو کیا، تم پر قتل کا الزام تھا؟" روحی نے کپکپاتی آواز سے کہا

"مجھ سے پوچھ گچھ کی گئی تھی۔" صولت بولا "لیکن کیس بنانے کے لئے ہم دونوں میں سے کسی کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اس کے باوجود مارشل ہمارے پیچھے پڑ گیا اور پھر وہی ہوا جو فوج میں سپاہیوں سے جُرم سرزد ہونے پر کیا جاتا ہے۔ لیکن کوئی ثبوت ہوتا تب نا! خیر، عزت بیگ پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ استعفیٰ دے دے اور مجھے ڈسچارج کے لئے درخواست دینے پر مجبور کر دیا گیا۔ عزت بیگ کو دو باتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ استعفیٰ دے یا جہاز میں بیٹھ کر جزیرے کا راستہ لے مجھے یہ سزا ملی کہ معزول کر کے گوبھی کی کاشت پر لگا دیا گیا۔"

"لیکن تمہارا تو اس قتل سے کوئی تعلق نہیں تھا؟ تھا کوئی تعلق؟"

وہ مسکرایا "کیا میں تمہیں قاتل لگتا ہوں؟"

وہ بھی جواباً مسکرائی "تم تو عاشقِ صادق لگتے ہو!"

صولت اس کے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ وہ اسکی گمشدگی کے دوران لوگوں کی نظروں کے سامنے زیادہ سے زیادہ رہنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے علاقے کے قہوہ خانے میں رات دو بجے تک رہنے کی ٹھانی تاکہ جان پہچان کے لوگ اس کی تصدیق کر سکیں۔

دوسرے روز بھی وہ روحی کے پاس آدھی رات سے پہلے نہیں آیا اس وقت تک بھی خبروں میں اغوا کے بارے میں نہیں بتایا گیا تھا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے کہا "وگ اور گاگلز اُٹھاؤ اور چلو!"

"کیا کام ہو گیا؟" روحی نے پوچھا

"ہو ہو۔ ہا ہا ہا! ایک لاکھ کا بریف کیس نیچے گاڑی میں پڑا ہے۔"

روحی نے جلدی سے وگ اور گاگلز لگائے اور بولی "ان کھانے پینے کی چیزوں کا کیا ہو گا؟"

"میں کل آکر سب ٹھکانے لگا دوں گا۔" صولت نے جواب دیا "ہفتے کے آخر تک کا کرایہ بھی دیا جا چکا ہے۔ اب جلدی بھی کرو۔"

جب وہ کار میں بیٹھے تو وہ جنوب کی سمت میں ہو لیا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" روحی نے پوچھا

"تمہیں کاشف لے جا رہا ہوں۔"

"ارے اتنی دور کیوں؟ میرا خیال تھا کہ تم مجھے عرطاش کے آس پاس کہیں چھوڑ دو گے۔ گھر واپس جا کر یہ نہیں بتاؤں گی کہ کہاں رہی کیونکہ میری آنکھوں پر تو پٹی باندھ دی گئی تھی!"

"یہ پروگرام تھوڑا سا بدل گیا ہے۔" صولت نے کہا۔

دونوں خاموشی سے راستہ طے کرنے لگے۔ معاً روحی نے پوچھا "رقم کی وصولی میں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟"

"بالکل نہیں۔ دراصل میں نے وصولی کے کام کو تھوڑا آسان بنا لیا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"جب ہم اپنی منزل پر پہنچیں گے تب بتاؤں گا۔" اس نے کہا "اس وقت تو میں پیارے پیارے نوٹوں کے سرور میں رہنا چاہتا ہوں۔"

کاشف کے ساحل پر ایک سنسان جگہ ان کی کار رکی تو ایک بج چکا تھا۔

"اس ویران جگہ کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟" روحی نے پوچھا

"کیوں نہ آتی؟" صولت بولا "اُترو ذرا ٹہلیں گے۔"

اس نے اس طرح کہا جیسے عیش کے موڈ میں ہو۔ اس بے وقت کی رنگینی سے روحی کچھ حیران سی ہوئی۔ لیکن اس پر محبت کا نشہ کچھ ایسا چڑھ چکا تھا کہ وہ صولت کی کسی بات سے انکار نہ کر سکتی تھی۔

وہ کار سے اُتر پڑی۔ خوشگوار رات تھی۔ آسمان چاند سے محروم تھا لیکن تارے جگمگا رہے تھے۔

وہ ٹہلتے ہوئے چلے تو روحی نے صولت کا ہاتھ تھام لیا۔

"تم بتانے والے تھے کہ رقم کی وصولی آسان کیسے ہو گئی؟" اس نے کہا۔

"ہاں۔ جب میں نے تمہارے شوہر کو صبح فون کیا تو اس نے مجھے ایک چکر میں ڈال دیا۔ کہنے لگا، مجھے معلوم تھا کہ تم لکھ کر بھیجنے کی بجائے فون کرو گے۔ میں اس وقت اپنے پرائیوٹ کمرے میں ہوں اور ہماری باتیں کوئی نہیں سن رہا ہے۔ "اگر تمہیں ایک لاکھ کی جگہ دو لاکھ مل جائیں تو کیسا رہے گا؟" جب میں نے پوچھا، یہ کیسے! تو اس نے مجھے ایک فون نمبر دیا اور کہا کہ اس نمبر پر سات بجے فون کروں۔ اس نے

یقین دلایا کہ فون ٹیپ نہیں کیا جائے گا اور ہم بلاخوف وخطر بات کر سکتے ہیں۔ وہ اپنے نمبر پر اسلئے بات نہیں کرنا چاہتا ہے کہ اس پر کال سوئچ بورڈ کے ذریعے ملائی جاتی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ ٹھیک ہے۔ میں اس کے ... دیئے ہوئے نمبر پر سات بجے فون کروں گا۔ جب میں نے اس نمبر کی ٹوہ لی تو جانتی ہو یہ کس کا نکلا؟ تمہارے شوہر صاحب کی سیکریٹری صاحبہ کا!"

"اس کا ــــ؟" روحی دنگ رہ گئی۔

"جی ہاں ــ اسی کا۔ اس کے علاوہ ایک لاکھ کی مزید پیشکش کا معمّہ بھی حل ہو گیا۔ جب میں نے اسے سات بجے فون کیا اور اس کی تجویز سُنی تو میرا ماتھا ٹھنکا کہ وہ اب اپنی تیسری سیکریٹری سے بیاہ رچانے کی فکر میں ہے۔ مزید ایک لاکھ تمہیں قتل کرنے کے لئے تھے"

اب وہ ساحل پر پہونچ چکے تھے۔ روحی نے رُک کر تاریکی کی جالی سے صولت کو گھور کر دیکھا۔

"اس کے کہنے کے مطابق یہ کوئی بعید از قیاس بات نہیں؟"

صولت نے کہا "ہم نے پبلک کال بوتھ سے جو باتیں کی تھیں۔ وہ پولیس والوں نے سُن لی تھیں اور انہیں اس اغوا کے بارے میں قطعی تامّل نہیں تھا۔ یہ اکثر ہوتا ہے کہ اغوا کرنے والے اپنے شکار کو مار ڈالتے ہیں۔"

"درندہ ــ!" روحی دانت پیس کر بولی "اور مجھے دیکھو! میں نے اس کی موت کا ذکر تک سننے سے انکار کر دیا تھا۔"

"ہاں ــ اور یہی تمہاری غلطی تھی۔ اس کی تجویز سُن کر مزید کچھ کہنے سُننے کے لئے نہیں رہ گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ نوٹوں کا بریف کیس فلاں گلی میں لے آئے۔ میں وہاں پہنچ کر سٹرک کی دوسری طرف جا چھپا اور اسے دیکھنے لگا۔ مجھے اس کا اندیشہ نہیں تھا کہ وہ کوئی چال چلے گا۔ میں ڈر یوں رہا تھا کہ وہ مجھے دیکھ نہ لے۔ ابھی دوسرا مرحلہ بھی تو باقی تھا!"

"دوسرا مرحلہ؟" روحی نے پوچھا۔ اس کی آنکھیں ایک انجانے خوف سے پھیل گئیں۔ اور اس نے صولت کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"ہاں دوسرا مرحلہ! یہ میرے لئے آسان ہو جائے گا۔ وہ رقم ضرور دے گا۔ یہ خطرہ ہرگز مول نہیں لے گا کہ اغوا کرنے والا پولیس کو بتا دے کہ اسے تمہیں قتل کرنے کے لئے کس نے کہا تھا۔ میں نے بھی اس سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اگر اس نے دوسرے ایک لاکھ دینے میں پس و پیش کیا تو اپنا انجام سوچ لے۔!"

روحی کی آنکھیں اور پھیل گئیں۔ وہ اندھیرے میں بھی صولت کے چہرے کو پڑھ سکتی تھی کہ اس پر اس کے ذہن نے کیا تحریر کیا ہے۔ اس مرتبہ اسے صولت کے اس سوال کا مختلف جواب دینا تھا۔ جو اس نے دو مرتبہ پوچھا تھا۔ اسے بتانا تھا کہ ہاں وہ قاتل ہے ــــ اس کا عاشق نہیں۔

مُطالعہ کرنے امتحان دینے اور یادداشت بڑھانے کیلئے ایک بے حد کارآمد نفسیاتی کتاب

امتحان میں کامیابی حاصل کیجیے

ــــ قیمت ۲/۲۵ روپے ● محصول ڈاک : ایک روپیہ ــــ

مکتبۂ نفسیات ۵۔ فرئیر مارکیٹ، کراچی

وفاداری

دوسری جنگِ عظیم کی ایک ولولہ انگیز کہانی

سید محمود زمان علی

زرد چاند آسمان میں لٹکا ہوا خوفزدہ نظروں سے زمین کے بھیانک منظر کو دیکھ رہا تھا۔ چاروں سمت انسانی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ جرمن ٹرک ان لاشوں کو دن بھر سمیٹتے رہے تھے، لیکن اُن کی تعداد اتنی تھی کہ ایک دن میں وہ صاف نہ ہوسکیں اور باقی کام دوسرے دن پر ملتوی کردیا گیا۔ لاشیں ڈھونے والے فوجی قیدی موت کی چاپ سے ڈرے ہوئے کیمپ میں پڑے تھے۔ کسی کے حلق سے کھانسی کی آواز بھی نکلتی تو وہ سہمی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگتا کہ اِس آواز نے کسی جرمن سپاہی کو غصّہ تو نہیں دلا دیا ہے۔

یہ کیمپ پولینڈ کے ایک مشرقی حصّے میں تھا۔ جرمن فوجی اس علاقے سے خاص طور سے نفرت کرتے تھے کیونکہ یہاں کے شہریوں نے زبردست مزاحمت کی تھی اور اس علاقے میں جرمن فوجیوں کو کافی نقصان اُٹھانا پڑا تھا چنانچہ اس علاقے پر قبضہ کرنے کے بعد جرمن فوجیوں نے آزاد نہتّے شہریوں سے بھرپور انتقام لیا۔ ایک ایک مرد، بوڑھے اور بچّے کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا اور پورا علاقہ لاشوں کا جزیرہ بن گیا۔ چپّے چپّے پر انسانی لاشیں بکھری ہوئی تھیں ایک بھی مرد کو زندہ نہیں چھوڑا گیا تھا۔ اور جب کسی بھی گھر میں ایک مرد باقی نہ بچا تو حسبِ عادت جرمن فوجی عورتوں کو باہر ہانک لائے۔

عورتوں کے لئے علیحدہ کیمپ بنایا گیا تھا۔ اِس کیمپ میں اُنھیں بھیڑ بکریوں کی طرح بھر دیا گیا۔ علاقہ فتح کرنے کے بعد جرمن فوجیوں نے یہاں کا انتظام سنبھالا، فوجی قیدیوں کو یہاں قائم شدہ کیمپ میں منتقل کردیا گیا تاکہ اُن سے بیگار کام لئے جائیں۔ مضبوط کیمپ قائم کرنے کے بعد لاشیں ڈھونے کا کام شروع ہوگیا۔ لیکن سڑی ہوئی متعفّن لاشوں کو اُٹھانا اتنا آسان کام نہ تھا کہ ایک ہی دن میں ہوجاتا۔ قیدی دن بھر گدھوں کی طرح کام کرتے رہے تھے لیکن تمام علاقے کو لاشوں سے صاف نہیں کیا جاسکا۔ اور باقی کام دوسرے دن پر ملتوی کردیا گیا تھا!۔

اِس علاقے کا انتظام ایک جرمن کرنل ہنتوگ کے سپرد کردیا گیا تھا۔ دُبلے پتلے جسم، لمبے قد کا مالک ہنتوگ تشدّد پسند حلقوں میں خاصی دلکش شخصیت کا حامل تھا۔ وہ دشمن قیدیوں پر مظالم کے ایسے ایسے انوکھے طریقے ایجاد کرتا تھا کہ فرشتۂ موت بھی کانپ کانپ جاتا ہوگا۔ ایک حلقہ اُس کی کارستانیوں کا بے حد مدّاح تھا اور دوسرے افسر اس سلسلہ میں اُس کے شاگرد بننے کے خواہشمند تھے۔ اُس کے رائج کئے ہوئے طریقے اکثر جنگی قیدیوں کے کیمپ میں استعمال کئے جاتے تھے اور نازی درندے اُن سے خوب لطف اندوز ہوتے تھے۔

اِس وقت بھی کرنل ہنتوگ ایک تباہ شدہ عمارت کے اس حصّے میں، جو جرمن بمباری کے باوجود صحیح سلامت رہا تھا، ایک بڑے ہال نما کمرے میں بیٹھا شراب سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ تین میجر اور دوسرے کچھ لوگ اُس کے ساتھ اس محفل میں شریک تھے۔ ایک کونے میں رکھے ہوئے گراموفون سے موسیقی کی ہلکی لہریں اُٹھ رہی تھیں جنھوں نے ماحول کو رنگینی بخش دی تھی۔ میجر ہیرن نے اپنے گلاس کی شراب معدے میں انڈیل کر ایک جھٹکے سے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے کرنل ۔ اِس بار بڑے صبر سے کام لے رہے

ہو۔ کیا پولینڈ کی حسین تتلیاں ہماری آغوش کی گرمی کے لئے یونہی تڑپتی رہیں گی۔؟"

کرنل ستوگت نے بھاری پلکیں اُٹھائیں۔ اور میجر ہیرن کو دیکھتے ہوئے خشک لہجے میں بولا۔ "صرف کل تک۔ کل تک انتظار ضروری ہے۔ کل علاقے سے لاشوں کی گندگی بھی ختم ہو جائے گی۔ اِس کے علاوہ عورتوں کے کیمپ میں چھانٹی بھی کل ہی کرادی جائے گی۔ صاف ستھری اور کام کی عورتوں کو رکھ لیا جائے گا۔ ہمارے پاس فضول ضائع کرنے کے لئے راشن نہیں ہے۔ میں نے میڈم لوس کو حکم دے دیا ہے۔"

"کل تک۔!" میجر ہیرن نے مغموم انداز میں گردن ہلائی اور پیچھے کھڑے ہوئے خادم کو اشارہ کیا۔ خادم جلدی سے میجر ہیرن کے گلاس میں شراب انڈیلنے لگا۔ اور میجر ہیرن نے گلاس اُٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

زرد اور بیمار چاند نے تھکے تھکے قدموں سے آسمان کا فاصلہ طے کیا اور مشرق کی گود میں پہنچ کر روشنی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ اُس نے ایسے ایسے دہشتناک مناظر دیکھے تھے کہ اُس کا دل کانپ رہا تھا اور وہ خواہش کر رہا تھا کہ دوسرے دن اسے نہ طلوع ہونا پڑے۔ سورج نے اُس کے خوف پر ایک قہقہہ لگایا اور سینہ تانے ہوتے مشرق سے چہرہ نکال لیا۔ اس کی کرنیں اُن مناظر کو تلاش کرنے لگیں جنہوں نے چاند کو اس قدر خوفزدہ کر دیا تھا۔ اور چند لمحات کے بعد وہ مناظر اُس کے سامنے تھے!۔ کیمپ میں موجود قیدی جاگ اُٹھے تھے۔ مصائب کا ایک اور دن شروع ہو چکا تھا۔ جرمن فوجی قیدیوں کو ناشتہ دے رہے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں لمبی لمبی بالٹیاں تھیں جن میں ناقص اور سیال غذا تھی جسے وہ قیدیوں کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے غلیظ پیالوں میں ڈال رہے تھے۔ بعض قیدی اِس غذا سے گھن کھا رہے تھے لیکن اس کا اظہار نہیں کر پا رہے تھے۔ ایک بوڑھے قیدی کا پیالہ اُس کے ہاتھوں میں لرزنے لگا اور جونہی جرمن سپاہی نے اُس کے پیالے میں گرم غذا ڈالی، پیالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ پیچھے کھڑے ہوئے جرمن سپاہی نے اُس کی اس حرکت پر دانت پیسے اور دوسرے لمحے اُس کے بوٹ کی ٹھوکر قیدی کی ناک پر پوری قوت سے پڑی۔ قیدی کی ناک کی ہڈی ٹوٹ کر حلق میں گھس گئی اُس کے سامنے کے دانتوں کی پوری قطار اُکھڑ گئی اور وہ گھٹی گھٹی آواز میں چیخ پڑا۔ لیکن جرمن سپاہی کو شدید غصہ آگیا تھا اُس نے مزید چند ٹھوکریں قیدی کے جسم کے نازک حصوں پر ماریں اور قیدی نے اُسی جگہ دم توڑ دیا۔ دوسرے قیدی اُسے مرتے ہوئے دیکھ بھی نہ سکے کیونکہ غذا بانٹنے والے اب اُن کی طرف آ رہے تھے۔

قیدی کتوں کی طرح اس بدبودار غذا کو معدے میں انڈیلنے رہے

اور جب صبح کا ناشتہ مل چکا تو انھیں کام کے لیے تیار ہوجانے کی ہدایت کی گئی۔ تمام فوجی قیدی مشینی انداز میں کھڑے ہوگئے اور قطار کی شکل میں کیمپ سے باہر نکلنے لگے۔ باہر اسٹین گنوں سے لیس جرمن دستہ انھیں کنٹرول کرنے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ فوجی قیدیوں کے کئی گروپ بنائے گئے اور جرمن فوجی ایک ایک گروپ کو لیکر چل پڑے۔ سب سے پہلا کام لاشیں صاف کرنے کا ہی تھا۔ ٹرک حرکت میں آگئے اور سڑی ہوئی لاشیں اُٹھا اُٹھا کر ٹرکوں میں بھری جانے لگیں۔!

جرمن سپاہی ناکوں پر بھورے رنگ کے رُومال باندھے ہوئے تھے جبکہ لاشیں اُٹھانے والے قیدیوں کے لیے ان کی کوئی ضرورت نہیں تھی وہ اسی طرح لاشیں اُٹھا اُٹھا کر ٹرکوں پر لاد رہے تھے۔ اُن کے ہاتھ غلاظت میں لتھڑے ہوئے تھے جنہیں وہ صاف بھی نہیں کرسکتے تھے۔ ایک قیدی انتہائی برداشت کے باوجود اپنی بگڑی ہوئی طبیعت پر قابو نہیں پاسکا۔ اور سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس کی طبیعت بگڑ رہی تھی، لیکن اُس کے پیچھے ہی کھڑے ہوئے ایک جرمن سپاہی نے اُس کی مشکل حل کردی۔ اُس نے قریب پڑی ہوئی کُدال اُٹھائی اور اسے بلند کرکے قیدی کی کھوپڑی میں اُتار دیا۔ کُدال کا ایک سائڈ جس کا سائز دس انچ سے کم نہ تھا۔ قیدی کی گردن تک پہنچ گیا۔ اور کسی نے قیدی کی چیخ بھی نہ سُنی وہ کُدال کے وزن سے ایک طرف لڑھک گیا۔ اور دوسرے قیدی انتہائی طور پر خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگے۔ لاشیں اُٹھانے کا کام جاری رہا۔ لنچ کے وقفے سے چند منٹ قبل وہ کام ختم ہوگیا۔ اور چاروں طرف سے بلند ہونے والی سیٹیوں کی آوازوں نے قیدیوں کو بتایا کہ اب اُن کی چھٹی ہے اور انھیں کام کی جگہ کے بجائے کیمپ ہی میں جاکر لنچ کرنا ہوگا۔!

سورج غصّے سے کھول رہا تھا۔ لیکن اِن انسان نما درندوں کی درندگی کو روکنا اُس کے بس کی بات نہیں تھی۔ چنانچہ اُس نے واپسی کا سفر شروع کردیا اور تیزی سے مغرب کی طرف جھکنے لگا۔ بادلوں کے ٹکڑوں نے اس کے چہرے پر نقاب ڈال دیا۔ اور اُس نے سکون کی سانسیں لیں، اب وہ زمین پر ہونے والے خونیں ڈرامہ کو دیکھنے کے لیے مجبور نہیں تھا۔

شام کے چار بجے تھے۔ کرنل ہنتوگ ایک صاف ستھرے علاقے میں اپنا خیمہ لگائے ہوئے تھا۔ دن وہ اِسی خیمے میں گزارتا تھا اور اسے شہر کی پوری کارکردگی کی رپورٹ یہیں ملتی تھی۔ اِس وقت بھی وہ آرام کرسی کی پشت سے گردن ٹکائے پیچھے جھکا ہوا تھا کہ اُس کی نگاہ خیمے کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف اُٹھ گئی۔ میڈم لوس شاید اس کے پاس ہی آرہی تھی۔ سوا چھ فٹ کے قدوقامت کی یہ مرد نما عورت جسقدر خونخوار تھی ہنتوگ کو معلوم تھا۔ اُسے میڈم لوس کی پُرانی زندگی کے بارے میں بھی معلوم تھا۔ پہلے وہ عصمت فروشی کے کئی اڈوں کی مالک تھی۔ اُس کا پورا گروہ تھا جو لڑکیاں اغواء کرکے اُس تک پہنچاتا تھا اور پھر وہ اِن لڑکیوں کو "کام" کے قابل بنالیتی تھی، بہت غصّہ ور اور جلّاد قسم کی عورت تھی۔ اگر کسی لڑکی نے بغاوت کی تو وہ اس کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک کرتی تھی کہ پھر دوسری لڑکیوں کو بغاوت کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ پھر ایکبار اُس نے ایک پولیس افسر کی لڑکی کو اغواء کرکے پوشیدہ کردیا، پولیس افسر خود بھی لوس کا گاہک تھا اور اُس کے طریقۂ کار سے واقف بھی تھا اپنی بیٹی کے اغواء کا شبہ بھی اُس نے لوس پر ہی کیا اور اُس کے سر پر پہنچ گیا۔ میڈم لوس نے لڑکی کے اغواء پر لاعلمی ظاہر کی جس پر پولیس افسر برہم ہوگیا اور وہ میڈم لوس کو پکڑوا کر لے گیا۔ اُس پر تشدّد کیا، لیکن لوس یہی کہتی رہی کہ اُسے اس کی لڑکی کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے، مجبور ہوکر پولیس افسر نے اُسے چھوڑ دیا، لیکن میڈم لوس انتقام کی آگ میں جل رہی تھی۔ ایک شاہراہ کے چوراہے پر پولیس افسر کو اپنی بیٹی کی لاش ملی۔ اُس کے جسم سے جگہ جگہ سے کھال اُتروالی گئی تھی۔ اور جسم کے نسوانی حصّوں کو تیزاب سے جلادیا گیا تھا۔ پولیس افسر بیٹی کی لاش دیکھ کر دیوانہ ہوگیا۔ اُسے یقین تھا کہ یہ میڈم لوس کے علاوہ کسی کا کارنامہ نہیں ہے، چنانچہ وہ پولیس کا پورا دستہ لے کر میڈم لوس کے ایک اڈّے پر چڑھ دوڑا۔ یہاں لوس نے ایک حماقت کی۔ اُس نے پولیس سے مقابلہ کیا اور بارہ پولیس والوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اگر وہ خود کو پولیس کے حوالے کردیتی تو پولیس افسر عدم ثبوت کی بناء پر اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا! بہرحال میڈم لوس پر قابو پالیا گیا اور اُسے عمر قید کی سزا ہوئی۔ پھر جب ہٹلر نے جنگ کا منصوبہ بنایا تو لوس نے ایک قیدی کی حیثیت سے رضاکارانہ طور پر خود کو فوج میں شامل ہونے کے لئے پیش کردیا۔ لوس کے پُرانے گاہکوں نے جو فوج میں بھی تھے اُس کی بھرپور سفارش کی اور لوس کو قید سے نجات مل گئی اور پھر اُس نے ایسے ایسے کارنامے انجام دیئے کہ اُس کی بڑی اہمیت ہوگئی گرفتار شدہ عورتوں کی اس سے بہتر نگہبان اور کوئی نہ ہوسکتی تھی۔!

ہنتوگ کے خیمے کے سامنے کھڑے ہوئے گارڈ نے اندر آکر ایڑیاں بجائیں اور ہنتوگ گردن اُٹھا کر اُسے دیکھنے لگا۔

"میڈم لوس آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔"

"بلاؤ۔" اُس نے جواب دیا اور گارڈ ہاتھ اٹھاکر باہر چلا گیا۔

چند لمحات کے بعد ڈراؤنی شکل کی میڈم لوس اندر آگئی۔ اُس نے ہنتوگ کو فوجی

سلام کیا اور پھر بولی۔

"آپ کے حکم کے مطابق میں نے مقامی عورتوں کی چھانٹی کے لئے پانچ بجے کا وقت مقرر کیا ہے۔ کیا آپ بذاتِ خود کیمپ میں آنا پسند کریں گے؟"

ہسنوگ نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا۔ انتظامی امور سے اُسے فرصت تھی چنانچہ اُس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے، ہم پانچ بجے کیمپ پہنچ جائیں گے۔"

"شکریہ جناب۔ اس کے علاوہ میں نے آپ کے لئے ایک تحفہ بھی تلاش کیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ آج رات وہ تحفہ آپ کی خدمت میں پیش کروں۔"

"خوب، تمہیں یقین ہے کہ وہ ہمارے قابل ہے؟"

"اِس بارے میں میری نگاہیں اٹھارہ سالہ تجربہ رکھتی ہیں۔" اُس نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ ہم تمہارے تجربے کو چیلنج نہیں کرسکتے۔" ہسنوگ نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "بہرحال اِس تحفے کا شکریہ قبول کرو۔ پانچ بجے ہم اُسے بھی دیکھیں گے۔"

"یہی عرض کرنے حاضر ہوئی تھی، اجازت چاہتی ہوں۔" میڈم لوس نے کہا اور ہسنوگ کی اجازت پر وہ باہر چلی گئی۔ ہسنوگ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ضرور میڈم لوس نے کوئی نایاب شئے تلاش کی ہوگی۔ اُس نے سوچا اور اپنی کرسی سے اُٹھ گیا۔ اُسے کچھ ضروری کام کرنے کے بعد عورتوں کے کیمپ جانے کی تیاری کرنی تھی۔!

ٹھیک پانچ بجے وہ عورتوں کے کیمپ کے نزدیک پہنچ گیا۔ سورج دم توڑ چکا تھا۔ اب وہ دور پہاڑیوں کے سروں پر زرد روشنی پھیلانے کے علاوہ اور کچھ نہ کرسکتا تھا۔ کیمپ پر شام جھک آئی تھی، سہمی ہوئی عورتیں بھیڑ بکریوں کی طرح ایک دوسرے کے جسم میں منہ گھسیڑے بیٹھی تھیں۔ اُن کے لباس پھٹے ہوئے تھے جن سے اُن کے سفید سے گداز جسم جھانک رہے تھے، بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ دھوپ اور پسینے کی تمازت سے اصل رنگ کھو بیٹھا تھا۔ اُس پر گرد جم گئی تھی۔

میڈم لوس نے کیمپ کے دروازے پر اس کا استقبال کیا اور وہ اپنے ساتھی میجروں کے ساتھ نیچے اُتر آیا۔ قطار میں کھڑے ہوئے فوجیوں نے اسٹین گنیں سیدھی کرلیں اور اُس نے میجر سے کچھ کہا۔ میجر میڈم لوس کے نزدیک پہنچ گیا۔ اُس نے ہسنوگ کا پیغام لوس کو دیا اور لوس مُسکرانے لگی۔ اُس نے جواب میں میجر سے کچھ کہا اور میجر واپس آگیا۔

پھر کیمپ کے ایک راستے پر وہ سب قطار میں کھڑے ہوگئے، اور میڈم لوس دس فوجی جوانوں کے ساتھ کیمپ میں داخل ہوگئی۔ ان جوانوں کے پاس چمڑے کے چابک تھے جنہیں ہلاتے ہوئے وہ آگے بڑھ رہے تھے میڈم لوس نے کڑکتی ہوئی آواز میں تمام عورتوں سے کھڑے ہوجانے کو کہا اور سہمی ہوئی عورتیں اس کے اشارے کو سمجھتے ہوئے جلدی جلدی کھڑی ہوگئیں۔ قطار میں کھڑے ہوئے فوجیوں کے دانت نکل پڑے۔ کیونکہ ان عورتوں کے پھٹے ہوئے لباس ستر پوشی کے لئے ناکافی تھے اور اُن کے جسم برہنہ نظر آرہے تھے۔ بعض تو بالکل برہنہ ہوگئی تھیں۔ اندر داخل ہونے والے فوجی میڈم لوس کے ساتھ کیمپ کے آخری سرے تک پہنچ گئے! اور میڈم لوس نے دوسرا حکم صادر کیا۔ اُس نے عورتوں کو قطار بنانے کے لئے کہا تھا۔ اور سپاہی چابک مار مار کر عورتوں سے میڈم کے حکم کی تعمیل کرانے لگے۔

عورتوں نے دُور دُور تک قطاریں بنالیں اور پھر میڈم لوس پہلی قطار سے شروع ہوئی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک لمبی چھڑی تھی۔ جس عورت کے سینے پر وہ چھڑی رکھ دیتی۔ سپاہی اُسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹ لیتے اور پھر اُسے چابک مار کر آگے جانے کا اشارہ کیا جاتا اور وہ کیمپ کے دروازے کے نزدیک کھڑی ہوجاتی۔ میڈم لوس تیزی سے اپنا کام کر رہی تھی۔ وہ ایک ایک قطار میں جاکر اُس میں عورتوں کو چھانٹتی اور پھر دوسری قطار کی طرف متوجہ ہوجاتی۔ لائن سے نکالی جانے والیوں میں چالیس سال سے اوپر کی عورتیں اور چودہ سال سے کم کی لڑکیاں تھیں۔ کوئی اِس سے بھی کمسن لڑکی اگر تندرست جسم رکھتی تو اُسے چھوڑ دیا جاتا، یا کوئی چالیس سال سے اوپر کی عورت حسین جسم کی مالک ہوتی اور اُس کے چہرے پر جھریاں نہ ہوتیں تو میڈم لوس اُسے بھی نظرانداز کردیتی۔

پینتالیس منٹ میں اُس نے اپنا کام ختم کرلیا۔ تقریباً ڈھائی سو عورتیں ایسی نکالی گئی تھیں جن کی عمر چودہ سال سے کم اور چالیس سال سے زیادہ تھی۔ چودہ سال سے کم عمر کی معصوم لڑکیاں ہراس بھری نظروں سے جرمن سپاہیوں کو دیکھ رہی تھیں۔ میڈم لوس نے سپاہیوں کو کوئی حکم دیا اور بیس پچیس سپاہی اِن عورتوں کو ایک طرف ہانکنے لگے۔ پیچھے رہ جانے والی عورتوں کے جسموں پر چمڑے کے چابک پڑتے تو وہ دوڑنے لگتیں۔ وہ چیختی روتی اس طرف دوڑ رہی تھیں جدھر جرمن سپاہی انھیں لے جارہے تھے۔ پھر وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں مٹی کے پہاڑ نظر آرہے تھے۔ یہ گڑھا خود جرمن

سپاہیوں نے کھودا تھا۔ طویل و عریض گڑھا کافی گہرا تھا اور اس سے نکلنے والی مٹی کے انبار پہاڑی ٹیلوں کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ چھانٹی ہوئی عورتوں کو گڑھے کے پاس لے جایا گیا اور ہستوگ کی جیپ بھی اسٹارٹ ہو کر وہاں پہنچ گئی! ۔ جرمن سپاہیوں نے عورتوں کو گڑھے کے کنارے لائن سے کھڑا کر دیا اور پھر ایک لمبی رسّی کھولی جانے لگی۔ دس دس سپاہیوں نے رسّی کے سرے پکڑ لئے اور عورتوں کی قطار کے ایک سرے سے دوسرے سرے پر کھڑے ہو گئے۔ پھر میڈم لوس نے اپنا رومال بلند کیا اور دوسرے لمحے ہاتھ نیچے گرا دیا اس کے ساتھ ہی رسّی کے سرے پکڑے ہوئے سپاہی تیزی سے دوڑے اور رسّی عورتوں کی کمر سے لگا کر دونوں طرف سے کھینچی گئی۔ کنارے پر کھڑی ہوئی عورتیں بے تحاشہ گڑھے میں جا گریں۔ وہ رو رہی تھیں، چیخ رہی تھیں، فریاد کر رہی تھیں اور اوپر کھڑے ہوئے جرمن درندے قہقہے لگا رہے تھے۔ اس طرح چھانٹی ہوئی عورتوں کو گڑھے میں بھر دیا گیا اور پھر میڈم لوس نے دوسرا حکم دیا۔ جرمن سپاہی ہاتھوں میں بیلچے لئے ہوئے آئے اور تیزی سے گڑھے کے کنارے کھڑے مٹی کے تودے نیچے گرانے لگے۔ نیچے موجود عورتیں دہشت سے چیخ رہی تھیں، ایک دوسرے پر گر رہی تھیں ان کی آنکھوں میں حلق میں مٹی بھر رہی تھی۔ کسی گری ہوئی عورت کے کھلے ہوئے منہ میں مٹی بھر جاتی تو دم گھٹنے کی وجہ سے وہ تڑپنے لگتی۔ اُس کا جسم کئی فٹ اُچھلتا لیکن پھر دوسری عورتیں اُس پر آ گرتیں۔

سورج نے یہ خوفناک منظر دیکھ کر دہشت سے منہ چھپا لیا اور فضاء تاریک ہو گئی۔ گڑھا تیزی سے بھر رہا تھا۔ کہیں کوئی مدد کے انداز میں اُٹھا ہوا ہاتھ مٹی سے نکل آتا لیکن بیلچے سے گری ہوئی مٹی اُسے چھپا دیتی۔ ایک ایک سر کئی بار گڑھے کی مٹی سے اُبھرا اور پھر روپوش ہو گیا۔ اِس طرح ڈھائی سو زندہ انسانوں کی یہ قبر مکمل ہو گئی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد جرمن سپاہی اپنے کام سے فارغ ہو گئے۔!

میڈم لوس مُسکراتی ہوئی ہستوگ کے پاس پہنچ گئی۔ "کیا آپ کو یہ منظر پسند نہیں آیا جناب!" اُس نے ادب سے پوچھا۔

"بے حد میڈم لوس۔ لیکن آپ نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔؟" ہستوگ نے بھی مُسکراتے ہوئے کہا۔

"وعدہ خلافی کی مجال کر سکتی ہوں۔ میرا تحفہ رات کو آپ کی خواب گاہ میں پہنچ جائے گا۔ میرے ماتحت انتظام کر رہے ہیں۔"

"خوب۔! ہم بے چینی سے منتظر ہیں۔" ہستوگ نے کہا اور جیپ کو واپسی کا حکم دیدیا۔ جیپ اسٹارٹ ہو کر واپس مڑ گئی۔

عورتوں کے کیمپ پر موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہر چہرہ دہشت سے سفید تھا! انھیں رات کا کھانا مل چکا تھا۔ لیکن کون جانتا تھا کہ اُن میں سے کس نے کھانا کھایا کس نے نہیں۔ جب موت شہ رگ کے قریب ہو تو دوسری ضروریات دم توڑ دیتی ہیں۔ بدنصیب عورتیں دہشت سے سُکڑی ہوئی بیٹھی تھیں۔ کیمپ کے دروازے پر ہونے والی ہر آہٹ اُن کے کان کھڑے کر دیتی تھی۔ اُنھیں اُن عورتوں کا حشر معلوم ہو گیا تھا جنہیں اُن کے درمیان سے ہانک کر لے جایا گیا تھا اور وہ خود بھی ایسی ہی موت کی منتظر تھیں۔ کسی بھی وقت ایسی ہی موت انھیں بھی آکر دبوچ سکتی تھی۔ چنانچہ سب موت کی منتظر تھیں۔ زیادہ رات نہیں گزری تھی کہ دُور سے تیز روشنیاں نظر آئیں۔ اُن کا رُخ کیمپ کی طرف ہی تھا۔ عورتیں دہشت سے چیخ پڑیں۔ اُن کے جسم کانپنے لگے اور وہ ایک دوسرے میں چھپنے کی کوشش کرنے لگیں۔ موت کی تلوار اُنھیں اپنے سروں پر جھولتی نظر آنے لگی۔

لیکن آنکھیں بند کر لینے سے بلّی غائب تو نہیں ہو جاتی روشنیاں کیمپ کے بالکل قریب پہنچ گئیں۔ بھاری ٹرک تھے جن کی مشینوں کی آوازیں کچھ دیر تک گونجتی رہیں اور پھر سناٹا چھا گیا۔ انجن بند کر دیئے گئے تھے۔ چند جرمن اُن سے نیچے کود آئے اور اُس احاطے کا دروازہ کھول دیا جس میں عورتیں بند تھیں۔ ایک دوسرے میں سر گھُسائے بیٹھی عورتوں پر نیم غشی کی کیفیت طاری تھی۔ انھیں اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا۔ لیکن زمین پر کوڑوں کی شائیں شائیں کی آواز سنکر انہوں نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔ موت کی قربت کے باوجود زندگی بچانے کی خواہش بھی زیادہ دُور نہیں تھی۔ ایک سپاہی نے بگڑی ہوئی انگریزی میں اُن سے کھڑے ہونے کے لئے کہا۔ اُس کے ہاتھ میں ؛ ما کوڑا تھا جس کی پہنچ کافی تھی۔ اُس نے کوڑا گھما کر زمین پر آواز پیدا کی اور تمام عورتیں جلدی سے کھڑی ہو گئیں۔

"باہر چلو۔" سپاہی نے پھر کہا۔ اور عورتوں کے ہونٹوں سے دبی دبی چیخیں نکل گئیں۔ اُنھیں یقین ہو گیا کہ انھیں بھی اُن کے مدفن کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ دو ہی باتیں تھیں، سپاہیوں کے ہنٹر کھا کر بھی مرنا تھا اور جو موت دینے وہ لے جا رہے تھے وہ بھی بہر حال موت تھی۔ زندگی کے چند لمحات ہی سہی۔ اِنسان زندگی سے کس قدر پیار کرتا ہے۔ لاچار عورتیں کیمپ کے احاطے کے دروازے کی طرف چلدیں اور سپاہیوں کے کوڑوں کے سہارے باہر نکل آئیں۔ جہاں دوسرے سپاہی انھیں کمر سے پکڑ پکڑ کر ٹرکوں میں سوار کرانے لگے۔ اس دوران وہ انتہائی نازیبا حرکتیں بھی کرتے جا رہے تھے لیکن اُن کی حرکتوں پر ایک سسکی کے علاوہ اور کوئی آواز اُن کے حلق سے نہ نکلتی۔

تقریباً آٹھ ٹرکوں میں تمام عورتوں کو ٹھونس دیا گیا۔ اور پھر ٹرک اسٹارٹ ہو کر چل پڑے۔ عورتیں بالکل خاموش تھیں البتہ سپاہی ایک

دوسرے سے مذاق کر رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ فاصلہ زیادہ طویل نہیں تھا' اُنہیں فوجی چھاؤنی میں لے جایا گیا۔ عورتوں کی تعداد کم تھی اور فوجی بہت زیادہ' چنانچہ آج صرف افسران کی رات تھی۔ افسروں کے کیمپ کے سامنے ٹرک رک گئے اور عورتوں کو نیچے اتارا جانے لگا۔ اور پھر اُنہیں افسروں کے کیمپ میں ہانک دیا۔ شراب کے نشے میں بدمست فوجی افسروں نے انہیں دیکھ کر قہقہے لگائے۔ خوشی کے نعرے لگائے اور پھر اس طرح اُن پر ٹوٹ پڑے جیسے بھوکے باز چڑیوں کے غول پر۔ برہنہ اجسام اِدھر اُدھر دوڑتے پھر رہے تھے افسر اُن کے جسموں کو شراب سے نہلا رہے تھے اور پھر اُن کے جسموں پر بہہ آنے والی شراب کو زبان سے چاٹ رہے تھے۔

کرنل ہنتوگ نے شراب کا آخری جام پیا اور اپنی کرسی سے اٹھ گیا۔ اُس کے ساتھی میجر کیمپ میں جا چکے تھے، جہاں اُن کے لیے لڑکیوں کا انتظام ہو گیا تھا۔ وہ میڈم لوس کا انتظار کر رہا تھا جس نے اُس سے کسی نایاب تحفے کا وعدہ کیا تھا۔ کافی دیر تک وہ شراب کی بوتلیں خالی کرتا رہا' لیکن میڈم لوس نہ آئی تب اُس نے شراب کا آخری جام پیا اور کرسی سے اُٹھ کر اپنے اردلی کو آواز دی۔

اردلی فوراً اندر آ گیا۔!

"لوس کہاں ہے۔ وہ ابھی تک کیوں نہیں آئی۔؟" اُس نے غصیلے انداز میں کہا۔

"میڈم لوس آپ کا اندر انتظار کر رہی ہیں جناب۔!" اردلی نے جواب دیا اور وہ چونک پڑا۔

"اوہ۔ اچھا۔ مگر تم نے ہمیں بتایا کیوں نہیں۔" اُس نے کہا اور پُر شوق قدموں سے اندرونی حصے کی طرف چل دیا' جہاں اُس کی خواب گاہ تھی یہ خواب گاہ ایک بہت بڑا ہال تھی جسے فوری طور پر عمدگی سے آراستہ کر دیا گیا تھا۔ ریشمی' خوش رنگ پردے چاروں طرف لہرا رہے تھے۔!

"میڈم لوس۔!" اُس نے ہال کے درمیان کھڑے ہو کر آواز دی اور اچانک کمرے میں موسیقی گونج اُٹھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ریکارڈ اسی کی آمد کا منتظر تھا۔ ایک دلکش دُھن بج رہی تھی۔ پھر ایک پردہ سرکا اور میڈم لوس اندر داخل ہوئی۔ اُس کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی ادھیڑ عمر کی لوس کا جسم اب بھی فولاد کی طرح سخت اور سڈول تھا۔ اُس نے اپنے اپنے جسم کو خوبصورت بنانے کے لیے میک اپ بھی کیا تھا اور اُس کے نسوانی حصوں پر رنگین نگینوں کی لڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ موسیقی کی دُھن پر وہ

قدم اُٹھاتی ہوئی ہال میں آگئی اور ہنتوگ اُسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ اس احمق بڑھیا کو کیا ہو گیا۔؟ وہ سوچ رہا تھا۔ پھر موسیقی کے ایک لمحاتی وقفے میں مسز لوس نے تالی بجائی اور اچانک بجلی سی کوند گئی، وہ بھی ایک پردے کے پیچھے سے نکلی تھی۔ اُس کے جسم پر رنگین پٹیوں کا لباس تھا۔ چہرے اور جسم پر حسین ترین میک اپ تھا۔ قد چھ فٹ سے کسی طرح کم نہیں تھا اور جسم اسی مناسبت سے بھرا ہوا اور سڈول تھا۔ اُس نے بجلی کی طرح تڑپ کر دو تین لہریں لیں اور پھر بُت کی طرح ساکت ہو گئی۔ ہنتوگ ساکت کھڑا اس کے حسین جسم اور حسین چہرے کو دیکھ رہا تھا۔!

تب اچانک میڈم لوس نے موسیقی کا ریکارڈ بدل دیا۔ اب ایک ہنگامی موسیقی گونجنے لگی تھی اور اس موسیقی کے ساتھ ہی رقص سیماب شروع ہو گیا۔ وہ پارے کی طرح تڑپ رہی تھی اور رنگین پٹیاں اُس کے جسم سے علیحدہ ہوتی جا رہی تھیں۔ بجلی کی روشنی اُس کے جسم کی چمک کے آگے ماند پڑ گئی تھی اور ہنتوگ کی آنکھیں خیرہ ہوتی جا رہی تھیں۔!

موسیقی عروج پر پہنچ گئی۔! اور اس کے ساتھ ہی اُس کے جسم کی ایک ایک بوٹی لرزنے لگی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کا جسم موسیقی کے تاروں سے منسلک ہو۔ بلاشبہ یہ فنِ رقص کا کمال تھا! اور پھر یہ کمال عروج پر پہنچنے کے بعد تھم گیا۔ کائنات کی گردش رک گئی اور رقاصہ کا سر جھکتا چلا گیا۔! ہنتوگ کئی منٹ تک تصویرِ حیرت بنا رہا اور پھر اُس کی پُر جوش تالیاں گونج اُٹھیں۔ میڈم لوس نے سر جھکایا اور اس کے ساتھ رقاصہ بھی جھک گئی تھی۔ میڈم لوس نے آگے بڑھ کر اُس کا بازو پکڑ لیا اور پھر ہنتوگ کے نزدیک آگئی! رقاصہ کا جسم اب پٹیوں سے بے نیاز تھا اور ہنتوگ کے جسم میں آگ سلگ رہی تھی۔

"یہ پولینڈ کی سب سے نامور رقاصہ سوزیتہ ہے۔ یہاں کے ایک کلب میں رقص کی تربیت دیتی تھی اور یہی میرا تحفہ ہے۔ اس لڑکی نے میرے ساتھ تعاون کیا ہے اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ یہ جرمن زبان سے واقف ہے۔ میں اس کی سفارش کرتی ہوں۔" میڈم لوس نے کہا۔

"خوب' خوب۔ یہ خود اپنی سفارش ہے میڈم لوس۔ ٹھیک ہے شکریہ۔ تم جا سکتی ہو۔!"

میڈم لوس نے سر جھکایا اور اُلٹے قدموں باہر نکل گئی۔ ہنتوگ رقاصہ کی طرف متوجہ ہو گیا جو اُسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

"تم جرمن زبان سے واقف ہو۔؟" ہنتوگ نے پوچھا۔

"کسی حد تک۔" رقاصہ کی آواز بھی بہت اپیل رکھتی تھی۔

"رقاصہ ہونے کے علاوہ تم طوائف بھی ہوگی ۔؟" ہستوگ نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں صرف رقص کی تربیت دیتی تھی۔ عورت کی حیثیت سے یا طوائف کی حیثیت سے کوئی مرد میری زندگی میں ابھی تک داخل نہیں ہوا۔" سوریتہ نے جواب دیا اور ہستوگ خوشی سے اچھل پڑا۔

"خوب، خوب ۔" اُس نے رقاصہ کو بازوؤں میں کھینچتے ہوئے کہا۔ "یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ لیکن تم نے دوسری عورتوں کی طرح ہم سے نفرت کا اظہار نہیں کیا۔ تم میڈم لوس کے ساتھ تعاون کے لئے کس طرح تیار ہوگئیں۔ کیا موت کے خوف سے ۔؟"

"موت ۔!" سوریتہ نے تلخ ہنسی کے ساتھ کہا۔ "میں تو بار بار مرتی ہوں۔ کئی بار مر چکی ہوں۔ موت کی میری نگاہوں میں کیا اہمیت ہے۔"

"اوہ ۔ تم نے بڑی تلخ بات کہی ہے۔ کیا میں تمہارے بارے میں معلوم کر سکتا ہوں ۔!" اُس نے بازوؤں میں بھری ہوئی عورت کو جس کی عمر تیس سال سے کم نہیں تھی سینہ پر لاتے ہوئے کہا۔ وہ کھسک کر اُس کی آغوش میں لیٹ گئی۔ اُس کے حسین چہرے پر عجیب سی کیفیت تھی اور ہستوگ سوچ رہا تھا۔ بلاشبہ لوس قابلِ انعام ہے کہ اُس نے یہ حسین لڑکی اس کے لئے منتخب کی۔

"مجھے اس ملک سے نفرت تھی۔ یہاں کے باشندوں سے نفرت تھی کیونکہ انھوں نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا تھا۔ میں یہاں کے ایک شریف خاندان کی لڑکی ہوں۔ ہم غریب تھے۔ شریف تھے اور باعزت زندگی گزار رہے تھے لیکن یہاں کے لوگوں کو ہماری شرافت، ہمارا سکون پسند نہ آیا۔ میرے باپ پر قتل کا الزام لگا۔ اسے گرفتار کر لیا گیا۔ قتل کسی نے کیا سزا کسی کو ملی۔ میرے باپ کو سزائے موت ہوگئی۔ بیگناہی کی تمام تاویلیں دھری رہ گئیں اور جب وہ موت کی آغوش میں جا سویا اور ہمارا گھر اُجڑ گیا تب اصل قاتل بھی پکڑا گیا۔ حکومت نے ہم سے معذرت کی۔ ہمیں ہمارے باپ کی قیمت چکانا چاہی لیکن میرا جوان بھائی یہ بے انصافی برداشت نہ کر سکا۔ اُس نے اس جج کو قتل کر دیا جس نے میرے باپ کو موت کی سزا دی تھی۔ اور اس قتل کے الزام میں میرے بھائی کو بھی سزائے موت ہوگئی۔ اب دنیا میں میری ماں، چھوٹی بہن اور میں رہ گئی تھی۔ ہمارا سب کچھ لوٹ لیا گیا تھا۔ مجبوراً مجھے بازار میں آنا پڑا۔ میں نے باعزت روزی حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ ہر جگہ میرا جسم حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی۔ تب میں نے رقص کی تربیت لی۔ ایک ماہر رقاصہ بن کر میں خود کو جسم فروشی سے بچا سکتی تھی۔ اور یہی ہوا۔ میں نے سخت لگن اور محنت سے اِس فن کی تربیت لی اور ایک کلب میں ملازم ہوگئی۔ کلب میں ہر رات مجھے برہنہ ہونا پڑتا تھا اور لوگ میرے جسم کو دیکھ کر سسکاریاں بھرتے تھے۔ پاگل دیوانے کہیں کے ۔! میں انہیں ترساتی تھی۔ میری کوئی قیمت نہیں تھی۔ میں کسی قیمت پر اُن لوگوں کو حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ تڑپتے تھے میرے لئے آہیں بھرتے تھے اور میں خوش ہوتی تھی۔ مجھے ان سب سے نفرت تھی۔ میری خواہش تھی کہ میں ان سب کو قتل کر دوں۔ لیکن میں یہ سب کچھ نہ کر سکتی تھی۔ اور میں تمہاری شکر گزار ہوں کہ تم نے میری یہ خواہش پوری کر دی، تم یقین کرو، جس وقت جرمن طیارے میرے شہر پر بمباری کر رہے تھے اور چاروں طرف سے چیخ و پکار کی آوازیں اُبھرتی تھیں تو میری روح کو سکون ملتا تھا۔ میں خود کو کوئی جرمن ہواباز سمجھتی تھی جو اپنے دشمنوں پر بم برسا رہا ہو۔ میری ہی خواہش ہوتی تھی کہ ایک ایک بم میرے دشمنوں پر پڑے۔ پھر جب مجھے قیدی بنا لیا گیا تو مجھے کوئی افسوس نہیں تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ میں اپنوں میں جا رہی ہوں۔ یہاں میں جیسے بھی رہی مطمئن رہی۔ میں بہت خوش ہوں کرنل، میں بے پناہ خوش ہوں۔ میں اپنا سب کچھ تم پر نچھاور کر دینا چاہتی ہوں۔" اُس نے ہستوگ کی گردن میں بانہیں ڈال کر پوری قوت سے اُسے خود پر جھکایا اور اُس کے ہونٹوں میں ہونٹ پیوست کر دیئے۔

ایک طویل بوسے کے بعد ہستوگ اُس سے جدا ہوا تو پوری طرح اُس کے جال میں تھا۔ اوّل تو وہ اُس کی باتوں سے بہت متاثر تھا پھر اُس کے گرم جوش بوسے نے زیرک کرنل کو بالکل گدھا بنا دیا۔

"گویا تم جرمن نسل سے متفق ہو لڑکی ۔؟" اُس نے پوچھا۔

"پوری طرح۔ یہ سب اِس قابل ہیں کہ انھیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے ۔!"

"ایسا ہی ہوگا۔ ایسا ہی ہوگا تم دیکھتی رہو۔ تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گی بہت تھوڑے وقت میں پوری دنیا پر عظیم جرمن قوم کا تسلط ہوگا۔ اور یہ سب ہمارے زیرِ نگیں ہوں گے۔ مجھے تمہارے حالات پر بہت افسوس ہے۔ کیا تم میرے ساتھ رہنا پسند کرو گی ۔؟"

"تمہارے ساتھ زندگی گزارنا میری زندگی کا عظیم مقصد ہے، کیونکہ تم میرے محسن ہو۔ تم وہ ہو جس نے میرے دشمنوں سے انتقام لیا ہے۔ میں تمہارے حکم پر اپنی گردن کاٹ کر پیش کرنے کے لئے تیار ہوں۔" سوریتہ نے کہا اور جرمن افسر دیوانہ ہوگیا۔ اُس نے سوریتہ کے ہونٹوں کو بھنبھوڑ ڈالا اور بلاشبہ اس سے زیادہ حسین عورت اِس سے قبل اُس نے نہ دیکھی تھی۔ بلاشبہ اس سے زیادہ گرم جوش عورت اسے پہلے نہیں ملی تھی۔ اُس نے کرنل ہستوگ کی مردانگی کی شان میں قصیدے پڑھے تھے، وہ مرد کی ایک ایک کمزوری سے پوری طرح واقف تھی۔ اُس نے کرنل کی دُکھتی رگیں اپنے پنجے میں جکڑ لیں۔ اپنے جسم کی تمام رعنائیاں اُس پر نچھاور کر دیں اور کرنل لطف و مسرت سے دیوانہ ہوگیا۔

دوسری صبح سوریتہ کا مقام ہی اور تھا۔ کرنل نے اُسے اپنے

ساتھ ہی رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اُس نے رات بھر میں سورلیتہ سے بےشمار وعدے کئے تھے اور صبح ہی سے اُن کا ایفا شروع کردیا تھا۔!

رات بھر جرمن افسروں کا دل بہلانے والی عورتیں، لڑکیاں واپس کیمپ میں پہنچ گئی تھیں۔ میڈم لوس جب سورلیتہ کو لینے آئی تو اُس کی ملاقات کرنل ہستوگ سے ہوئی۔

"صبح بخیر جناب۔ کیا میرا تحفہ پسند آیا۔؟"

"بے حد۔ ہم تمہارے شکر گزار ہیں میڈم لوس۔ تم نے بہت پیاری لڑکی ہمیں دی ہے۔!"

"کیا میں اُسے واپس کیمپ میں پہنچا دوں۔؟" لوس نے پوچھا۔

"نہیں۔ وہ ہمارے ساتھ ہی رہے گی۔ تم نہیں جانتیں میڈم لوس' وہ کیا ہے۔" ہستوگ نے کہا اور لوس مسکرانے لگی۔

"میں جانتی ہوں جناب۔ خوب اچھی طرح جانتی ہوں' ورنہ اُسے آپ کے لئے منتخب نہ کرتی۔" لوس نے کہا اور واپسی کے لئے مڑی۔

"سنو۔!" کرنل ہستوگ نے اُسے پکارا اور وہ رک گئی۔ "ہم چاہتے ہیں کہ اُس کے لئے اعلیٰ لباس کا انتظام کیا جائے اور وہاں کیمپ سے دو عورتوں کو لا کر اس کی خدمت پر مامور کردیا جائے۔"

"بہت بہتر۔ ابھی سب انتظام ہوجائے گا۔!" میڈم لوس نے کہا اور مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔!

بلاشبہ سورلیتہ ایسی عورت تھی کہ انسان اُسے دیکھ کر دیوانہ ہوجائے کرنل ہستوگ اب اُسی کا دم بھرتا تھا۔ سورلیتہ ہر رات اُس کے سامنے ہیجان خیز رقص کرتی اور اسے اپنے ہاتھ سے شراب پلاتی۔ اُس کی ادائیں ایسی دلکش تھیں کہ کرنل اُس کا دیوانہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اُس نے سورلیتہ کے لئے ہر نعمت مہیا کردی تھی۔ وہ شہزادیوں کی سی شان سے وہاں رہتی تھی۔ دو خادمائیں' جو اسی کے وطن کی قیدی عورتیں تھیں اُس کے ساتھ رہتی تھیں اور اُس کی خدمت کرتی تھیں۔ ان غریب لڑکیوں کی بھی زندگی سنبھل گئی تھی۔ ورنہ ہر رات انہیں بھی جرمن سپاہیوں اور افسروں کے بستر کی زینت بننا پڑتا جیسا کہ کیمپ کی دوسری عورتوں کو کرنا پڑتا تھا۔ اب جرمن افسر سورلیتہ کو اپنے ساتھ لے کر بھی گھومتا تھا۔ اس علاقے پر مکمل کنٹرول حاصل کرنے کے بعد یہاں کے سالم حصّوں کو آباد کرلیا گیا تھا' اُن میں کلب بنائے گئے تھے' شراب خانے بنائے گئے تھے اور جرمن فوجی ان کلبوں اور شراب خانوں میں دادِ عیش دیتے تھے۔ جرمن افسر جو چھوٹے رینک کے تھے اب سورلیتہ کی بھی عزت کرتے تھے اور اُس کے احکامات کی تعمیل کرتے تھے' وہ جانتے تھے کہ وہ ہستوگ کی منظورِ نظر ہے۔ اُس کے حکم کی تعمیل نہ کرنا ہستوگ کے عتاب کو آواز دینا ہے۔

ایک شام ایک پہاڑی علاقے سے کچھ لوگوں کو گرفتار کیا گیا۔ یہ اسی علاقے کے باشندے تھے جو جان بچا کر پہاڑوں کی طرف بھاگ گئے تھے' اور وہاں بھوکے پیاسے چھپے ہوئے تھے۔ شاید وہیں بھوک اور پیاس سے مر جاتے کہ ایک جرمن فوجی دستہ ادھر جا نکلا۔ اور ان لوگوں کا موت کا انتظار ختم ہوگیا۔ جرمن انہیں ٹرکوں میں بھر کر لے آئے تھے اور اُنہیں مردوں کے کیمپ میں قید کردیا گیا۔ یہ کیمپ اب مردوں سے خالی ہوگیا تھا۔ جو فوجی قیدی کام کے قابل تھے انہیں دوسری جگہ بیگار کے لئے بھیج دیا گیا تھا اور جو کسی قابل نہیں تھے انہیں مختلف طریقوں سے قتل کردیا گیا تھا۔ بہرحال خالی کیمپ پھر آباد ہوگیا تھا اور وہاں بھوکے ہوئے لوگ ہر لمحے موت کے منتظر تھے۔ خوف و دہشت' بھوک پیاس سے مختلف کیفیات کے حامل چہرے۔ پچکے گال۔ پھٹی پھٹی آنکھیں زندگی کے بوجھ سے بیزار۔ اِن چہروں کو دیکھ کر خوف محسوس ہوتا تھا۔

ہستوگ نے ان قیدیوں کو دیکھا اور اُس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ ذہن ہی ذہن میں کوئی دلچسپ منظر تشکیل دینے لگا۔ اور پھر اُس کی جیپ اپنی رہائش گاہ کی طرف چل پڑی۔ سورلیتہ نے سولہ سنگھار کئے ہوئے دلنشیں مسکراہٹ سے اُس کا استقبال کیا۔ اور ہستوگ نے اس کے ہونٹ چوم لیئے۔

"میں نے تمہارے لئے ایک دلچسپ تماشے کا بندوبست کیا ہے۔" ہستوگ ہنسنے لگا۔

"وہ کیا۔؟" سورلیتہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ لوگ ہمیں جُل دے کر یہاں سے نکل گئے تھے اور پہاڑوں میں چھپ گئے تھے۔ انھیں گرفتار کرکے لایا گیا ہے اور میرا خیال ہے میں انھیں زندگی کے بوجھ سے جلد نجات دلا دوں۔ سب اسی علاقے کے باشندے ہیں۔ ممکن ہے ان میں تمہارے کچھ دشمن بھی ہوں۔ چنانچہ اُن کا کھیل تمہارے سامنے ہی ہوگا۔ کیا تم اسے دیکھنا پسند کروگی۔؟"

"ضرور۔" سورلیتہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ لیکن اُس کی مسکراہٹ میں زندگی نہیں تھی۔ صرف ایک لمحے کے لئے یہ کیفیت رہی اور اس کے بعد اُس نے فوری طور پر خود کو بدل لیا۔ ہستوگ اس میں اتنا گم ہوگیا تھا کہ اب وہ سورلیتہ کی کسی بات پر شک نہیں کرسکتا تھا۔ سورلیتہ نے اُسے پوری طرح اپنے جال میں پھانس لیا' اور ابھی تک ایسی کوئی بات بھی نہیں ہوئی تھی جس سے سورلیتہ پر کسی قسم کا شبہ کیا جاسکتا۔ وہ صرف ہستوگ میں مگن تھی۔!

سورج چھپے ہستوگ اپنی رہائش گاہ سے نکلا۔ سورلیتہ اُس کی جیپ میں اُس کے ساتھ تھی۔ چند موٹر سائیکل سوار جوان اُن کے ساتھ

بولو۔ کیا تم اپنے بھائیوں اپنے بچوں اور اپنے باپوں کا انتقام نہیں لوگی۔ جواب دو۔!" سورلیتہ نے روتے ہوئے کہا اور تمام لڑکیوں کے جسم کانپنے لگے۔

"ہمیں معاف کردو سورلیتہ۔ ہمیں معاف کردو۔" اُن میں سے کئی لرزتی ہوئی آواز میں بولیں اور اُس سے لپٹ گئیں۔

"میں نے تم سب کو معاف کردیا۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے موت ہمارا مقدّر ہے۔ لیکن ہم ایسی موت مرنا چاہتے ہیں کہ یہ جرمن قوم رہتی دُنیا تک یاد رکھے۔ بولو کیا تم میری مدد کرنے کو تیار ہو۔ کیا تم اپنی قوم کا انتقام لینے کے لئے تیار ہو۔؟"

"ہم سب تیار ہیں۔ تمہارے اشارے پر ہم زندگی دیدیں گے۔!"

"شکریہ میری بہنو۔ میرے مشوروں پر عمل کرتی رہو۔ میرا پروگرام طویل ہے۔ لیکن اگر میری مرضی کے مطابق ہی کام ہوگیا تو پھر تم سب دیکھو گی کہ جرمنوں کا کیا حشر ہوتا ہے۔ ہمیں ایک خوبصورت رقص پیش کرنا ہے۔ میں ہستوگ کو اپنی مٹھی میں لے لینا چاہتی ہوں تاکہ ہمارے کام میں آسانی ہو۔"

"تم جو کہوگی۔ ہم وہی کریں گے۔" لڑکیوں نے کہا اور اُس دن سے اُن کا انداز بدل گیا۔ اب وہ بڑے احترام سے سورلیتہ کو دیکھتی تھیں دل سے اُس کے احکامات پر عمل کرتی تھیں اور بالآخر وہ دن آگیا جب ہستوگ کی سالگرہ تھی۔!

سالگرہ کی تقریب ایک کلب کے لمبے چوڑے ہال میں ترتیب دی گئی تھی۔ ہال کو نہایت خوبصورتی سے سجادیا گیا تھا۔ بیشمار مہمان مدعو تھے، ہستوگ نے خاص طور سے سورلیتہ کو دعوت دی تھی اور سورلیتہ ایک حسین لباس میں اُس کے ساتھ تھی۔ میڈم لوس کو اُس نے پہلے سے تمام کام سمجھادیئے تھے اور اُس نے رقص کی تیاریاں مکمل کرلی تھیں۔ سالگرہ کی تقریب شروع ہوئی۔ کیک کاٹا گیا۔ اور ہستوگ نے سورلیتہ کا ایک طویل بوسہ لیا۔ شراب کے دور چلنے لگے اور ایک جرمن گویا گیت گانے لگا۔ آرکسٹرا کی مدھم دھنوں پر اُس کا گیت بہت دلکش تھا۔ سورلیتہ نے ہستوگ سے چند منٹ کی اجازت طلب کی اور وہ وہاں سے اُٹھ کر کلب کے اُس حصّے میں پہنچ گئی جہاں میڈم لوس نے تمام لڑکیوں کو حسین لباس پہنا کر تیار کردیا تھا۔ سورلیتہ نے خود بھی رقص کا لباس تبدیل کیا اور پھر پوری طرح تیار ہوگئی۔!

جرمن گوّیئے کا گیت ختم ہوگیا تھا۔ شراب کی ٹرالیاں گردش کر رہی تھیں کہ اچانک پورے ہال میں تاریکی پھیل گئی اور ہستوگ چونک پڑا۔ لیکن پھر کسی طرف سے ایک روشنی اُبھری اور روشنی کی شعاع ایک جسم پر پڑی، جو ستارے کی طرح چمک رہا تھا۔ ہستوگ اور دوسرے لوگ چونک کر اس جسم کو دیکھنے لگے۔ روشنی کی دوسری لکیر ایک دوسرے ستارے پر پڑی اور بہت سی لکیریں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتی ہوئی خوبصورت اجسام کو نمایاں کرنے لگیں۔

اِس کے بعد ایک انتہائی تیز روشنی ایک انتہائی حسین جسم پر پڑی جو رنگین نگینوں سے سجا ہوا تھا، اور یہ جسم سانپ کی طرح انگڑائیاں لینے لگا۔ پھر آرکسٹرا کی مدھم اور پُراسرار دھن گونجی اور ستارے رقص کرنے لگے رنگین نگینوں سے سجا ہوا جسم بل کھانے لگا۔ اور ہستوگ پہچان گیا۔ وہ سورلیتہ تھی، اُس کی محبوبہ۔! وہ حیرت و دلچسپی سے یہ رقص دیکھ رہا تھا جس کے بارے میں اُسے کوئی علم نہیں تھا۔!

تاریکی میں ستارے ناچتے رہے۔ بڑا دلکش سماں تھا۔ سب حیرت سے بُت بنے ہوئے دنیا کا حسین ترین رقص دیکھ رہے تھے۔ آرکسٹرا کی دھنیں تیز ہوتی گئیں اور رقص میں تیزی آتی گئی اور پھر وہ کلائمکس پر پہنچ گیا تب اچانک روشنی ہوگئی۔ لڑکیاں بے حد حسین رقص پیش کر رہی تھیں اور اُن کے درمیان سورلیتہ شعلہ جوالا بنی ناچ رہی تھی۔ پھر رقص ختم ہوگیا۔ اور تمام لوگوں کی پُرجوش تالیاں گونج اٹھیں۔!

ہستوگ اپنی جگہ سے اُٹھ کر سورلیتہ کی طرف بڑھا اور اُس کے قریب پہنچ کر اُس کی کمر میں دونوں ہاتھ ڈال دیئے۔ "یہ سب کیا تھا سورلیتہ ڈارلنگ۔ یہ سب۔۔۔"

"محبوب کی خدمت میں اُس کی سالگرہ کا تحفہ۔!" سورلیتہ نے مخمور لہجے میں جواب دیا۔

"اوہ۔ سویٹ سورلیتہ، تم مجھ سے اِس قدر محبّت کرتی ہو، مگر یہ دوسری لڑکیاں کون ہیں اور تم نے یہ سب کچھ انتظام کیسے کرلیا۔؟" ہستوگ نے حیرت سے پوچھا۔

"اس سلسلے میں میری پوری پوری مدد میڈم لوس نے کی ہے۔" سورلیتہ نے قریب ہی کھڑی ہوئی میڈم لوس کی طرف اشارہ کرکے کہا جو اُن کی باتیں سُن رہی تھی۔

"شکریہ میڈم لوس۔ آپ نے ہماری برتھ ڈے میں اتنی دلچسپی سے حصّہ لیا، ہم اس کے شکرگزار ہیں، اور سورلیتہ۔ تمہارا تو ہم شکریہ بھی ادا نہیں کرسکتے۔" ہستوگ سورلیتہ کو سینے سے لگائے اپنی کرسی کی طرف بڑھ گیا۔ چاروں طرف سے تالیاں گونج رہی تھیں۔

"کاش میں اپنے محبوب کو کوئی قیمتی تحفہ پیش کرسکتی یہاں میرے پاس اِس کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔" سورلیتہ نے اداسی سے کہا۔

"اوہ۔ سورلیتہ ڈیر۔ اِس سے قیمتی تحفہ اور ہو بھی کیا سکتا تھا دیکھو سب تمہاری تعریف میں ابھی تک تالیاں بجارہے ہیں۔ اور پھر تمہیں کس چیز کی کمی ہے۔ سب تمہارے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ تمہارے ایک

اشارے پر وہ زر و جواہر کے انبار لگا دینگے۔ میں سب کو خصوصی حکم دے دونگا کہ تم جو کچھ بھی طلب کرو، فوراً تمہیں مہیا کیا جائے۔"

"شکریہ کرنل۔ مجھے میری محنت کا صلہ مل گیا۔ اِن لڑکیوں کو رقص کی تربیت میں نے ہی دی ہے۔ تمہیں رقص پسند آیا مجھے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہیئے۔ ہاں میری ایک درخواست ضرور ہے۔"

"کہو ڈارلنگ۔؟"

"اِن تربیت یافتہ لڑکیوں کو کیمپ سے الگ رکھا جائے۔ تاکہ میں جرمن فتوحات کے ہر جشن میں عمدہ سے عمدہ پروگرام پیش کرسکوں۔"

"اوہ۔ ضرور ضرور۔ تم بہت عظیم ہو سوریستہ ڈارلنگ۔ بیشک جرمن فتوحات پر جتنے جشن بھی کیئے جائیں کم ہیں۔ ہم تمہارے کہنے کے مطابق اُن کا بہترین بندوبست کردیں گے۔" اِس طرح سوریستہ نے لڑکیوں کے لیئے تحفظ حاصل کرلیا۔ ابھی وہ آہستگی سے کام کر رہی تھی۔ اِس کے سامنے دوسری لڑکیوں کا مسئلہ بھی تھا۔!

لیکن فی الوقت یہی بارہ لڑکیاں اُس کے اعتماد میں تھیں۔ لڑکیوں کو وہی مکان دے دیا گیا جس میں انھیں تربیت دی گئی تھی۔ اِس طرح وہ جرمن سپاہیوں اور افسروں سے بھی محفوظ ہوگئیں۔ بظاہر سوریستہ انھیں رقص کی تربیت دیتی، لیکن یہ بات ان بارہ لڑکیوں کے علاوہ اور کسی کو معلوم نہ تھی کہ سوریستہ ان کے لیئے کمانڈر کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ اور رقص کی آڑ میں ایک جامع پروگرام بن رہا تھا!۔۔۔

وہ ایک تاریک رات تھی جب چار جرمن سپاہی اُس مکان کے سامنے سے گزر رہے تھے جس میں رقاص لڑکیاں رہتی تھیں۔ اُن کی جیپ میں اسلحے کی پیٹیاں لدی ہوئی تھیں۔ ایک سپاہی کی نگاہ اس تیز روشنی کی طرف اُٹھ گئی جو ایک بڑی کھڑکی سے آرہی تھی۔ اور روشنی میں انھیں ایک چمکدار جسم نظر آیا، جو لباس سے بے نیاز تھا۔ وہ ایک حسین لڑکی تھی جو بڑے ہیجان خیز انداز میں کھڑی تھی۔ جیپ ڈرائیو کرنے والے نے جیپ روک دی اور دوسرے سپاہیوں کو اس طرف متوجہ کیا۔ سب لوگ دلچسپی سے یہ منظر دیکھنے لگے اِس کے بعد ایک دوسری لڑکی بھی کھڑکی میں آگئی اور پھر تیسری اور چوتھی بھی۔ وہ سب ایک دوسرے سے لپٹ رہی تھیں، بوس وکنار کر رہی تھیں اور سپاہیوں کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی تھی۔

پھر لڑکیوں کی نگاہ اُن پر پڑ گئی اور وہ اشارے سے اُنھیں اندر بلانے لگیں۔ سپاہیوں کو اور کیا چاہیئے تھا۔ چاروں جیپ سے نیچے کود گئے اور مکان کی طرف دوڑے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر داخل ہوگئے اور برہنہ لڑکیوں نے ان کا استقبال کیا۔ انہوں نے سپاہیوں کی گردنوں میں ہاتھ ڈال دیئے اور سپاہی اُن کے ہونٹوں سے چپک گئے۔ پھر انہوں نے لڑکیوں کو گود میں اُٹھایا اور اندر داخل ہوگئے۔

اُن کے اندر داخل ہوتے ہی مکان کے ایک پوشیدہ حصّے سے چند لڑکیاں نکل کر ان کی جیپ کے قریب پہنچ گئیں اور ایک مخصوص قسم کے نشان کی پیٹی تلاش کرنے لگیں جو انہیں ذہن نشین کرا دیا گیا تھا۔ انہوں نے اس نشان کی پیٹی جیپ سے اتار لی اور اُسے لے کر اندر داخل ہوگئیں۔!

تقریباً پون گھنٹے بعد گزرے ہوئے لمحات سے سرشار سپاہی باہر نکلے اور جیپ میں بیٹھ کر چل پڑے۔ لڑکیوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ہوائی بوسے اُچھالے اور سپاہی مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ انہیں کسی چیز کے گُم ہونے کا کوئی احساس نہیں تھا۔ کسی کو پتہ نہ چل سکا کہ اسلحے سے کوئی چیز گم ہوگئی ہے۔!

اور اس کے بعد یہی ہونے لگا۔ جو سپاہی اسلحے سے لیس ہوکر گزرتے تھے لڑکیاں اُن کے ساتھ کمال محبت سے پیش آتی تھیں جبکہ دوسرے سپاہیوں کو کوئی لفٹ نہیں ملتی تھی۔ مکان کے ایک خفیہ حصّے میں جو خاص طور سے تیار کیا گیا تھا۔ مخصوص قسم کے بموں کا خاصا ذخیرہ جمع ہوگیا تھا۔ اُس کی سخت حفاظت کی جاتی تھی اور جب ضرورت پوری ہوگئی تو یہ کام ترک کردیا گیا۔

سپاہی اب بھی اُس مکان کے سامنے سے گزرتے تھے لیکن اب لڑکیوں کی طرف سے لفٹ نہیں ملتی تھی خود اُن کی اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ مکان میں داخل ہوسکتے۔ جانتے تھے کہ یہ سوریستہ کی لڑکیاں ہیں۔!

تقریباً ایک ماہ کے بعد اچانک فوجیوں میں ایک خاص ڈسپلن پیدا ہوگیا۔ جگہ جگہ صفائی کی جانے لگی۔ وردیاں صاف ہونے لگیں اور جرمن فوجیں بہت چاق وچوبند نظر آنے لگیں۔ کرنل ستوگ بھی بے حد مصروف رہنے لگا۔ ایک دن رات گئے جب وہ واپس آیا تو سوریستہ نے محبت سے اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔

"کیا بات ہے ڈارلنگ۔ تم آج کل کچھ پریشان ہو مجھے نہیں بتاؤگے۔؟"

"اوہ۔ پریشان نہیں ڈیئر۔ مصروف ہوں۔ جنرل ٹیرمن، جنرل ہوتین اور دوسرے بڑے آفیسر اس علاقے کا دورہ کرنے آرہے ہیں۔ میں اُن کے لیئے انتظامات میں مصروف ہوں۔ اس کے علاوہ ایک دقت اور بھی ہے۔"

"وہ کیا۔؟"

"اُن کی موجودگی میں تمہارا میرے پاس رہنا خطرناک بھی ہوسکتا ہے

تمہیں کچھ عرصے کے لئے یہاں سے الگ ہٹنا ہوگا۔ میں سوچتا ہوں کہیں تم اس سلسلے میں بُرا نہ مانو۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو ڈارلنگ۔ کیا میں تمہاری پریشانی سے خوش ہوں گی۔ میں تم جہاں کہو جانے کے لئے تیار ہوں۔ اس کے علاوہ میرے ذہن میں ایک اور ترکیب بھی ہے۔"

"وہ کیا۔؟"

"کیوں نہ ہم جنرلوں کے اعزاز میں ایک تقریب ترتیب دیں اور میں اس میں ایک ایسا رقص پیش کروں جو اس سے قبل دیکھا گیا ہو اور نہ سُنا گیا ہو۔" سورلیتہ نے کہا اور ہستوگ سوچ میں گم ہوگیا۔ پھر اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"درحقیقت یہ بات میرے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ اگر رقص ان لوگوں کو پسند آگیا تو لطف آجائے گا۔ اور ڈارلنگ اگر تم میری مدد کرو تو میرا عہدہ بھی بڑھ سکتا ہے۔" ہستوگ نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

"میں تمہارے لئے زندگی قربان کرنے کو تیار ہوں۔"

"جنرل ٹیرمین بے حد عیاش آدمی ہے۔ اگر کسی عورت سے وہ خوش ہوجائے تو عورت جو طلب کرے وہ اُسے بخش دیتا ہے۔ تم اُسے خوش کرنے کی کوشش کرنا اور میرے لئے ترقی کی درخواست کردینا۔"

"میرا وعدہ ہے۔ میں اُسے اِس طرح شیشے میں اتاروں گی کہ تم حیران رہ جاؤ گے۔ لیکن اس کے لئے مجھے تربیت دینا ہوگی۔ کیا مجھے رقص کی تربیت کی اجازت ہے۔؟"

"بالکل۔ اِس کے علاوہ تمہیں جو سہولتیں درکار ہوں مل جائیں گی۔"

"بس تو تم میرے لئے آسانیاں فراہم کردو۔ تمہارا عہدہ بڑھوانے کی ذمہ داری میری ہے۔!" سورلیتہ نے کہا اور کرنل نے محبت سے اُسے آغوش میں دبالیا۔! دوسرے دن اُس نے افسروں کو ہدایت کردی کہ سورلیتہ کے کسی کام میں مداخلت نہ کی جائے اور سب سے پہلا کام سورلیتہ نے جو کیا وہ یہ تھا کہ کیمپ سے تمام عورتوں کو نکلوا کر اس مکان میں بلوالیا جہاں وہ خود رہتی تھی۔!

قیدی عورتوں کی حالت سخت خراب تھی۔ اُن میں کچھ شدید بیماریوں کا شکار ہوگئی تھیں۔ کچھ قریب المرگ تھیں۔ جنسی دیوانوں نے اُن کے ساتھ بڑی انسانیت سوز حرکتیں کی تھیں۔ سورلیتہ کے حکم سے جرمن ڈاکٹر ان عورتوں کا بہترین علاج کرنے لگے۔ اُنہیں ہر آسانی فراہم کی گئی۔ قیدی عورتیں سخت حیران تھیں وہ سورلیتہ کی شکر گزار بھی تھیں کہ اُس نے اُنہیں اس جہنم سے نکال لیا تھا۔ پھر ایک ہفتے کے بعد ایک رات عورتوں کے مکان کے ایک بڑے ہال میں ایک خاص میٹنگ منعقد کی گئی۔ پُرانی عورتیں باقاعدہ مکان کے قرب وجوار میں پہرہ دے رہی تھیں۔ جب تمام عورتیں یکجا ہوگئیں تو سورلیتہ نے انہیں مخاطب کیا

"بدنصیب قوم کی بدنصیب عورتو۔ کیا تم اسی لئے پیدا ہوئی تھیں کہ جرمن کتوں کی ہوس کا نشانہ بنتی رہو۔ کیا تمہیں معلوم ہے تمہارا انجام کیا ہوگا۔ تمہارا، میرا، ہم سب کا ایک ہی انجام ہے۔ جرمن درندے جب تک ہمارے جسموں میں جان ہے ان سے حظ اُٹھاتے رہیں گے اور جب ہم ناکارہ ہوجائیں گے تو یا تو ہمیں کسی گڑھے میں زندہ دفن کردیا جائے گا یا ہمارے جسموں پر آتشی سفوف چھڑک کر ہمیں موت کی نیند سلادیں گے۔ کیا تمہیں اِس بات کا احساس ہے۔؟" اُس نے سوالیہ نگاہوں سے عورتوں کی طرف دیکھا، سب کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔

"کیا تمہیں یہ موت پسند ہے۔؟"

"لیکن ہم بے بس ہیں۔ ہم کیا کرسکتے ہیں۔؟" عورتیں بے بسی سے بولیں۔

"انسان جب تک زندہ ہے، بے بس نہیں ہے۔ اُسے جدوجہد کرتے رہنا چاہیئے۔ موت ہمارا مقدر ہے۔ لیکن ہم وہ موت کیوں نہ حاصل کریں جو ہماری پسندیدہ ہو۔!"

"ہمیں بتاؤ۔ ہم کیا کریں۔؟" عورتوں نے بیک وقت کہا۔

"میں تمہاری مدد کروگی۔ میں اپنی مدد کروں گی۔ ہم ایسی موت مریں گے جو ان جرمن بھیڑیوں کے لئے عبرت بن جائے۔ ہم تنہا نہیں مریں گے بلکہ بہت سے درندوں کو ہمارے ساتھ ختم ہونا پڑے گا۔ ہم اپنے ہاتھوں سے خودکشی کریں گے۔ بولو۔ تم میں سے جو میرا ساتھ دینا چاہے تیار ہوجائے۔ اور جس میں یہ ہمت نہ ہو۔ جو جرمن سپاہیوں کے ہاتھوں مرنا پسند کرے میں اسے بھی نہ روکوں گی۔!"

اور سب عورتوں نے جوش کے عالم میں ہاتھ بلند کردیئے۔

"ہم اپنی پسند کی موت مریں گے۔ ہم تمہارے کہنے پر عمل کریں گے۔"

"تو پھر تیار ہوجاؤ۔ میرا ساتھ دو۔ میں تمہیں ایک باعزت موت دوں گی۔ ایسی موت جو تاریخ میں ہمارا نام روشن رکھے گی۔" اور اس کے بعد یہ میٹنگ برخاست ہوگئی۔!

پندرہ دن کے بعد جرمن ٹرک، جیپیں، ٹینک اور دوسرے سامان کے جلو میں جنرل ٹیرمین، جنرل ہورین اور دوسرے فاتح پولینڈ میں داخل ہوئے کرنل ہستوگ نے اپنی فوج کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور دونوں جنرلوں نے اسے اِس شاندار کامیابی پر مبارکباد دے کر اعزازات سے نوازا۔ کرنل ہستوگ انہیں احترام کے ساتھ اس عمارت میں لے آیا جو خاص طور سے اُن کے قیام

کے لئے آراستہ کی گئی تھی۔ پورے دو دن تک کرنل ان کو اپنے کارناموں کی تفصیلات بتاتا اور دکھاتا رہا۔ تباہ شدہ شہر۔ زندہ قیدیوں کی قبریں اور انہیں قتل کرنے کے طریقے بتاتا رہا اور جنرل اس کی اعلیٰ صلاحیتوں کی داد دیتے رہے۔ اور تیسرے دن وہ ان تمام کاموں سے فارغ ہو گیا۔ اُس رات اس نے جنرلوں کی آمد کا جشن منانے کا اعلان کر دیا۔ تمام افسروں کو دعوت دیدی گئی۔ اور پھر وہ سورلیتہ سے ملا۔

"کیا تم نے انتظامات کر لیئے ہیں ڈارلنگ۔؟"

"تم فکر نہ کرو۔ میرا کام مکمل ہے۔ آج رات میں ایسا رقص پیش کروں گی کہ رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے۔ میرے رقص کا نام ہوگا "رقصِ آتش" اور بلاشبہ کرنل ہنتوگ تمہارے جنرلوں نے ایسا رقص کبھی نہ دیکھا ہوگا اور نہ آئندہ دیکھ سکیں گے۔"

"خوب، خوب، اور تمہیں اپنا وعدہ بھی یاد ہے نا۔؟" کرنل ہنتوگ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے سب کچھ یاد ہے۔" سورلیتہ نے ایک پُراسرار مسکراہٹ سے کہا اور کرنل مطمئن ہو کر چلا گیا۔

تقریب کی ضیافت کا انتظام ایک بہت بڑے ہال میں کیا گیا تھا، جہاں دونوں جنرل اور تقریباً تین سو بڑے بڑے آفیسر موجود تھے۔ ہال کے چاروں طرف کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے۔ کھانے سے پہلے اور بعد میں شراب کا دور چلا۔ اور شراب کے دوران ہی رقص کا اعلان ہوا۔ میزبان کرنل ہنتوگ نے جنرل ٹیرمین کو بتایا کہ اُس نے جنرل کے لئے ایک معیاری رقص کا بندوبست کیا ہے۔ یہ رقاصائیں پولینڈ کی باشندہ ہیں، لیکن حیرت انگیز طور پر ہٹلر کی وفادار ہیں۔ وہ نازی ازم کی پوجا کرتی ہیں۔ رقصِ آتش اُن کا قومی رقص ہے جسے انہوں نے خاص طور سے جنرل ٹیرمین اور جنرل ہوربن کے اعزاز میں ترتیب دیا ہے۔! جنرل ٹیرمین نے خوش ہو کر اپنی موٹی گردن ہلائی تھی۔

اور پھر آرکسٹرا نے دھنیں بدل دیں اور ہال کا ایک دروازہ کھل گیا۔ اس دروازے سے زرق برق لبادوں میں ملبوس سجی ہوئی حسین رقاصائیں نکلنے لگیں۔ اُن کے ہاتھوں میں جلتی ہوئی شمعیں تھیں۔ تقریباً تین سو رقاصاؤں کے ہال میں داخل ہونے سے ہال کھچا کھچ بھر گیا۔ اور پھر انہوں نے ایک دلکش رقص شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ روشنیاں گل ہونا شروع ہو گئیں۔ اور اب ہال میں رقاصاؤں کے ہاتھوں میں جلتی ہوئی شمعوں کی روشنی کے علاوہ اور کوئی روشنی نہیں تھی۔ شمعیں گردش کرتی رہیں اور آرکسٹرا دھنیں بدلتا رہا۔ پھر رقاصاؤں نے ایک گیت شروع کر دیا۔ دھیمی آواز کا یہ گیت رزمیہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ لوگ اس کے الفاظ تو نہ سمجھ پا رہے تھے لیکن ایک عجیب سا سحر اُن پر طاری ہو گیا تھا۔!

پھر اچانک شمعیں رک گئیں اور اس کے بعد وہ گل ہو گئیں، لیکن اب رقاصاؤں کے جسموں سے پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ اُن کے جسم سے بندھے ہوئے فلیتے جل رہے تھے اور اس خوبصورت منظر پر جنرل عش عش کر اُٹھے۔ درحقیقت یہ رقصِ آتش تھا۔ فلیتے جلتے رہے، حالانکہ ان کی چنگاریاں رقاصاؤں کے لباس بھی جلا رہی تھیں، لیکن وہ بے خودی سے رقص کر رہی تھیں اور اچانک ایک خوفناک دھماکہ ہوا اور ہال میں تیز روشنی پھیل گئی۔ ایک رقاصہ کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ اُس کے جسم کے اندر لبادے کے نیچے بندھے ہوئے بموں نے آگ پکڑ لی تھی۔ یہ رقاصہ آرکسٹرا کے نزدیک تھی اس لیئے پورا آرکسٹرا اڑ گیا۔ اور موسیقی بند ہو گئی۔!

لیکن اب بموں کی موسیقی شروع ہو گئی۔ خوفناک دھماکے گونجنے لگے! اور ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ ان رقاصاؤں کے جسم کے ٹکڑے ہال کی دیواروں سے چپک رہے تھے۔ خوفناک دھماکوں سے پہلے ہال کی چھت اُڑی، پھر دیواریں ریزہ ریزہ ہو گئیں۔ جنرل ٹیرمین کی ایک ٹانگ ایک روشندان میں گھس گئی تھی۔ ہنتوگ کا جسم قیمہ قیمہ ہو گیا تھا، پورے ہال میں بھگدڑ مچ گئی۔ لیکن چند ساعت کے بعد ہال رہا نہ مہمان، اب وہاں ملبے کا عظیم ڈھیر تھا۔ باہر کھڑے انتظامی سپاہی بھی موت کا شکار ہو گئے تھے۔ اور جو دور تھے وہ اور دور بھاگ گئے تھے۔ عمارت کے ملبے سے اب دھواں اور آگ بلند ہو رہی تھی۔ تقریب کا شریک ایک ایک مہمان کتے کی موت مر گیا تھا۔ اور اس طرح جرمن فوجوں کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا تھا۔ اُس کے بے شمار تجربہ کار افسر دو جنرل، کرنل، بریگیڈیر اور بہت سے لوگ مارے گئے تھے۔!

اور سورلیتہ کا عظیم منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تھا۔ اس نے اپنی پسند کی موت منتخب کر کے جرمن درندوں کو شدید زک دی تھی۔!

نیشنل

ایئرلائنز کی فلائیٹ نمبر ۲۰۷ ایمسٹرڈم سے نیض آباد کے لیے رواں دواں تھی۔ بیروت کے ہوائی اڈے سے طیارے کو پرواز کئے دو گھنٹے سے زیادہ گزر چکے تھے اور نیض آباد کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں رہ گیا تھا۔ ایمسٹرڈم سے روانہ ہوتے وقت بھی تمام نشستیں پر نہیں تھیں۔ بیروت پر غیر ملکیوں کی بیشتر تعداد اتر جانے کی وجہ سے طیارہ نصف سے زیادہ خالی ہو گیا تھا۔ اکبر ایک درمیانی سیٹ پر کھڑکی کے قریب بیٹھا باہر کے منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کے آگے پیچھے کی سیٹوں پر اکا دکا مسافر باقی رہ گئے تھے۔ اگلی سیٹ پر بیروت سے ایک ملکی مسافر سوار ہوا تھا اور جب سے طیارے میں قدم رکھا تھا مسلسل شراب پیے جا رہا تھا۔ اکبر کو اندیشہ تھا کہ اگر اس کی مے نوشی اسی انداز میں جاری رہی تو فیض آباد پر اسے اسٹریچر پہ ڈال کر ہی اتارا جا سکے گا۔

جھگڑے کی آواز سن کر اکبر نے کھڑکی سے رخ پھیرا تو دیکھا کہ وہی مسافر ایئر ہوسٹس قدسیہ سے مزید شراب طلب کر رہا ہے اور قدسیہ اس کی

سرورق کی پہلی کہانی

*

اثر نعمانی

حالت کے پیشِ نظر خوش اسلوبی سے ٹالنا چاہ رہی ہے۔ اکبر قدسیہ سے واقف تھا۔ اکثر بیرونی پروازوں کے دوران وہ اِس گندمی رنگت اور تیکھے نقوش والی ایئرہوسٹس سے مل چکا تھا اور ایک حد تک اُسے پسند بھی کرتا تھا۔

"ہم رقم دینے کو تیار ہے تو تم شراب لاکر کیوں نہیں دیتا" اس آدمی نے جھومتے ہوئے کہا۔

"آپ پہلے ہی بہت زیادہ پی چکے ہیں" قدسیہ نے نرمی سے جواب دیا۔ "فرمائیں تو کافی لادوں۔؟"

"اچھا تو پھر ہم تمہاری آنکھوں کی شراب پئے گا۔" آدمی نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اس طرح جھٹکا دیا کہ قدسیہ اُس کی گود میں جاگری۔

اس شخص نے اُسے پیار کرنے کی کوشش کی' قدسیہ نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر اُس کے طاقتور بازوؤں میں بے بس سی ہوکر رہ گئی۔ اتنی دیر میں کچھ اور مسافر بھی متوجہ ہوچکے تھے۔ اگلی سیٹ سے ایک نوجوان تاؤ کھاتے ہوئے اٹھا اور اُس شخص کے قریب آکر سخت لہجے میں بولا۔

"اسے چھوڑدو۔"

"ہم نہیں چھوڑے گا تو تم کیا کرلے گا بڈی خان" اس شخص نے سر اٹھا کر اپنی سرخ آنکھوں سے نوجوان کو گھورتے ہوئے کہا۔ قدسیہ ابھی تک اُس کے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔

"یہ" نوجوان نے جواب دیا اور اُس کے ساتھ ہی اُس نے ڈھیلے ہاتھ سے ایک زبردست تھپڑ اس شخص کے منہ پر جڑ دیا۔

تھپڑ خاصا زوردار تھا۔ اُس آدمی کا منہ پھر گیا۔ دوسرے لمحہ اُس نے ایک ہاتھ اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے قدسیہ کو زور سے دھکا دیا اور خود سیٹ سے کھڑا ہوگیا۔ بایاں ہاتھ جیب سے باہر آیا تو اُس میں لمبے پھل کا چاقو دبا ہوا تھا۔ قدسیہ گرتے ہی سنبھل کر اٹھی اور تیزی سے پائلٹ کے کیبن کی طرف روانہ ہوئی جہاں مسلح گارڈ موجود رہتا تھا۔

مداخلت کرنے والے نوجوان نے چاقو دیکھا تو پینترا بدل کر پیچھے ہٹ گیا۔ اکبر جو قدسیہ کو بچانے کے لئے اٹھا تھا اور نوجوان کو دیکھ کر رک گیا تھا آگے بڑھا۔ کچھ اور لوگ جو بیچ بچاؤ کرنے آئے تھے چاقو دیکھ کر ٹھٹھک کر وہیں رک گئے۔ اُس شخص نے تیزی سے قدم بڑھا کر نوجوان پر چاقو سے وار کیا۔ نوجوان پھرتی سے پیچھے ہٹا مگر ہٹتے ہٹتے بھی وہ خود کو پوری طرح زد سے نہیں بچا سکا اور تیز دھار پھل دائیں کندھے سے کچھ نیچے سینے میں اتر گیا۔ نوجوان کے منہ سے ایک دبی ہوئی چیخ نکلی اور وہ سینہ پکڑے دوسری طرف الٹ گیا۔

مگر اتنی دیر میں اکبر اُس شخص کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ آہٹ پر وہ تیزی سے گھوما۔ اکبر جست لگا چکا تھا۔ اُس شخص نے چاقو سامنے کر دیا۔ قریب تھا کہ چاقو کی نوک اکبر کے پیٹ میں اتر جاتی کہ اس نے پہلو بچاتے ہو

اپنا سیدھا ہاتھ چاقو کے دستے پر ڈال دیا۔ خوش قسمتی سے نشانہ درست پڑا اور اکبر نے پوری طاقت سے اس شخص کا ہاتھ پکڑ کر اُسے موڑنے کی کوشش کی تاکہ چاقو چھین سکے۔ اس کا دوسرا ہاتھ دشمن کے سیدھے ہاتھ سے اُلجھا ہوا تھا۔ اکبر کا قد بھی اُس شخص سے بہت کم تھا اور جسم بھی اس کے مقابلے میں کمزور اور نازک نظر آتا تھا لیکن اِس وقت اُس کی انگلیوں میں بلا کی قوت آگئی تھی۔ وہ اِس حد تک اُس کا ہاتھ موڑنے میں کامیاب ہوگیا کہ چاقو کی نوک اُس شخص کی طرف گھوم گئی۔

اور تب اچانک ہی طیارے نے نیچے اُترنا شروع کر دیا۔ اس شخص کی پشت طیارے کے انجن کی جانب تھی۔ ڈھلان ہونے ہی اُس کا پیر پھسلا اور وہ پیٹھ کے بل نیچے گرا۔ اکبر اُس کے اوپر تھا۔ نتیجے میں چاقو اُس شخص کے سینے میں دستے تک اندر گھس گیا۔ اُس کے منہ سے ایک کربناک چیخ نکلی اور ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ اکبر جلدی سے اُسے چھوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ طیارے کا مسلح گارڈ اپنی برین گن سنبھالے تیزی سے قریب آرہا تھا۔!

★

جبران کیفے گلزار کی جانب گھوم ہی رہا تھا کہ ایک کبڑے فقیر نے اُس کی جانب دستِ سوال دراز کر دیا۔ "بابا اللہ کی راہ پر کچھ دیتا جا۔"

جبران کو فیض آباد آئے ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے۔ نشاط ہوٹل جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا کیفے گلزار سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں تھا جبران کو ہوٹل کا کھانا پسند نہیں آیا اس لیے وہ ناشتہ ہوٹل میں کرتا اور دوپہر کا کھانا کیفے گلزار میں کھاتا۔ ہوٹل سے کیفے جاتے ہوئے یہ کبڑا فقیر روزانہ اُسے اسی کھمبے کے نیچے کھڑا ملتا تھا۔ جبران گداگروں کی سرپرستی کا قائل نہیں تھا مگر اس کبڑے کو وہ آٹھ آنے روپیہ ضرور دے دیا کرتا تھا۔ شاید اس لیے کہ کبڑا اپنے قد و قامت میں ہی نہیں کچھ کچھ شکل و صورت کے اعتبار سے بھی جبران سے مشابہ تھا۔ اگر اُس کی پیٹھ پر کوبڑ نہ ہوتا تو لوگ دور سے اُس پر جبران کا شبہ کر سکتے تھے۔

فقیر کے ہاتھ میں روپیہ کا نوٹ رکھ کر وہ آگے بڑھا ہی تھا کہ ایک سلیٹی رنگ کی بیوک کار اُس کے قریب سے گزری۔ جبران اپنے کسی خیال میں گم تھا یوں بھی وہ مین روڈ کی فٹ پاتھ پر چل رہا تھا جہاں پر ہر منٹ میں کئی کاریں اِدھر سے اُدھر آتی جاتی رہتی ہیں۔ مگر یہ بیوک کار چند گز آگے جا کر رک گئی پچھلی سیٹ کی کھڑکی سے ایک پھولے ہوئے سُرخ چہرے والے آدمی نے سر نکال کر جھانکا کیفے گلزار آچکا تھا جبران اسی طرح اپنے خیالات میں کھویا ہوا اندر داخل ہوگیا۔

موٹے آدمی نے سر کھڑکی کے اندر کرتے ہوئے اپنے ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ "بشیرے۔ تم نے ابھی اُس آدمی کو کیفے میں جاتے دیکھا؟"

"یس باس۔" ڈرائیور نے جواب دیا۔

"اس کے پیچھے جاؤ۔ اور دیکھو کہ وہ کس میز پر یا کس کیبن میں بیٹھتا ہے۔" موٹے آدمی نے ہدایت کی۔

"یس باس۔" ڈرائیور اتنی ہی دیر میں کار سے اُتر چکا تھا۔ تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے وہ کیفے میں داخل ہوا جبران ایک کیبن کا پردہ اُٹھا کر اندر جا رہا تھا۔ ڈرائیور نے کیبن کی چوکھٹ پر نظر ڈالی نمبر ۱۳ تحریر تھا۔ وہ فوراً ہی واپس نہیں لوٹا۔ کچھ دیر تک وہیں کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ اُس نے ویٹر کو کھانے کی ٹرے لئے کیبن میں جاتے دیکھ لیا۔

"باس۔" اُس نے واپس جا کر بتایا۔ "وہ شخص کیبن نمبر ۱۳ میں کھانا کھا رہا ہے۔"

"گڈ۔" موٹے آدمی نے سر ہلا کر خوشنودی کا اظہار کیا "اب کار کسی ٹیلیفون بوتھ تک لے چلو۔"

ڈرائیور کار میں آبیٹھا۔ دوسری سڑک پر مڑتے ہوئے اُسے ایک فون بوتھ نظر آگیا۔ اُس نے کار بوتھ کے سامنے روک لی۔ موٹا آدمی کار سے اُترا۔ بوتھ میں داخل ہوا جیب سے سیاہ رنگ کی ایک نوٹ بک نکالی۔ درمیان سے کھول کر کچھ ورق گردانی کی اور پھر ایسے صفحہ پر رک گیا جس پر مقامی کیفوں اور ریستورانوں کے پتے اور فون نمبر درج تھے۔ کیفے گلزار کا نمبر دیکھتے ہوئے اُس نے لٹکا ہوا ریسیور اُٹھایا اور مطلوبہ سکے مشین میں ڈال کر نمبر گھمانے لگا۔

"ہیلو کیفے گلزار۔" رابطہ قائم ہونے پر اُس نے کہا۔ "آپ کے کیفے کے کیبن نمبر ۱۳ میں ایک صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں اُن سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

جبران نے دوسری روٹی توڑی ہی تھی کہ ویٹر نے اُسے فون کال کی اطلاع دی۔ جبران کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں کچھ اور گہری ہوگئیں فیض آباد میں اُس کے کئی شناسا ہو سکتے تھے مگر وہ کسی کو اطلاع دیکر کہیں جانے کا عادی نہیں تھا اور جب سے آیا تھا کسی ایسے پبلک مقام پر نہیں گیا تھا جہاں کوئی اُس کی آمد سے واقف ہو سکتا۔ لامحالہ کسی نے اُسے ہوٹل یا کیفے میں ہی دیکھا ہوگا۔!

"فون کرنے والے نے کیا کہا تھا۔" اُس نے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے کلرک سے پوچھا۔

"کہا تھا کہ کیبن نمبر ۱۳ میں جو صاحب بیٹھے ہیں اُن سے بات کرنا ہے۔" کلرک نے بتایا۔

اِس کا مطلب تھا کہ کسی نے اُسے کیفے میں ہی دیکھا تھا۔ کیونکہ وہ عموماً کیبن نمبر ۱۳ میں ہی بیٹھا کرتا تھا۔ اِس لیے یہ دیکھا آج بھی

ہو سکتا تھا اور کسی وقت پہلے بھی۔ اُس نے ذہن پر زور دیا۔ گزشتہ تین دن میں اُسے کیفے میں کوئی آشنا صورت نظر نہیں آئی تھی۔ بہر حال اُس نے ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو۔" وہ محتاط لہجے میں بولا۔

"جبران۔"

"میرا نام خلیل ہے"

"میں اِس نام سے بھی واقف ہوں۔"

"آپ کون صاحب ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ تم نام سے زیادہ کام میں دلچسپی رکھتے ہو۔"

"درست ہے۔" جبران نے جواب دیا۔ "مگر میں یہاں کچھ آرام کرنے آیا ہوں۔"

"میرا کام بہت معمولی اور معاوضہ بہت زیادہ ہے۔"

"مثلاً کتنا۔"

"پچیس ہزار۔"

جبران کے ہونٹوں نے خاموش انداز میں سیٹی بجائی۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں کیفے گلزار کے کیبن نمبر ۱۳ میں بیٹھا ہوا ہوں۔"

"میں نے تمہیں کیفے میں جاتے دیکھ لیا تھا" جواب ملا "باقی کام میرے ڈرائیور نے انجام دیا۔"

"خوب" جبران نے کہا "کام کی نوعیت کیا ہے۔"

"فون پر گفتگو کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ تم میرے دفتر آجاؤ۔"

"اور یہ دفتر کہاں ہے؟"

"زیب اسٹریٹ۔ پلازہ مینشن۔ ٹاپ فلور۔" دوسری طرف سے بتایا گیا۔ "لفٹ سے اترتے ہی سامنے یونیک ٹریڈرز کا بورڈ نظر آجائیگا سیدھے اندر آجانا۔ میں اپنی پرائیوٹ سیکرٹری کو ہدایت کردوں گا وہ تمہیں میرے پاس لے آئے گی۔"

"تم بھی کھانا کھا رہے ہو اور میں بھی کھانے جا رہا ہوں" جواب دیا گیا۔ "اس لئے اگر کھانے سے فارغ ہو کر دو بجے تک آجاؤ تو بالکل مناسب ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں پہونچ جاؤں گا۔" جبران نے جواب دیا اور ریسیور رکھ دیا۔

★

یونیک ٹریڈرز کے دفاتر پلازہ مینشن کے پورے ٹاپ فلور پر پھیلے ہوئے تھے۔ مختلف دروازوں پر لگی ہوئی تختیوں سے معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کی شاید ہی کوئی ایسی چیز باقی رہ گئی ہو جسے یونیک ٹریڈرز والے امپورٹ یا ایکسپورٹ نہ کرتے ہوں۔ بائیں جانب ایک دروازے پر مینیجنگ ڈائریکٹر کی تختی آویزاں تھی۔ جبران نے ایک گہرا کش لے کر سگریٹ خاکدان میں اچھال دیا اور خود دروازے کو اندر کی جانب کھولتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔!

بیرونی آفس بڑی نفاست اور قیمتی فرنیچر سے آراستہ کیا گیا تھا۔ پورے کمرے میں قالین کا فرش تھا۔ دروازے کے ایک جانب دو سیٹوں والے تین صوفے پڑے ہوئے تھے جن کے سامنے تین ہی چھوٹی میزوں پر مختلف اخبار اور رسالے نظر آرہے تھے۔ سامنے ایک بڑی سی میز اور لوہے کی کئی الماریوں کے درمیان ایک خوبصورت سی لڑکی کوئی فائل کھولے رف پیڈ پر کچھ اعداد و شمار نقل کر رہی تھی۔ آہٹ سن کر اُس نے سر اٹھایا۔

"فرمایئے۔" اُس نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

جبران نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کیس نکالا۔ ایک سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر سگریٹ کیس واپس جیب میں رکھا اور پھر قدم بڑھا کر میز کے ایک کنارے پر بیٹھتے ہوئے لڑکی کی جانب جھکا۔

"لائٹر ہوگا۔" اُس نے بڑے مزے سے پوچھا۔

لڑکی نے کچھ حیران ہو کر اپنے داہنے ہاتھ کی جانب ایک دراز کھولی اور لائٹر جلا کر جبران کے سامنے کر دیا۔

"تھینک یو۔" جبران نے دھواں چھوڑتے ہوئے کہا اور میز سے اُتر کر دروازے کی طرف چل دیا۔

"آپ صرف سگریٹ سلگانے آئے تھے۔" لڑکی بیحد حیران تھی۔

"اوہ، میں بھول گیا۔" جبران ایک ہاتھ سے کان کی لو کھینچتے ہوئے بولا۔ "مجھے شاید کسی سے ملنا بھی تھا۔"

"آپ کا نام خلیل ہے۔" لڑکی نے کچھ ناگواری سے پوچھا۔

"آپ کو میرا نام معلوم ہے۔ تب تو آپ یہ بھی جانتی ہوں گی کہ مجھے کس سے ملنا ہے۔"

"میں کوئی فلرٹ لڑکی نہیں ہوں۔" اُس نے انٹرکام کا بٹن دباتے ہوئے کسی کو جبران کے آنے کی اطلاع دی اور پھر اُسے گھورتے ہوئے بولی۔

"جایئے باس آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ دروازہ بائیں جانب ہے۔"

"ایک بار پھر تھینک یو۔" جبران دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"واپسی میں یہیں ملئے گا۔ مجھے فلرٹ لڑکیوں سے گفتگو کرنے کا بڑا شوق ہے۔"

اِس سے پہلے کہ لڑکی کی چڑھی ہوئی تیوری کچھ سخت الفاظ میں ڈھل سکتی۔ جبران مینجنگ ڈائریکٹر کے پرائیویٹ آفس میں داخل ہو چکا تھا۔ یہ وہ ہی موٹا آدمی تھا جس نے جبران کو فون کیا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔" اُس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "میرا نام سردار علی ہے اور میں یونیک ٹریڈرز کا مینجنگ ڈائریکٹر ہوں۔ میں نے ہی تمہیں فون کرکے بلایا ہے۔" لہجہ میں وہ ہی تحکم تھا جس سے وہ اپنے ماتحتوں سے بات کرنے کا عادی تھا۔

جبران نے ایک لمحہ کے لئے اُسے گھُور کر دیکھا اور پھر کوئی جواب دیئے بغیر واپس جانے لگا۔

"کہاں جا رہے ہو۔" سردار علی جلدی سے بولا۔

"میں تمہارا کام نہیں کر سکتا۔"

"کیوں۔"

"میں اس تحکمانہ انداز سے مخاطب کئے جانے کا عادی نہیں ہوں۔" جبران نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

موٹے سردار علی کے چہرے پر غصّہ کی سُرخی اُبھری جسے اُس نے بڑی مشکل سے ضبط کیا۔ پھر ایک زبردستی کی مُسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے

ٹیلی پیتھی
اور
مستقبل بینی
ایک کتاب میں ۲ کتابیں
اپنا پیغام دُوسروں کے ذہنوں تک
پہنچانے اور اُن کے دِل کا حال جاننے
کا سائنسی طریقہ :
قیمت : ۲۵/۷ رُوپے معہ محصول ڈاک
مکتبۂ نفسیات
۵ ۔ فریر مارکیٹ ۔۔۔ کراچی

جا چکا ہے۔ اس پر تھوڑی دیر اِدھر اُدھر تلاش کرکے الارم بجا دیا گیا۔ ٹرک اسی وقت روانہ ہونے والا تھا۔ اُس کی تلاشی بھی لی گئی۔ مگر اکبر نہ ٹرک کے اندر اور نہ ڈرائیور کی سیٹ کے نیچے کہیں موجود نہیں تھا۔ میرے آدمی جیل کے باہر نگرانی کر رہے تھے انہوں نے بھی اکبر کو باہر آتے نہیں دیکھا۔ خدا معلوم وہ جیل کے اندر ہے یا باہر جا چکا ہے۔ اُس کا کہیں کچھ پتہ نہیں چل رہا ہے"

"اکبر تمہیں جانتا ہے۔؟"

"نہیں۔"

"پھر وہ تمہارے آدمی کے کہنے پر جیل سے فرار ہونے کے لئے کیسے آمادہ ہو گیا۔"

"وہ آدمی اُس کی کوٹھڑی کا ساتھی تھا اور اُس نے صرف اتنا کہا تھا کہ اگر وہ جیل سے نکلنا چاہتا ہے تو اس کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔" سردار علی نے جواب دیا۔ "جیل ایسی جگہ نہیں جہاں سے نکلنے کے لئے آدمی کو کسی خاص تحریک کی ضرورت ہو۔"

"مگر تم اسے جیل سے آزاد کیوں کرانا چاہتے تھے۔ اکبر سے اس دلچسپی کی کوئی خاص وجہ۔" جبران نے پوچھا۔

"یہ میرا معاملہ ہے۔ خواہ کسی بھی وجہ سے سہی۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ اِس وقت کہاں ہے" سردار علی نے جواب دیا۔ "بھرپور معاوضہ ملنے کے بعد تمہیں ایسے سوالات میں سر کھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"بہت خوب۔" جبران نے کہا "آج سات تاریخ ہے۔ تم چاہتے ہو کہ میں دس تاریخ تک اُسے تلاش کرکے تمہارے سامنے پیش کر دوں۔"

"میرے سامنے نہیں" سردار علی نے نفی میں سر ہلایا۔ "میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ اکبر جیل کے باہر ہو اور آزاد ہو۔"

"دوسرے الفاظ میں اگر وہ ابھی تک جیل کے اندر ہے تو مجھے اُسے رہا بھی کرانا ہوگا۔"

"مجھے یقین نہیں کہ وہ ابھی تک جیل کے اندر ہے" سردار علی نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "اگر ہوتا تو جیل کی پولیس نے وہاں کا چپّہ چپّہ چھان مارا ہے کہیں تو ملتا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ وہ آزاد ہو چکا ہے۔ گویا تمہارا مقصد حل ہو گیا۔ پھر میری کیا ضرورت ہے۔"

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کہاں ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے اُس نے رہا ہونے کے بعد تم سے رابطہ قائم نہیں کیا" جبران نے غور سے سردار علی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بیکار سوالوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔"

کہا۔"آئی ایم سوری۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم بُرا مان جاؤ گے۔"

"اب اگر اندازہ ہو گیا ہے تو اپنا کام بتاؤ۔"

"بیٹھو گے نہیں۔"

"سر دست میں کھڑا رہنا پسند کرتا ہوں۔"

"تمہاری مرضی۔" سردار علی نے کندھے اُچکائے۔ "میں اِس ماہ کی دس تاریخ سے قبل ایک شخص اکبر حسین کا پتہ چلانا چاہتا ہوں۔ وہ تین تاریخ کو مقامی جیل سے غائب ہو گیا ہے۔"

"کوئی سزا یافتہ مجرم ہے۔" جبران نے پوچھا۔

"یونہی سمجھ لو۔ اُسے ایک شخص کو قتل کرنے کے جرم میں دو سال کی سزا سُنائی گئی ہے۔" سردار علی نے بتایا "مگر یہ قتل اس سے اپنی جان کی حفاظت اور ایک ایئر ہوسٹس کی عزت بچاتے ہوئے ہوا تھا بہرحال یہ ایک غیر متعلق بات ہے۔ میں نے گزشتہ ہفتے اس کے فرار کا پورا انتظام کر لیا تھا۔ مگر وہ اُس سے فائدہ اُٹھانے کے بجائے خدا جانے کہاں گم ہو گیا کہ نہ جیل میں اُس کا کوئی پتہ ہے اور میرے آدمی قسم کھاتے ہیں کہ انہوں نے اُسے جیل سے باہر جاتے ہرگز نہیں دیکھا۔"

"تم نے اُس کے فرار ہونے کا انتظام کیا تھا۔" جبران نے دوہرایا "وہ کس طرح؟"

"جیل خانے کے مطبخ کے لئے روزانہ صبح ساڑھے نو بجے ایک ٹرک گوشت ترکاری برف اور دوسری ضروری سپلائی لے کر جاتا ہے۔" سردار علی نے جواب دیا "میں نے اُس کے ڈرائیور کے ذریعے یہ انتظام کیا تھا کہ اکبر اس کی سیٹ کے نیچے چھپ جائے اور وہ اُسے جیل سے باہر لا کر کسی جگہ چھوڑ دے اپنے ایک آدمی سے میں نے اکبر کو بھی یہ پیغام بھجوا دیا تھا کہ وہ اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر فرار ہو سکتا ہے۔ وہ ایک بڑی نرسری کا مالک اور بہترین مالی ہے جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے اُسے اپنے بنگلے کے باغ کی درستگی اور دیکھ بھال پر مقرر کیا ہے۔ وہ روزانہ صبح نو بجے اپنی کوٹھری سے نہا کر سپرنٹنڈنٹ کے بنگلے جاتا ہے جیل خانے کا کچن راستے میں پڑتا ہے۔ وہ بڑی آسانی سے نگاہ بچا کر ٹرک میں چھپ سکتا تھا۔"

"پھر کیا اکبر نے اس طرح رہا ہونے سے انکار کر دیا تھا۔"

"نہیں وہ آمادہ تھا۔ تین تاریخ اس کام کے لئے طے ہو چکی تھی۔ اکبر حسبِ معمول نو بجے کوٹھری سے نکلا۔ ٹرک بھی ٹھیک وقت پر پہونچ گیا تھا۔ اچانک پونے دس بجے کے قریب جیل کا الارم بجنے لگا معلوم ہوا کہ جب اکبر ساڑھے نو بجے تک سپرنٹنڈنٹ کے بنگلے نہیں پہونچا تو انہوں نے فون کر کے اُس کے بارے میں دریافت کیا۔ جیلر نے بتایا کہ وہ تو کوٹھری سے

"قتل کی واردات کسی طیارے میں ہوئی تھی۔" جبران نے اچانک پوچھا۔

"ہاں۔"

"وہ طیارہ کہاں سے آ رہا تھا اور کہاں جا رہا تھا۔"

"ایمسٹرڈم سے فیض آباد آ رہا تھا۔"

"اکبر تمہارے بقول ایک نرسری کا مالک ہے اُسے ایمسٹرڈم جانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی۔"

"میں نے کہا کہ میں تمہارا ان سوالات میں اُلجھنا پسند نہیں کرتا۔" سردار علی ناگواری سے بولا "سیدھی سی بات ہے کہ میں ایک آدمی کو تلاش کرانا چاہتا ہوں۔ اُس کے لئے معقول معاوضہ دے رہا ہوں۔ تم بتاؤ کہ یہ کام کر سکتے ہو یا نہیں۔"

"پچیس ہزار روپے کم نہیں ہوتے۔" جبران نے کہا "تم ایک بزنس مین ہو۔ جب کوئی بزنس مین ایک ایسے آدمی کے لئے پچیس ہزار خرچ کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے جو اسے جانتا تک نہیں تو اس کا مطلب ہے کہ وہ پچیس ہزار خرچ کر کے اُس سے لاکھوں کما بھی سکتا ہے۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ایسا کوئی معاملہ تو نہیں۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"یہ کہ اگر ایسا ہی معاملہ ہوا اور تم نے مجھے اس سے انجان رکھنے کی کوشش کی تو میں تمہارے مفاد کی پوری حفاظت نہیں کر سکوں گا۔ اس طرح تمہیں نقصان بھی پہونچ سکتا ہے۔"

"میرے نفع نقصان سے تمہیں کوئی غرض نہیں ہونا چاہیئے۔"

"بہت خوب۔" جبران نے سرسری لہجہ میں کہا "تمہارے پاس اکبر کا کوئی فوٹو ہے۔"

جواب میں سردار علی نے اپنی میز کی دراز سے ایک پوسٹ کارڈ سائز فوٹو نکال کر جبران کے سامنے ڈال دیا۔ جبران نے فوٹو اٹھا کر بڑی توجہ سے دیکھا۔ یہ ایک ایسے شخص کی تصویر تھی جس کا جسم چھریرا، چہرہ کچھ دبلا اور خدوخال زنانہ پن لئے ہوئے تھے۔ فوٹو سے عمر کا اندازہ کرنا مشکل تھا پھر بھی جبران کا خیال تھا کہ وہ چالیس سال کے لگ بھگ ہو سکتا ہے۔

"نرسری کا مالک بننے سے پہلے یہ کیا کرتا تھا۔" جبران نے پوچھا۔

"اپنی نوجوانی کے زمانے میں اسٹیج کا خاصا مشہور اداکار رہ چکا ہے" سردار علی نے بتایا۔

"غالباً زنانہ پارٹ بھی ادا کرتا ہوگا۔"

"ہاں۔"

"کوئی سابقہ پولیس ریکارڈ۔"

"بالکل نہیں۔"

"اچھی بات ہے۔ میں یہ کام کرنے کے لئے آمادہ ہوں" جبران نے کہا" معاوضہ کی ادائگی کا کیا انتظام ہوگا۔"

"تم مجھے یا میرے کسی آدمی کو بتادو کہ وہ کہاں ہے۔ میرا آدمی اُسے اپنی نظروں سے دیکھ کر اطمینان کرلے اس کے بعد تمہیں چیک دے دیا جائے گا۔"

"میں چیک نہیں لیا کرتا پہلی بات" جبران بولا" دوسری بات یہ کہ رقم پیشگی لیا کرتا ہوں۔"

"پوری رقم پیشگی نہیں دی جاسکتی" سردار علی نے جواب دیا۔

"میں زیادہ سے زیادہ دس ہزار ایڈوانس دے سکتا ہوں۔"

"خیر یونہی سہی۔ مگر کیش۔"

"اس کا انتظام ہوجائے گا۔" سردار علی نے کہا" ایک بات اور تمہاری شہرت کچھ اچھی نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تم اپنے موکل کو لوٹنے کی کوشش کرتے ہو۔ میرے ساتھ تم نے ایسی کوئی حرکت کی تو زندگی بھر پچھتاؤ گے۔"

"یہ شکایت صرف اُن لوگوں کو ہوتی ہے جو مجھے دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔" جبران نے اکبر کا فوٹو جیب میں رکھ کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے جواب دیا۔" اور تم تو پہلے ہی کہہ چکے ہو کہ مجھے تمہارے نفع نقصان سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیئے۔"

★

یونیک ٹریڈرز کے دفتر سے نکل کر جبران نے تقریباً ایک گھنٹہ ایک لائبریری میں اخبارات کے پرانے فائل دیکھنے میں صرف کیا۔ اکبر کے بارے میں سردار علی کا بیان درست ہی معلوم ہوتا تھا۔ نیشنل ایرلائنز کی فلائیٹ نمبر ۲۰۷ پر ایمسٹرڈم سے فیض آباد آتے ہوئے قتل کی واردات تقریباً چار ماہ

قبل ہوئی تھی۔ وہ نوجوان جسے شرابی مسافر نے زخمی کیا تھا بچ گیا تھا۔ اکبر کے وکیل نے صفائی میں حفاظت خود اختیاری کا عذر پیش کیا پھر بھی عدالت نے اُسے دو سال کی سزا سُنادی تھی۔ امید تھی کہ اپیل میں اُسے رہا کر دیا جائے گا۔ اپیل کے لئے درخواست بھی دے دی گئی تھی مگر اس درمیان میں وہ غائب ہوگیا۔ خبروں کے مطابق پولیس نے اُسے جیل کے اندر اور باہر ہر طرح تلاش کیا۔ مگر اُس کا کہیں پتہ نہیں چلا۔ اخباری تفصیلات سے ہی جبران کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ جیل کا نام قربان بیگ ہے اور جیلر کا نام نثار احمد۔

وہ لائبریری سے باہر آیا تو چار بجکر پندرہ منٹ ہوئے تھے

اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کچھ فاصلے پر ایک پبلک فون بوتھ نظر آرہا تھا۔

جبران چہل قدمی کے انداز میں چلتا ہوا بوتھ کے قریب پہونچا اور اندر داخل ہوگیا۔ جیل خانے کا نمبر وہ لائبریری کی فون ڈائرکٹری میں دیکھ چکا تھا۔ مطلوبہ سکے ڈال کر نمبر ڈائل کیا۔

"سٹی جیل۔" دوسری طرف سے جواب ملا۔

"آپ کون صاحب بول رہے ہیں۔؟" جبران نے پوچھا۔

"نثار احمد۔"

"میں سپرنٹنڈنٹ قربان بیگ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"قربان صاحب اپنے بنگلے میں ہیں کوئی کام۔؟"

"میرا خیال ہے کہ ڈیوٹی کے اوقات نو سے پانچ ہوا کرتے ہیں۔"

جبران نے بات کاٹ کر کچھ سخت لہجے میں کہا۔

"درست ہے مگر۔۔۔"

"پھر قربان صاحب بنگلے میں کیا کر رہے ہیں؟"

"آپ کون صاحب ہیں؟"

"ہوم سیکریٹری مرزا اشفاق الہٰی۔"

"اوہ۔" دوسری طرف سے کہا گیا "بات یہ ہے سر کہ وہ ابھی ابھی۔۔۔"

"خیر آپ مجھے بنگلے کا ایکسٹینشن دے دیں میں خود اُن سے بات کر لوں گا۔"

"یس سر۔ ابھی لیجیے۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر ایک بھاری آواز اُبھری لہجہ خوشامدانہ تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ جیلر نے اپنے سپرنٹنڈنٹ کو خطرے سے آگاہ کر دیا ہے۔

"گڈ آفٹر نون سر۔ دراصل میری وائف کی طبیعت کچھ خراب ہے اس لئے۔۔۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" جبران نے بات کاٹی "اکبر حسین کے کیس میں کیا ہوا۔"

"اکبر حسین۔۔۔ اوہ آپ کا مطلب اس قیدی سے ہے جو جیل سے فرار ہوگیا ہے۔" قربان بیگ نے کچھ حیرت سے کہا۔ "انسپکٹر فیاض تحقیقات کر رہے ہیں مگر ابھی تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اکبر تو ایسا غائب ہوا ہے جیسے اُسے زمین نگل گئی ہو۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ بات آپ تک پہونچ گئی ہے۔"

"کچھ ایسے پہلو سامنے آئے ہیں جن سے یہ معاملہ سیکورٹی سے متعلق ہوگیا ہے۔" جبران نے کہا۔ "میں تحقیقات کی رفتار سے بالکل مطمئن نہیں ہوں۔ وزیر داخلہ کی ہدایت کے مطابق میں کل ایک اسپیشل آفیسر کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ آپ کی جانب سے اُسے پورا تعاون ملنا چاہیئے۔"

"بہتر جناب۔ ویسے میرا خیال تھا کہ انسپکٹر فیاض۔۔۔"

"غالباً میں نے آپ کو اظہار خیال کی دعوت نہیں دی تھی۔"

جبران نے ناگوار لہجے میں کہا۔ "یہ بات یاد رکھیئے کہ سر دست یہ خبر آپ کے اور نثار احمد کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیئے۔"

"بہت بہتر۔ ایسا ہی ہوگا۔" قربان صاحب نے خوشامدانہ انداز سے کہا۔ "وہ آفیسر کل کس وقت تشریف لائیں گے۔"

"وہ کسی وقت بھی آسکتے ہیں۔" جبران نے بتایا اور ریسیور رکھ دیا۔ وہ بوتھ سے باہر نکلا تو اُس کے ہونٹوں پر ایک شریر مسکراہٹ رقصاں تھی۔

☆

نثار احمد قربان بیگ کے دفتر میں داخل ہوا تو اُس کے ہاتھ میں ایک کارڈ دبا ہوا تھا۔

"یہ میجر خلیل کون ہو سکتے ہیں۔" اُس نے پوچھا۔

"میجر خلیل" قربان بیگ نے سوالیہ لہجہ میں دوہرایا۔

"جی ہاں۔" نثار نے کارڈ دیکھتے ہوئے بتایا "فرام سینٹرل انٹیلیجنس۔"

"اوہ۔" قربان بیگ کھڑے ہوگئے "غالباً یہ وہی اسپیشل آفیسر ہے۔ میں تمہیں بتانا بھول گیا۔ وزارتِ داخلہ کی طرف سے اکبر کے فرار کی تحقیقات کے لئے ایک خاص افسر بھیجا گیا ہے۔ ہوم سیکریٹری صاحب نے اسی بارے میں فون کیا تھا۔ اُن کی ہدایت ہے کہ یہ خبر باہر نہیں جانا چاہیئے۔"

"اوہ۔" نثار کے منہ سے نکلا "وہ میرے دفتر میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں انہیں یہاں لے آؤں یا آپ چل رہے ہیں۔"

"چلو میں چلتا ہوں" قربان بیگ نے دروازے سے نکلتے ہوئے جواب دیا۔

جبران جیلر کے آفس میں بڑی بے نیازی کے ساتھ ایک کرسی پر بیٹھا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ نثار احمد اور قربان بیگ اندر داخل ہوئے تو وہ کھڑا ہو گیا۔

"آپ ہیں سپرنٹنڈنٹ قربان بیگ صاحب" نثار احمد نے تعارف کرایا۔

"آپ سے مِل کر خوشی ہوئی"۔ جبران نے ہاتھ ملایا۔ "مجھے اُمید ہے کہ ہوم سیکریٹری صاحب آپ کو میرے بارے میں فون کر چکے ہونگے۔"

"جی ہاں" قربان بیگ نے مُسکرانے کی کوشش کی۔ "لیکن میری ناقص عقل میں یہ بات نہیں آئی کہ اِس معاملے کا سیکورٹی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ بہر حال آپ سے مکمل تعاون کیا جائے گا۔ مگر پہلے یہ فرمائیے کہ آپ کے لئے کیا منگوایا جائے گا۔"

"شکریہ۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اِس لئے کوئی اعتراض نہ ہو تو مجھے اکبر کی فائل دیدیں۔ میں کچھ دیر اس کا مطالعہ کروں گا۔ پھر آپ کی اجازت سے جیل میں مختلف مقامات کا جائزہ لینا اور مختلف لوگوں سے کچھ ضروری سوالات کرنا چاہوں گا۔"

"ضرور۔ ضرور" قربان بیگ نے جواب دیا۔ "فائل آپ کو نثار صاحب دیدیں گے۔ آپ نے چائے کی دعوت تو رد کر دی لیکن مجھے خوشی ہوگی اگر آپ دوپہر کا کھانا میرے ساتھ تناول فرمائیں۔"

"آپ اصرار کرتے ہیں تو میں ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔ یوں بھی میں آپ کے بنگلے کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں"، جبران نے کہا۔ "میری اطلاع کے مطابق اکبر کی ڈیوٹی آپ کے باغ میں ہی لگائی گئی تھی۔"

"جی ہاں۔ وہ بڑا اچھا مالی تھا۔ میں اُس سے ایک نئی قسم کے گلاب کی کیاریاں تیار کرا رہا تھا۔ شکر ہے کہ وہ غائب ہونے سے پہلے اپنا کام مکمل کر چکا تھا۔" قربان بیگ نے کہا۔ "میری موجودگی کی ضرورت تو نہیں۔؟" "جی نہیں۔ آپ جا سکتے ہیں۔ البتہ میں نثار صاحب کا کچھ وقت ضرور خراب کروں گا۔"

قربان بیگ اپنے دفتر میں واپس چلے گئے۔ نثار احمد نے اکبر کی فائل اپنی الماری سے نکال کر جبران کو دے دی۔ وہ کچھ دیر اس کا مطالعہ کرتا رہا۔ بیشتر باتیں اُسے سردار علی سے معلوم ہو چکی تھیں البتہ ایک دلچسپ انکشاف یہ ہوا کہ اکبر حسین کے پاس انٹرنیشنل پاسپورٹ تھا اور وہ ہر دوسرے تیسرے ماہ یورپ کے کسی نہ کسی شہر جاتا رہتا تھا۔ جبران نے جب اس سلسلے میں نثار احمد کی توجہ دلائی تو اُس نے بتایا کہ اُسے بھی یہ بات عجیب معلوم ہوئی تھی اور اُس نے اس سلسلے میں اکبر سے پوچھا بھی تھا۔ جس کا جواب اکبر نے یہ دیا تھا کہ وہ باغبانی میں نت نئے تجربے کرتا رہتا ہے اور خواہ اُس کے ملک کے لوگ اُس سے واقف نہ ہوں مگر بیرونی ممالک میں باغبانی کے شوقین اُسے بخوبی جانتے ہیں۔ چنانچہ جب کہیں کوئی پھولوں کی نمائش ہوتی ہے اُسے مدعو کیا جاتا ہے۔ خود وہ اپنے طور پر بھی کبھی کسی نایاب پھول کی تلاش میں، کبھی کسی خاص پھول کے بیج حاصل کرنے کے لئے دوسرے ممالک جاتا رہتا ہے۔ فائل بند کر کے جبران نثار سے اکبر اور اُس کی گمشدگی یا فرار کے بارے میں مختلف سوالات کرتا رہا۔ نثار کا ذاتی خیال یہ تھا کہ اکبر جیل ہی میں

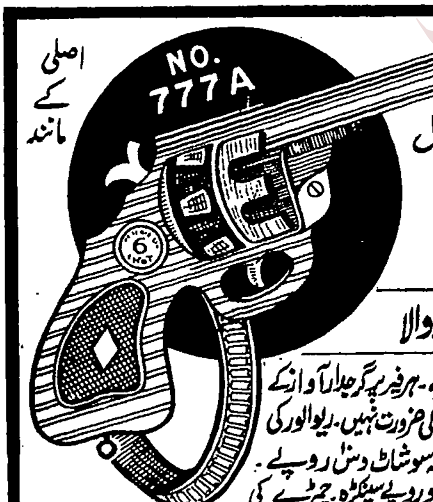

اصلی کے مانند

فیر والا امریکن ڈیزائن

نیا ماڈل

آٹومیٹک سیفٹی پستول

بارعب۔ گرجدار آواز۔ جان و مال کا محافظ۔ ڈراموں اور فلموں میں کام آنے والا

جسے دیکھتے ہی دشمن پر رعب طاری ہو جاتا ہے۔ بالکل اصلی کے مانند گھوڑا دباتے ہی چرخی خود بخود گھومتی ہے۔ ہر فیر پر گرجدار آواز کے ساتھ شعلہ نکلتا ہے جسے دیکھکر چور ڈاکو اور جنگلی جانور خوف زدہ ہو کر بھاگ جاتے ہیں۔ اسکے رکھنے کیلئے لائسنس کی ضرورت نہیں۔ ریوالور کی لمبائی آٹھ انچ ہے پاکٹ میں بآسانی رکھا جا سکتا ہے۔ قیمت اسپیشل کوالٹی ڈبل بیرل دونالی سفید دستے والا معہ سو شاٹ دس روپے۔ محصولڈاک دو روپے علاوہ۔ زائد شاٹ دو روپے سیکڑہ۔ چمڑے کی خوبصورت بیٹی قیمت چھ روپے۔ دو ریوالور یا ریوالور اور بیلٹی ایکساتھ منگانے پر محصولڈاک معاف
پتہ ذیل پر خط لکھ کر آج ہی طلب کریں۔

سول ایجنٹ :-

حیرت انگیز تحفہ تھری ڈی چشمہ مُفت

جسے لگا کر آپ دیکھیں گے آپکے محبوب فلمی ستارے کیسے زندہ ہوتے ہیں۔ پستول کے ہر خریدار کو چشمہ کے ساتھ مقبول فلمی ستاروں کی تصاویر بھی مُفت دیجاتی ہیں۔

گلوب ٹریڈرز پوسٹ بکس نمبر ۲۷۳ کراچی ۱

کسی جگہ چھپ کر بیٹھ گیا ہے۔ اگرچہ اس کا وہ کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکا کہ اگر یہ بات ہے تو پھر وہ تلاشی میں ملا کیوں نہیں اور یہ کہ گزشتہ چار یا پانچ دن سے وہ کچھ کھائے پیئے بغیر کس طرح رہا ہوگا۔ البتہ اُس نے قربان بیگ کے بارے میں بتایا کہ وہ سختی سے اس خیال کے حامی ہیں کہ اکبر کسی نہ کسی طرح جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا ہے۔

"یہ آپ کے قربان بیگ صاحب کس قسم کے آدمی ہیں"۔ جبران نے سرسری لہجے میں سوال کیا۔

"ٹھیک ہی ہیں۔ مگر غصّہ کے بہت تیز ہیں۔"

"اُن کے بنگلے کی تلاشی بھی لی گئی تھی"

"جی ہاں۔ بلکہ خود انہوں نے اصرار کر کے تلاشی دلوائی۔"

"وہ یہاں اکیلے رہتے ہیں یا بیوی بچے بھی ساتھ ہیں۔"

"بچے تو نہیں ہیں البتہ اُن کی بیگم ضرور رہتی ہیں۔"

"اُن کی گھریلو زندگی کیسی ہے۔"

"کیا مطلب۔؟"

"میرا مطلب ہے کہ بیگم صاحبہ ماڈرن خیالات کی ہیں یا پُرانے اور چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتی ہیں یا ...." جبران دانستہ فقرہ نامکمل چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔

"قربان صاحب جتنے مزاج کے تیز ہیں اُن کی بیگم اتنی ہی خوش اخلاق ہیں"۔ نثار احمد نے جواب دیا۔ "بے حد حسین اور دلکش شخصیت کی مالک ہیں۔ اُن کا گھر جا کر دیکھیئے۔ آپ کو کم گھروں میں اتنی سجاوٹ اور سلیقہ نظر آئے گا۔ کھانا بھی بہت اچھا پکاتی ہیں اور چائے تو اتنی عمدہ بناتی ہیں کہ کیا عرض کروں۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ آپ بیگم قربان کے بہت مداح ہیں۔"

"جی ہاں۔ مگر کہیں یہ بات قربان صاحب کے سامنے نہ کہہ دیں"۔ نثار احمد دبی زبان سے بولا۔ "وہ ضرورت سے زیادہ شکی مزاج واقع ہوئے ہیں۔ ابتدا میں تو میں کبھی کبھی جاتا رہتا تھا مگر اب مہینوں سے رُخ نہیں کرتا۔ جیل میں عملے کے سب ہی لوگ جانتے ہیں کہ قربان صاحب کسی کو اپنی بیگم سے بات کرتے نہیں دیکھ سکتے۔ اِس سلسلے میں کئی لوگوں کی شامت آچکی ہے۔ خدا معلوم بیگم قربان ان کے ساتھ کس طرح گزر کر رہی ہیں۔ جب ہم لوگوں کے ساتھ قربان صاحب کا طرزِ عمل یہ رہتا ہے تو اُن پر تو نہ جانے کتنی ڈانٹ ڈپٹ پڑ جاتی ہوگی۔ حالانکہ وہ شریف خاتون ہرگز اِس طبیعت کی نہیں ہیں۔"

جبران کو یہ تمام باتیں بڑی دلچسپ معلوم ہوئیں۔ کچھ اور گفتگو کے بعد وہ نثار احمد کو ساتھ لے کر جیل کے معائنے کے لئے نکلا۔ مختلف مقامات کو خود دیکھا۔ کچن کا خاص طور پر جائزہ لیا اور وہاں کے عملے سے کئی سوالات کیئے۔ جن میں سے بیشتر کی نوعیت یہ تھی کہ آیا کچن سے پُراسرار طریقہ پر کھانا تو غائب نہیں ہو رہا ہے۔ جہاں جیل میں کسی جگہ پوشیدہ ہونے کا تعلق تھا جبران نے تمام پوشیدہ مقامات دیکھے مگر اکبر کیا اُس کا کوئی سراغ بھی نظر نہیں آیا اِس مصروفیت میں دن کا ایک بج گیا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ جیل کے اندر تو آپ کی تحقیقات مکمل ہو گئی" نثار احمد نے کہا۔ "سب ہی کچھ آپ نے دیکھ لیا۔"

"ہاں، سوائے قربان صاحب کے بنگلے کے" جبران مُسکرایا۔

"آپ کا خیال ہے کہ اکبر وہاں چھپا بیٹھا ہوگا"۔ نثار نے کچھ حیرت سے پوچھا۔ "مگر تلاشی تو وہاں بھی لے لی گئی تھی۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا"۔ جبران نے بات ٹالی پھر رسٹ واچ دیکھتے ہوئے بولا۔ "کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ قربان صاحب شاید انتظار کر رہے ہوں گے۔ آیئے آپ بھی آجائیں۔"

"کون میں"۔ نثار چونکا۔ "مجھے تو معاف ہی رکھیں۔ مدّت سے نہیں گیا ہوں۔ بیگم قربان ملیں گی تو ضرور شکایت کریں گی۔ اور قربان صاحب اِس شکایت کو خدا معلوم کیا کیا معنی پہنائیں گے۔"

"کیا بیگم قربان واقعی بہت حسین ہیں"۔ جبران نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں۔ معلوم ہوتا ہے کہ خالقِ کائنات نے انہیں بڑی فرصت میں بنایا ہے"۔ نثار کے لہجے میں پسندیدگی کے علاوہ کوئی اور جذبہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ "آپ جا رہے ہیں خود ہی دیکھ لیں گے۔ کم سے کم میں نے اپنی زندگی میں نسوانی حسن کا اتنا مکمل نمونہ نہیں دیکھا مگر جس طرح مور کبھی کبھی اپنے پیروں کو دیکھ کر افسردہ ہو جاتا ہے اسی طرح بیگم قربان بھی اپنے بالوں کی وجہ سے فکر مند رہتی ہیں۔ اُن کے بال بہت چھوٹے اور رُوکھے ہیں۔ اِسی لیئے وہ عام طور پر بالوں کی وِگ استعمال کرتی ہیں"۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا"۔ جبران نے دلچسپی سے سوال کیا۔

"بس یونہی ایک مرتبہ کسی اطلاع کے بغیر گھومتا ہوا اُن کی طرف جا نکلا تھا"۔ نثار نے بتایا۔ "بیگم قربان گھر کی صفائی میں مشغول تھیں مجھے دیکھتے ہی اندر بھاگ گئیں۔ اس وقت اُن کے سر پر وِگ نہیں تھی۔"

"اچھی بات ہے تو پھر میں چلتا ہوں۔"

"ذرا خیال رکھیئے گا کہ قربان صاحب کو کسی شکایت کا موقع نہ ملے"۔ نثار مُسکرایا اور سلام کر کے دوسری جانب گھوم گیا۔ جبران کچھ دیر

وہیں کھڑا اُسے جاتے دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ قدموں سے قربان بیگ کے بنگلے کی طرف چلدیا۔!

★

قربان بیگ اپنے چھوٹے سے خوبصورت باغ میں آم کے ایک گھنے درخت کے نیچے کرسی ڈالے بیٹھے تھے۔

"آپ نے بہت دیر کردی۔" وہ اُٹھے بغیر بولے۔

"جی ہاں۔ میں چاہتا تھا کہ دوپہر تک اپنے کام سے فارغ ہو جاؤں۔" جبران نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"گویا آپ نے اپنی تحقیقات مکمل کرلی ہیں۔" کچھ دلچسپی سے قربان بیگ نے پوچھا۔ "پھر اکبر کی گمشدگی کا معمہ حل ہوا۔"

"غالباً یہ وہ ہی کیاری ہے' جسے اکبر اپنے غائب ہونے سے قبل تیار کر رہا تھا۔" جبران نے جس کیاری کی جانب اشارہ کیا تھا وہ تقریباً چھ فٹ لمبی اور چار فٹ چوڑی تھی۔ ایک ایک فٹ کے فاصلے سے گلاب کے چھوٹے چھوٹے پودے لگے تھے اور بھربھری مٹی اس کے تازہ بنے ہونے کی نشاندہی کر رہی تھی۔

"جی۔ مگر آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"

"تحقیقات ابھی کیسے مکمل ہوسکتی ہے۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جیل کی حد تک میں نے تقریباً اپنا کام پورا کرلیا ہے۔"

"تقریباً کی گنجائش غالباً آپ نے اِس لئے رکھی کہ ابھی میرا بنگلہ نہیں دیکھا ہے۔"

"جی ہاں۔" جبران نے غور سے قربان بیگ کی طرف دیکھا۔ "بشرطیکہ آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو۔"

"مجھے اعتراض کیوں ہوگا۔" قربان بیگ کھڑے ہوگئے "فرمائیے پہلے بنگلہ دیکھیں گے یا کھانا لگوایا جائے۔"

"میرے خیال میں اِس ناگوار فرض سے بھی فرصت پالی جائے تو اچھا ہے۔" جبران نے جواب دیا۔

قربان بیگ اُسے ساتھ لئے بنگلے کا ایک ایک کمرہ اور ایک ایک گوشہ دکھانے لگے۔ اِس جائزے کے درمیان کچن میں بیگم قربان کی بھی ایک جھلک دکھائی دی۔ قربان صاحب نے جبران کا تعارف کرایا۔ مگر بیگم صاحبہ نے سلام کرنے کے بعد جو پیٹھ موڑی تو جب تک جبران وہاں رہا وہ پشت کئے ہی اپنے کام میں مصروف رہیں۔ اور اس ایک نظر میں جبران نے اُن کے بارے میں کوئی خاص اچھی رائے قائم نہیں کی دُبلا پتلا چہرہ جس پر ضرورت سے زیادہ میک اپ کیا گیا تھا۔ نقش و نگار اچھے ضرور تھے مگر انہیں غیر معمولی حسین نہیں کہا جاسکتا تھا۔ میک اپ کے باوجود عمر زیادہ لگ رہی تھی۔ ایک اور بات جو جبران کو پورے گھر کے معائنہ کے دوران کھٹکتی رہی وہ یہ تھی کہ نثار احمد کے بقول بیگم قربان بیحد سلیقہ مند تھیں اور اُن کا گھر آئینے کی مانند چمکتا رہتا تھا مگر یہاں جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا اُسے سلیقہ تو کسی طرح نہیں کہا جاسکتا تھا۔ کئی کمرے ایسے تھے جن میں شاید کئی دن سے صفائی درکنار جھاڑو بھی نہیں دی گئی تھی۔ یہ وہ کمرے تھے جو عموماً زیرِ استعمال نہیں رہتے تھے مگر دوسرے کمروں میں بھی چیزوں کی ترتیب و سجاوٹ میں سلیقے کا فقدان تھا یا کم سے کم اس معیار کا نہیں تھا جس کا نقشہ نثار نے کھینچا تھا۔

جبران کے لئے یہ امر دلچسپی اور حیرت کا باعث ضرور تھا۔ مگر وہ سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے نثار کا اپنا معیار اتنا فروتر ہو کہ اُس سے ہٹی ہوئی کوئی بھی مثال اُس کے دل میں تعریف کا جذبہ پیدا کردے یا پھر یہ ہوسکتا تھا کہ خود نثار کے کہنے کے مطابق وہ کئی ماہ سے بنگلے نہیں آیا تھا۔ اِس دوران قربان صاحب اور اُن کی بیگم کے تعلقات اتنے کشیدہ ہوگئے ہوں کہ بیگم قربان نے گھر کی جانب توجہ دینا کم کردی ہو۔ بہر حال وجہ کچھ بھی رہی ہو اُس کی تہہ تک پہونچنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوسکتا تھا۔

تمام بنگلے کا چکر لگا کر قربان بیگ جبران کو کھانے کے کمرے میں لے آئے۔ اتنی دیر میں بیگم صاحبہ نے میز پر کھانا لگا دیا تھا جبران نے منہ ہاتھ دھویا اور میز پر بیٹھ گیا۔ قربان بیگ اُس کے منتظر تھے۔

"بسم اللہ کیجئے۔" انہوں نے کہا۔

"کیا بیگم صاحبہ نہیں آئیں گی؟" جبران نے پوچھا۔

"اُن کی طبیعت خراب ہے۔"

"کیا بیمار ہیں۔؟"

"گلے کے غدود خراب ہوگئے ہیں۔" قربان بیگ نے بتایا۔ "میرا ارادہ کل صبح انہیں ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا ہے۔"

جبران نے مزید سوالات مناسب نہیں سمجھے۔ وہ کھانے کی طرف متوجہ ہوگیا۔ کھانے میں صرف بھنا ہوا قیمہ اور ماش کی دال تھی۔ یہاں بھی جبران کو نثار کی رائے اور حقیقت میں بڑا تضاد محسوس ہوا۔ قیمہ بھوننے کی کوشش میں جل گیا تھا اور ماش کی دال میں نہ صرف کنی باقی تھی بلکہ پانی بھی جی کھول کر ڈال دیا گیا تھا۔ غالباً قربان بیگ نے اُس کے چہرے کے تاثرات سے اُس کے خیالات کا اندازہ لگالیا۔

"معاف کیجئے گا خلیل صاحب" وہ بولے "جیسا کہ میں نے بتایا بیگم کی طبیعت ناساز ہے۔ کھانا اگر بدمزہ لگے تو میں کچھ باہر سے منگوادوں۔"

"جی نہیں۔" جبران نے تکلفاً جھوٹ بولا "کھانا بیحد لذیذ ہے۔ میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔"

"کیا؟"

"یہی کہ اب تک تمام حالات و واقعات پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اکبر یقیناً جیل سے فرار ہو گیا ہے۔" جبران نے کہا "اگر اس کے فرار کا ذریعہ ہمارے علم میں نہیں یا وہ ابھی تک گرفتار نہیں کیا جا سکا تو پھر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ جیل میں چھپا بیٹھا ہے۔ جیسا کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے۔"

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ تحقیقاتی سرگرمیوں کا دائرہ جیل کے اندر رکھنے کے بجائے جیل کے باہر پھیلانا مناسب ہوگا۔" قربان بیگ نے جواب دیا "مگر یہ بڑے بڑے لوگ اپنی من مانی کرتے ہیں۔ اب بتلایئے ـــ ہوم سیکریٹری صاحب نے آپکو یہاں بھیجا تو کیا حاصل ہوا۔"

جبران ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ کھانا ختم ہوا تو بیگم قربان دوپٹہ کا پلو اس طرح سر پر ڈالے کہ اُن کا نصف کے قریب چہرہ چھپ گیا تھا، کمرے میں داخل ہوئیں۔ قربان صاحب دروازے کی جانب سے پشت کئے بیٹھے تھے۔ آہٹ سُن کر جبران نے دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک لمحہ کے لئے بیگم صاحبہ نے پلو اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ نگاہیں چار ہوئیں۔ جبران کو محسوس ہوا جیسے بیگم قربان کے ہونٹ بلا آواز حرکت کر رہے ہوں۔ اُس نے غور کیا تو ہونٹوں کی حرکت کچھ اس طرح تھی جیسے وہ کہہ رہی ہوں بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔ اُسی لمحے قربان بیگ نے بھی گھوم کر دیکھا اور بیگم صاحبہ جلدی سے دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے کمرے میں آگئیں۔ کھانے کے برتن اُٹھائے اور جس خاموشی سے آئی تھیں اسی طرح باہر نکل گئیں۔

جبران کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ مگر اُس نے اپنے چہرے سے اُسے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ البتہ اُس کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ مختلف خیالات آ رہے تھے۔ امکانات کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا تھا، کیا قربان بیگ نے اپنی بیوی کو اُن کی مرضی کے خلاف زبردستی اپنے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے۔؟ کیا ان دونوں کے اختلافات اب اس حد کو پہونچ چکے ہیں کہ قربان بیگ کی تنگی اور غصہ ور طبیعت سے بیگم صاحبہ کو اپنی زندگی خطرے میں نظر آنے لگی ہے؟ یا پھر یہ محض اُس کا فریب نظر ہے کہ وہ بیگم صاحبہ کے ہونٹوں کی ایک بے معنی حرکت کو معنی پہناتے کی کوشش کر رہا ہے۔؟

اُس کے خیالات ابھی یہیں تک پہونچے تھے کہ بیگم قربان چائے لے کر آگئیں۔ نثار نے اُن کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے کی بے حد

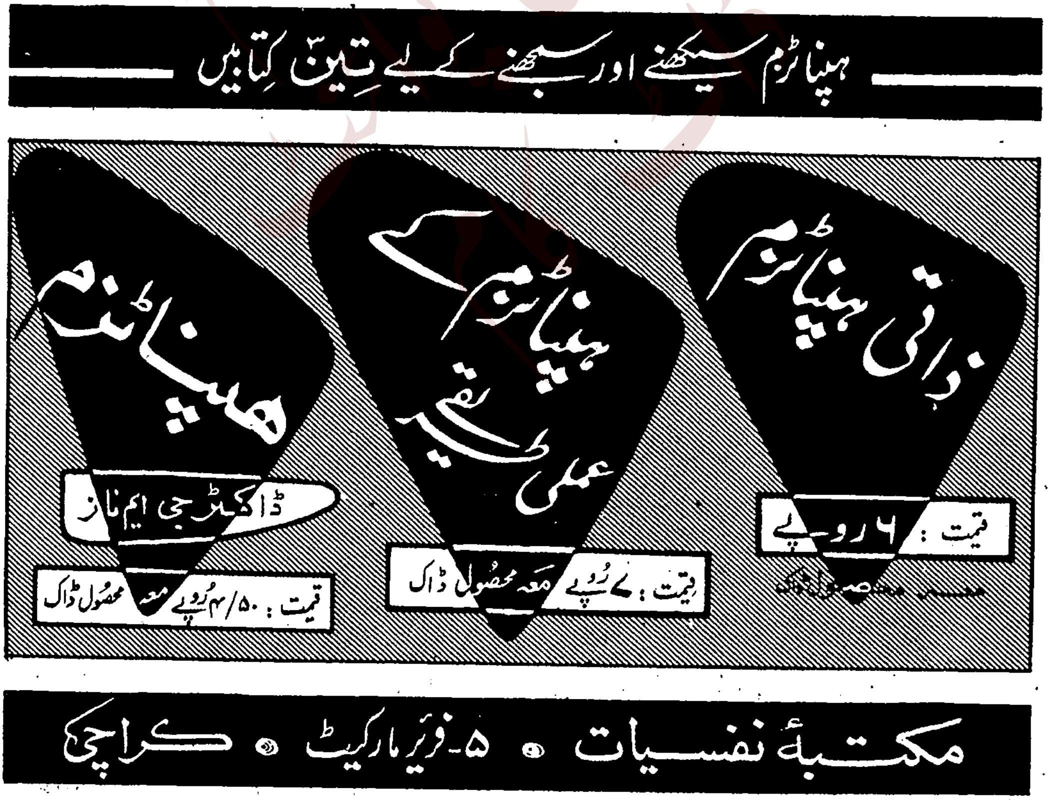

تعریف کی تھی مگر اس مرتبہ بھی جبران کو اُس کی رائے سے اتفاق کرنا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ بیگم صاحبہ نے چائے کی پیالی اُس کے سامنے سے اُٹھاتے ہوئے ایک مرتبہ پھر اس کی طرف دیکھا اور اس مرتبہ تو وہ اتنی قریب تھیں کہ کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اُن کے ہونٹ بے آواز حرکت کرتے ہوئے صاف کہہ رہے تھے۔ "مجھے بچاؤ۔ میری جان خطرے میں ہے۔"

★

جبران تقریباً تین بجے جیل سے رخصت ہو گیا۔ نثار احمد اور قربان بیگ اُسے باہر تک چھوڑنے آئے۔ تنہائی کا موقع پا کر قربان بیگ نے دبی زبان سے کہہ دیا کہ ہوم سیکریٹری صاحب شاید اُس سے ناراض ہیں۔ اگر وہ اپنی رپورٹ میں جیل اور جیل کے حکام کے بارے میں دو چار اچھے ریمارک دیدے تو وہ بہت ممنون ہوں گے۔ نیز یہ کہ جیسا کہ اُس نے خود دیکھ لیا بیگم قربان کی طبیعت واقعی ناساز ہے اسی وجہ سے وہ کبھی کبھی اوقات کار میں بھی گھر چلے آتے ہیں، کل بیگم کو ڈاکٹر کو دکھانے کے بعد وہ انہیں اُن کے گھر بھیج دیں گے۔ سیکریٹری صاحب کو اطمینان دلا دیا جائے کہ آئندہ انہیں کسی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ جبران نے بڑی خوش دلی سے وعدہ کر لیا۔ ہاتھ ہلا کر ایک گزرتی ہوئی ٹیکسی کو روکا اور قربان بیگ صاحب سے گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کر کے روانہ ہو گیا۔

مگر جیل روڈ سے گزرتے ہی اُس نے ٹیکسی ایک پبلک فون بوتھ کے سامنے رکی۔ کرایہ ادا کر کے اُسے رخصت کیا اور کچھ دیر فٹ پاتھ پر سوچتے رہنے کے بعد بوتھ میں داخل ہو گیا۔ جیل کا نمبر ڈائل کیا۔ اتفاق سے ریسیور اُٹھانے والے خود قربان بیگ ہی تھے۔

"ہیلو مسٹر قربان بیگ" جبران نے ماؤتھ پیس پر رومال رکھتے ہوئے کہا۔

"بول رہا ہوں۔"

"میں نے ابھی ابھی ایک انٹیلیجنس کے آدمی کو جیل سے جاتے دیکھا ہے۔" جبران بولا "کیا اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اب مرکزی حکومت کو بھی اکبر کی گمشدگی سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔"

"آپ کون صاحب ہیں۔" قربان بیگ نے چونکتے ہوئے پوچھا

"کیا اس افسر نے آپ کے بنگلہ کا رُخ بھی کیا تھا" جبران سنی اَن سنی کر گیا۔

"میں پوچھ رہا ہوں آپ کون ہیں۔۔؟"

"اور کیا اُس نے آپ کے باغ میں وہ کیاری بھی دیکھی تھی جس کے نیچے آپ نے اکبر کو چھپا رکھا ہے" جبران اسی سابقہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔۔۔ قربان بیگ جیسے سکتہ میں آ گئے۔

"یہ کیا بکواس ہے" وہ سنبھل کر بولے۔

"جی ہاں ظاہر ہے کہ اتنے دن زمین میں رہنے کے بعد اکبر زندہ تو نہیں ہو گا" جبران نے اِس طرح کہا جیسے اُس سے اکبر کی خیریت کے بارے میں کچھ دریافت کیا گیا ہو "بلکہ میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ دفن ہونے سے پہلے ہی اُس کا دم نکل گیا تھا۔"

"آخر تم ہو کون اور کیا چاہتے ہو۔"

"ایمانداری کی بات یہ ہے کہ میں آپ کو قطعی قصوروار نہیں سمجھتا۔ اتنی حسین بیوی جس کے پاس بھی ہو اُسے ہر طرح اپنی متاعِ عزیز کی حفاظت کرنے کا حق پہونچتا ہے اور یہ معاملہ تو براہِ راست غیرت سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ بھلا کون شریف آدمی ایک قاتل کو اپنی خوبصورت بیوی سے خوش فعلیاں کرتے دیکھ کر برداشت کر سکتا ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ یہ دنیا والے اتنے انصاف پسند ہرگز نہیں ہوتے۔ قانون کو اِس بات کی سُن گُن بھی مل جائے تو آپ کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں پڑ سکتی ہیں"

"ہوں" قربان بیگ صاحب نے ایک گہری سانس لی "کتنی رقم چاہتے ہو۔۔؟"

"آپ بہت سمجھدار آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے ایسے لوگوں سے مل کر بڑی مسرت ہوتی ہے" جبران نے جواب دیا "بہتر ہو گا کہ ہم لین دین کی تفصیلات باہم مل کر طے کر لیں۔ میں آج سہ پہر ٹھیک پانچ بجے کیفے گلزار کے ساتویں کیبن میں آپ کا انتظار کروں گا۔"

"مگر۔۔۔"

"مجھے معلوم نہیں کہ آپ گھر میں کتنی نقد رقم رکھنا پسند کرتے ہیں" جبران نے بات کاٹی "اِس لئے پہلی قسط کے بطور جو کچھ بھی ہو سکے ساتھ لیتے آئیں۔ آپ جیسے عقلمند آدمی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اگر آپ مقررہ وقت پر نہیں آئے تو کیا کچھ ہو سکتا ہے۔" اور یہ کہہ کر جواب کا انتظار کئے بغیر اُس نے ریسیور رکھ دیا۔

★

جبران نے ٹھیک ساڑھے چار بجے قربان بیگ کو ایک ٹیکسی میں جاتے دیکھا اور اس کے پانچ منٹ بعد وہ بڑے اطمینان سے جیل میں داخل ہو گیا۔ پہریدار دیکھ چکا تھا کہ جیل کا سپرنٹنڈنٹ اور جیلر بذاتِ خود اُسے چھوڑنے باہر آئے تھے۔ وہ اُسے روکنے کی ہمت کیسے کر سکتا تھا۔ اُس نے بڑے ادب سے سلام کیا اور ایک طرف ہٹ گیا۔ جبران سیدھا قربان بیگ کے بنگلے پہونچا۔ بیگم صاحبہ کمرۂ نشست میں صوفے پر کسی خیال میں گم بیٹھی تھیں۔ جبران کو دیکھا تو گھبرا کر کھڑی ہو گئیں،

اور جلدی سے دوپٹہ کا پلو سر پر ڈال کر منہ دوسری طرف کر لیا۔

"قربان صاحب گھر پر نہیں ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" جبران مسکرایا۔ "میں نے ہی انہیں باہر بھیجا ہے تاکہ میں تم سے تنہائی میں کچھ باتیں کر سکوں۔"

"مجھ سے۔؟"

"ہاں تم سے اکبر حسین۔"

شلوار قمیص پہنے ہوئے وہ ہستی اتنی تیزی سے جبران کی طرف گھومی جیسے بجلی کا ننگا تار چھو گیا ہو۔ دوپٹہ کا پلو سر سے اتر گیا تھا اور آنکھیں حیرت سے باہر نکلی پڑ رہی تھیں۔

"آپ کو۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ۔۔۔ کہ میں اکبر ہوں" اس نے گھبرا کر ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"کئی باتیں اس حقیقت کی غمازی کر رہی تھیں" جبران بڑے اطمینان سے بولا۔ "نثار احمد نے بیگم قربان کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا۔ میں نے یہاں اس سے بالکل مختلف بلکہ متضاد باتیں دیکھیں۔ گھر میں بدنظمی۔ بدمزہ کھانا۔ معمولی چائے۔ نہ وہ حلیہ جو اس نے بیگم قربان کا بتایا تھا۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ بیگم قربان کے اپنے شوہر سے خواہ کتنے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں وہ ایک اجنبی سے مدد کی اپیل کیوں کرتیں۔ اگر واقعی انہیں جان کا خطرہ ہوتا تو جیل میں رہتے ہوئے بھی وہ لوگوں کو متوجہ کر سکتی تھیں۔"

اکبر۔ بیگم قربان کے روپ میں واقعی اکبر ہی تھا۔ ابھی تک حیرت سے جبران کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اب جبکہ تم بیگم قربان بنے ہوئے ہو۔" جبران نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تو اس کا لامحالہ یہ مطلب ہے کہ بیگم قربان غائب ہو چکی ہیں۔ کیا وہ گلاب کی نئی کیاری کے نیچے آرام تو نہیں کر رہی ہیں۔"

"آپ۔۔۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں۔"

"یقینی طور پر نہیں۔ میرا اندازہ تھا"

"آپ کا اندازہ درست ہے۔" اکبر نے کچھ سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ تو آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ قربان بیگ بہت شکی مزاج رکھتا ہے میرا خیال ہے کہ بیگم صاحبہ اس کے روز روز کے طعنے اور کڑوی کسیلی باتیں سن کر ہی جیلر کی جانب متوجہ ہوئی ہوں گی۔ میں نے ایک دو مرتبہ نثار احمد کو پچھلے دروازے سے بنگلے میں آتے جاتے دیکھا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے درمیان کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو۔ کم سے کم بیگم صاحبہ کی حد تک۔ کیونکہ میں نے ان دونوں کو کبھی ایک دوسرے کے ساتھ کسی قابلِ اعتراض حالت میں نہیں دیکھا۔ مگر خدا جانے قربان بیگ کو کس طرح نثار احمد کی آمد و رفت کا پتہ چل گیا۔ تین تاریخ کی صبح کو میں بنگلے پہنچا تو دونوں میاں بیوی میں لڑائی ہو رہی تھی۔ قربان بیگ بے حد غصہ میں تھا۔ بُری طرح چیخ چلا رہا تھا۔ وہ اپنے جھگڑے میں اتنے مصروف تھے کہ میری آمد بھی محسوس نہیں کی۔ پتہ نہیں بیگم صاحبہ نے اس کی کسی بات کا کیا جواب دیا کہ اس نے غصہ میں اپنے کوٹ کی جیب سے سائیلنسر لگا ریوالور نکالا اور بیگم صاحبہ کو شوٹ کر دیا۔ اسی وقت اس کی نگاہ مجھ پر پڑی اور اس نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے اپنی زبان سے ایک حرف بھی نکالا تو وہ مجھے بھی ختم کر دے گا۔ غالباً میرے فائل سے اسے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ میں کسی زمانے میں اسٹیج پر زنانے کردار بھی ادا کرتا رہا ہوں اس لئے اس نے مجھے مجبور کیا کہ میں اس کی بیگم کا بہروپ اختیار کر لوں۔ اس طرح قتل کی واردات میرے فرار کی داستان میں چھپ جائے گی۔ کچھ روز کے بعد وہ علاج کے بہانے مجھے جیل سے باہر لے جا کر آزاد کر دے گا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ اس وعدے پر عمل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ دنیا میں ایک میں ہی اس کے جرم کا شاہد ہوں۔ بھلا وہ مجھے زندہ کیوں چھوڑے گا۔ جب اس نے کل مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا خیال ظاہر کیا تو میں ڈر گیا۔ پھر آج صبح اس نے بتایا کہ مرکزی حکومت کا کوئی آفیسر کھانے پر آ رہا ہے۔ میرے لئے اپنی جان بچانے کا یہ آخری موقع تھا۔ چنانچہ آپ سے مدد کی درخواست کرنے کے علاوہ میرے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔"

"میں تمہیں اس کے ہاتھ سے بچا سکتا ہوں" جبران نے کہا۔ "بشرطیکہ تم میرے چند سوالات کا جواب پوری دیانتداری سے دینے کے لئے آمادہ ہو۔"

"کیسے سوالات۔" اکبر نے چونک کر جبران کی طرف دیکھا۔

"مثلاً یہ کہ تم نے ہیرے طیارے میں کس جگہ چھپائے ہیں؟" جبران نے بڑے سرسری لہجے میں کہا۔

"ہیرے۔" اکبر اچھل پڑا۔ "کیسے ہیرے۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ اگر وہ ہیرے نہیں تھے تو پھر کیا چیز تھی۔"

"یقین کیجئے مجھے کچھ معلوم نہیں۔" اکبر نے جواب دیا۔ "البتہ میں نے ایک پیکٹ طیارے کی ایک سیٹ کے کور میں ضرور چھپایا ہے" وہ رک گیا۔ پھر ایک گہری سانس لی۔ "معلوم ہوتا ہے آپ بہت کچھ

جانتے ہیں اس لئے مجھے اپنی داستان شروع سے سنانا پڑے گی۔"

"بات کو طول دینے کی ضرورت نہیں ہے۔" جبران اپنی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے بولا "جو کچھ کہنا چاہتے ہو مختصر طور پر کہو۔"

"تقریباً ایک سال پہلے کی بات ہے کہ مجھے ایک فون کال ملی" اکبر نے کہنا شروع کیا۔ "میں نرسری کا کاروبار کرتا تھا مگر اس میں مجھے سراسر نقصان ہو رہا تھا اور مالی پریشانیاں اتنی بڑھ چکی تھیں کہ میں کاروبار بند کر کے قرض خواہوں سے جان بچا کر کہیں بھاگنے پر غور کر رہا تھا۔ بولنے والا کوئی مرد تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ میرے مالی معاملات سے واقف ہے اور مجھ سے ہمدردی رکھنے کی بنا پر میری مدد کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ میں ایک ناپسندیدہ اسٹیج اداکار رہ چکا ہوں۔ اگر میں اُس کے کہنے پر عمل کروں تو ہر دوسرے ماہ مجھے پانچ ہزار روپیہ کی آمدنی ہو سکتی ہے۔ کام صرف اتنا تھا کہ میں یورپ کے کسی بڑے شہر کا سفر کروں۔ وہاں کوئی آدمی مجھے ایک چھوٹا سا پیکٹ دے گا وہ میں واپسی میں اپنی سیٹ کا کور اُدھیڑ کر اُس کے اندر چھپا دوں اور ادھڑی ہوئی جگہ کو ٹیپ سے بند کر دوں اس طرح کہ بظاہر کوئی بات نظر نہ آئے۔ پھر ہوائی جہاز سے اُتر کر ایک خاص فون پر اُس سیٹ کا نمبر بتلا دوں اور بس۔ ایسے سفر مجھے تقریباً ہر دو ماہ بعد کرنا پڑیں گے جس کے معاوضے میں پانچ ہزار روپیہ میرے بینک اکاؤنٹ میں جمع کرائے جاتے رہیں گے، جو بظاہر ایک فرضی گاہک کی جانب سے ایک فرضی آرڈر کی تکمیل کے سلسلے میں ہوں گے۔ مجھے احساس تھا کہ اس طرح مجھ سے کوئی غیر قانونی کام لیا جا رہا ہے لیکن چونکہ میرے حالات بہت ناگفتہ بہ تھے۔ پھر مجھے اُس کی تفصیل کا کوئی علم نہیں تھا اس لئے میں آمادہ ہو گیا۔"

"تم صرف سیٹ نمبر سے اطلاع دیتے تھے۔؟"

"جی نہیں، اس نمبر میں طیارے کی فلائٹ کا نمبر بھی شامل ہوتا تھا۔"

"اِس بار تم گرفتار ہو گئے۔ اس کا مطلب ہے کہ ابھی تک تم نے فون نہیں کیا ہو گا۔"

"جی ہاں۔"

"کیا اس آدمی نے کسی اور طرح تم سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔؟"

"وہ کوشش کرتا بھی تو کیا ہوتا۔" اکبر نے جواب دیا۔ "مجھے سختی سے ہدایت تھی کہ میں وہ فون نمبر یا سیٹ نمبر کسی کو نہ بتاؤں ورنہ مجھے قتل کر دیا جائے گا۔ یہ خوف نہ ہوتا تب بھی میں اپنی سلامتی کی خاطر یہ راز کسی اور کو کیسے بتا سکتا تھا۔"

"اب تمہارا کیا پروگرام ہے۔ جیل سے فرار ہونا چاہتے ہو۔؟"

"وہ قتل مجھ سے ارادتاً نہیں ہوا۔ میں اُس کے ہاتھ سے چاقو چھیننا چاہتا تھا۔ اگر طیارہ نیچے نہ اترتا تو یہ حادثہ کبھی پیش نہ آتا۔ یوں بھی اپنی جان کی حفاظت کا عذر موجود ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اپیل میں عدالتِ بالا مجھے رہا کر دے گی۔ میں بھاگ کر اپنی آزادی کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا مگر دوسری طرف یہ پریشانی بھی ہے کہ مجھے بہرحال اس نمبر پر فون کرنا ہے ورنہ ہو سکتا ہے کہ وہ شخص میرا دشمن بن جائے یا پھر آمدنی کا یہ ذریعہ ہی ہاتھ سے جاتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔"

"تم ایک بین الاقوامی اسمگلر گروہ کے آلہ کار بن گئے ہو۔" جبران نے سوچتے ہوئے کہا۔ "جلد یا بدیر یہ لوگ پکڑے جائیں گے۔ تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ اُن کا ساتھ چھوڑ دو۔ تمہیں اُن کے بارے میں کوئی خاص بات معلوم نہیں ہے اِس لئے اگر تم اس شہر سے کہیں اور چلے جاؤ تو مجھے اُمید نہیں کہ وہ تمہارے پیچھے پڑیں گے۔ کیونکہ وہ بہرحال یہ بھی جانتے ہیں کہ تم اپنے آپ کو پھنسوائے بغیر اُن کے خلاف زبان نہیں کھول سکتے۔ اب تک تم نے پچیس تیس ہزار روپیہ ضرور جمع کر لیا ہو گا وہ کسی چھوٹے سے شہر میں نئے سرے سے کاروبار شروع کرنے کے لئے کافی ہو گا۔ جہاں تک تمہاری موجودہ مشکل کا تعلق ہے تمہیں اِس سے نکالنے کا میں ذمہ لیتا ہوں۔"

اکبر کچھ دیر تک خاموشی سے سوچتا رہا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں" وہ بولا "لیکن آپ حکومت کے ایک ذمہ دار افسر ہیں میری مدد کر سکتے ہیں۔"

"میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہے ہو۔" جبران مسکرایا "میری خدمات عارضی طور پر اُس شخص نے تمہاری تلاش کے لئے حاصل کی تھیں جسے تم فون کیا کرتے تھے۔"

"پھر آپ کون ہیں؟" اکبر نے حیرت سے پوچھا۔

"میرا نام جبران ہے۔"

"جبران" اکبر چونکا "وہ جبران تو نہیں جو ..."

"میری بات غور سے سنو۔" جبران نے اُسے فقرہ مکمل کرنے کا موقع نہیں دیا۔ "کل قربان بیگ تمہیں اپنی بیوی کے روپ میں ڈاکٹر کو دکھانے کے بہانے جیل سے باہر لے جائے گا۔ اُس کا منصوبہ جو کچھ بھی ہو میں اُس کے استقبال کے لئے موجود رہوں گا۔ تم موقع پاتے

ہی بھاگ نکلو گے۔ راستے میں کسی فون بوتھ پر رک کر اس نمبر پر فون بھی کر دینا اس کے بعد سیدھے جیل واپس آنا۔ جیلر نثار احمد کو تمام حالات بتا دینا۔ کہہ دینا کہ جب قربان بیگ نے تمہیں جیل سے باہر لے جا کر جان سے مارنے کی کوشش کی تو تم اس سے بچ کر نکل آئے۔ میرا ذکر درمیان میں مت لانا۔ مجھے یقین ہے کہ قربان بیگ کی گرفتاری کے بعد اس کارنامے کے انعام میں تمہیں بغیر اپیل کے ہی رہا کر دیا جائے گا۔"

★

دوسرے دن نو تاریخ تھی۔ جبران گیارہ بجے کے قریب یونیک ٹریڈرز کے آفس پہنچ گیا۔ اس مرتبہ اس نے سردار علی کے کمرے تک پہنچنے کے لئے سیکریٹری کا رابطہ ضروری نہیں سمجھا۔ سیدھا اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"مجھے توقع ہے کہ اب تک تمہارے آدمیوں نے یہ اطلاع پہنچا دی ہوگی کہ میں تمہارے مطلوبہ آدمی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔" اس نے بڑے آرام سے ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں مجھے خبر مل چکی ہے۔" سردار علی نے میز کی ایک دراز سے بھاری سا لفافہ نکال کر جبران کے سامنے ڈالتے ہوئے کہا۔ "تم نے بڑی ذہانت سے کام لیا۔ بھلا کسے خیال آسکتا تھا کہ اکبر بیگم قربان کے روپ میں چھپا بیٹھا ہوگا۔ یہ رہا تمہارا باقی معاوضہ۔ لیکن اگر تم چاہو تو میں دس ہزار ماہانہ پر مستقل طور پر تمہاری خدمات حاصل کرنے کے لئے تیار ہوں مجھے تم جیسے ہوشیار اور ذہین آدمی کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔"

"شکریہ۔" جبران نے پیکٹ اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔ "مگر میں کسی کا پابند ہونا گوارہ نہیں کرتا۔"

"تمہاری مرضی۔" سردار علی نے کندھے اچکائے۔ "دس ہزار کی مستقل آمدنی کم نہیں ہوتی۔"

"تم دس ہزار کی بات کر رہے ہو۔" جبران مسکرایا۔ "مجھے اسی کیس سے کئی لاکھ کی آمدنی ہونے کی توقع ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"اگر تم نے رازداری سے کام نہ لیا ہوتا تو شاید میں اس معاملے پر سر نہ کھپاتا لیکن تمہاری خاموشی نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ آخر ایک تم جیسے آدمی کو اکبر سے ایسی کیا دلچسپی ہو سکتی ہے کہ اس کے لئے پچیس ہزار خرچ کرنے پر آمادہ ہو۔"

"پھر کچھ سمجھ میں آیا۔"

"کیوں نہیں۔ کل شام میں نے تین چار گھنٹے کا وقت نیشنل ایرلائنز کے ہیڈ آفس میں مختلف لوگوں سے معلومات حاصل کرنے میں گزارا میرے سوالات اس نوعیت کے نہیں تھے کہ انہیں جواب دینے میں تامل ہوتا۔ خاص طور پر اس صورت میں جبکہ میں ایک ناول لکھ رہا ہوں جس میں ہوائی جہازوں کا ذکر ہے۔"

"تم ناول لکھ رہے ہو۔"

"تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے۔" جبران نے سگریٹ سلگاتے ہوئے جواب دیا۔ "بہرحال مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ بڑی دلچسپ ہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ جو طیارے بیرونی ملکوں کی پرواز پر جاتے ہیں ایک خاص مدت گزرنے کے بعد انہیں تفصیلی چیکنگ اور ضروری مرمت یا اوور ہالنگ کے بعد امتحانی طور پر ایک دو ملکی پروازوں میں استعمال کیا جاتا ہے اور پھر بیرونی ملکوں کے لئے اڑنے کی اجازت دی جاتی ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا۔"

"بہت کچھ۔" جبران معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "اگر نیشنل ایرلائنز کے ہیڈ کوارٹر میں میرا کوئی آدمی ہو اور مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ اب فلاں فلائٹ کے بعد طیارہ چیکنگ کے لئے روکا جانے والا ہے تو میں اپنے کسی کارکن کو اس سے قبل والی پرواز پر کسی ملکی شہر روانہ کر دوں گا۔ وہاں میرا ایک اور کارکن اس شخص کو کوئی قیمتی چیز مثلاً ہیرے دیدے گا۔ وہ شخص اس آخری فلائٹ سے واپس آتے ہوئے ہیروں کا چھوٹا سا پیکٹ طیارے کی کسی نشست میں چھپا دے گا تاکہ کسٹم والوں کا کوئی خطرہ نہ رہے۔ پھر جب وہ طیارہ چیکنگ کے بعد کسی ملکی پرواز پر روانہ ہوگا تو ہیڈ کوارٹر کے اسی آدمی کے ذریعہ مجھے اس کی اطلاع بھی مل جائے گی۔ میرا ایک اور کارکن اس فلائٹ میں وہی سیٹ بک کرائے گا۔ (یہ کام بھی بآسانی ہو سکتا ہے) جس میں ہیروں کا پیکٹ پوشیدہ ہے اور پرواز کے دوران بڑی آسانی سے پیکٹ حاصل کر کے طیارے کی اگلی منزل پر اتر جائے گا۔ ملکی پروازوں میں مسافروں کی تلاشی نہیں لی جاتی۔ اس طرح میں ایک بھاری رقم کے ہیرے یا ایسی کوئی اور قیمتی چیز اسمگل کر کے لانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

"تم واقعی ناول لکھنے لگو تو بہت کامیاب رہو گے۔" سردار علی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تمہارا دماغ بے تکی باتیں سوچنے میں لاجواب معلوم ہوتا ہے۔"

"سنتے جاؤ۔" جبران نے اپنی بات جاری رکھی۔ "یہاں تک

سوچنے کے بعد میں نے اکبر کے معاملے پر غور کیا۔ وہ ایمسٹرڈم سے آرہا تھا چنانچہ ہیروں کا امکان رد نہیں کیا جاسکتا۔ اس فلائٹ کا نمبر ۲۰۷ تھا۔ میں نے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ واقعی کل دس تاریخ کو فلائٹ نمبر ۲۰۷ فیض آباد سے بڈنور روانہ ہو رہی ہے۔ اُس کی گزشتہ بیرونی پروازوں کے مسافروں کی فہرست یا اُن کے سیٹ نمبر معلوم کرنا بھی کوئی خاص دشوار مسئلہ ثابت نہیں ہوا۔ اور میں نے فیصلہ کرلیا کہ قسمت آزمائی میں کیا نقصان ہے۔ اگر سیٹ نمبر ۳۴ سے ہیروں کا پیکٹ مل جاتا ہے تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔

سردار علی بڑھتے ہوئے غصّہ کو دبانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ اگرچہ اُس کے پھولے ہوئے چہرے پر سُرخی بڑھتی جارہی تھی مگر جب وہ بولا تو آواز بالکل سپاٹ تھی۔

"تم احمق ہو۔ اکبر کو اس پرواز سے سفر کئے تین چار ماہ گزر چکے ہیں اور اس درمیان یہ فلائٹ دو تین مُلکی پروازوں پر روانہ ہو چکی ہے۔ اگر تمہارا خیال دُرست بھی ہو تب بھی وہ پیکٹ اب تک کیسے موجود رہ سکتا ہے۔" "جب تک اکبر سیٹ نمبر نہ بتائے کوئی اس پیکٹ کو نہیں نکال سکتا۔" جبران نے جواب دیا۔ "تمہیں اکبر کی تلاش اسی لئے تھی۔ مجھے اُمید ہے کہ اُس نے واپس جیل جانے سے قبل اتنی مُہلت ضرور نکال لی ہو گی کہ تمہیں کسی خاص نمبر پر فون کرکے سیٹ نمبر سے مطلع کرسکے۔"

"تم اپنا وقت بھی ضائع کروگے اور روپیہ بھی۔" سردار علی نے بظاہر بڑی لاپرواہی سے کہا۔ "میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ مجھے اکبر کی تلاش کسی دوسرے ہی مقصد سے تھی۔"

"ممکن ہے۔" جبران کھڑا ہو گیا۔ "بہرحال میں کل ٹھیک ایک بجے دن یہاں سے بڈنور روانہ ہو رہا ہوں۔" وہ دروازے تک پہونچکر رُکا۔ "سیٹ نمبر ۳۴ بک کرانے کی کوشش مت کرنا۔ وہ میں نے پہلے ہی ریزرو کرالی ہے۔ خدا حافظ۔"

جبران ابھی بیرونی آفس سے نکلا ہی تھا کہ سردار علی کی سیکریٹری تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی۔ "آپ نے اُسے اتنی آسانی سے نکل جانے دیا۔" وہ بولی۔ "میں انٹرکام پر تمام گفتگو سُن چکی ہوں۔"

"اُسے روکنے کی کوشش نامناسب ہوتی۔" سردار علی نے جواب دیا "اِس طرح اُسے یقین ہو جاتا کہ اس کے اندازے بالکل دُرست ہیں۔ اب تو اس بات کا کسی حد تک امکان ہے کہ وہ میرے رویّہ کو دیکھ کر یہ سفر ہی نہ کرے۔" "اور اگر ایسا نہ ہوا تو وہ تین لاکھ کے ہیرے لے کر اُڑ جائے گا۔"

"نہیں۔ میں نے اس کا علاج بھی سوچ لیا ہے۔" سردار علی نے اطمینان سے کہا۔ "تم ابھی ایرپورٹ فون کرکے فلائٹ نمبر ۲۰۷ پر دو سیٹیں بک کرالو۔ پھر دلاور اور رمضان کو ہدایت کردو کہ انہیں اسی طیّارے سے بڈنور تک جانا ہے۔ اُنہیں جبران کا فوٹو دکھادینا جبران میک اپ کا ماہر ہے۔ ممکن ہے وہ کوئی ایسا بہروپ اختیار کرکے آئے کہ اُسے شناخت کرنا مشکل ہو اس لئے وہ سیٹ نمبر چونتیس پر نگاہ رکھیں۔ اس سیٹ پر بیٹھا ہوا جو بھی مسافر بڈنور یا کسی اور ہوائی اڈّے پر اُترے وہ اُسے پکڑ کر میرے پاس لے آئیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ جبران کا بچہ کس طرح ہیرے لے جانے میں کامیاب ہوتا ہے۔"

★

فلائٹ نمبر ۲۰۷ ٹھیک وقت پر بڈنور پہونچ گئی۔ مسافر باہر نکلے تو اُن میں ایک کبڑا آدمی بھی تھا جس نے قیمتی سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ بظاہر وہ کچھ گھبرایا ہوا سا نظر آرہا تھا۔ اُس کے پاس ایک سفری بیگ بھی تھا جسے کندھے پر لٹکانے یا ہاتھ میں پکڑنے کے بجائے اُس نے بغل میں دبا رکھا تھا۔ وہ بار بار یوں چاروں طرف دیکھنے لگتا جیسے یا تو اُسے کسی کی تلاش ہو یا پھر وہ کسی کی نظروں سے چھپنا چاہتا ہو۔ سردار علی کے کارکن دلاور اور رمضان جو تمام راستے اُس پر نگاہ رکھے ہوئے آئے تھے۔ اُن کے علاوہ ایک عُمر رسیدہ شخص بھی تھا جو بظاہر اُن تینوں سے غیر متعلق تھا مگر گاہے گاہے اُس کی دزدیدہ نظریں کبھی کبڑے کی جانب اور کبھی دلاور اور رمضان کی طرف اُٹھ جاتی تھیں۔

کبڑا ابھی ایرپورٹ سے باہر ہی نکلا تھا کہ دلاور اور رمضان نے آگے بڑھ کر اسے دائیں بائیں سے گھیر لیا۔

"میری جیب میں ریوالور رکھا ہے جس کی نال تمہاری جانب اُٹھی ہوئی ہے۔" دلاور نے دبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "چپ چاپ ہمارے ساتھ چلے آؤ۔ ورنہ ہم نتائج کی پرواہ کئے بغیر گولی چلادیں گے۔"

"مگر۔۔ مگر۔۔ میرا قصور" کبڑا خوفزدہ انداز میں ہکلایا۔

"یہ ہم کچھ نہیں جانتے۔" رمضان بولا۔ "باس کا حکم ہے کہ تمہیں جہاز سے اُترتے ہی بہ حفاظت اُن کے پاس پہونچا دیا جائے۔"

"باس کون۔"

"تم اچھی طرح جانتے ہو جبران کہ باس سے ہماری مُراد کس سے ہے۔"

"جبران۔" کبڑے نے چونک کر دلاور کی طرف دیکھا۔ "مگر میرا نام جبران نہیں ہے۔"

"یہ سب کچھ تم باس سے کہنا۔"

دلاور نے ایک ٹیکسی میں پہلے کبڑے کو بٹھایا اور پھر خود اُس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ رمضان نے اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ڈرائیور کو ریلوے اسٹیشن چلنے کی ہدایت کی۔ عمر رسیدہ مسافر جو ایرپورٹ کے گیٹ پر یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے ایک جانب

روانہ ہوگیا۔

★

سردار علی کو دلاور نے ٹرنک کال کے ذریعے اپنی مہم کی کامیابی کی اطلاع دے دی تھی اور وہ اِس وقت بڑی بیتابی کے ساتھ ان تینوں کی آمد کا منتظر تھا۔ ٹھیک دس بجے اُس کے دفتر کا دروازہ کھلا اور دلاور اور رمضان کبڑے کو تقریباً دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

"یہ لیجئے باس آپ کا شکار۔" دلاور فخریہ لہجے میں بولا "سیکریٹری صاحبہ نے تو ہمیں جبران سے ڈرانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی تھی۔ مگر یہ آدمی تو بالکل چوہا ثابت ہوا۔"

سردار علی بڑے غور سے کبڑے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"بھیس تو تم نے خوب بدلا ہے جبران" اُس نے کہا "مگر تم نے دیکھ لیا کہ اپنی تمام تر چالاکی و ذہانت کے باوجود تم میرے ہاتھ سے بچ کر نہیں نکل سکے۔ بہرحال میری پیشکش اب بھی موجود ہے۔ وہ پیکٹ میرے حوالے کردو۔ میں تمہیں اب بھی دس ہزار روپیہ ماہانہ دینے کو تیار ہوں۔"

"کون۔۔۔ کونسا پیکٹ جناب۔" کبڑا بہت حیران تھا۔

"وہی جو تم نے سیٹ نمبر چونتیس سے نکالا ہے۔"

"میں سیٹ نمبر چونتیس پر بیٹھا ضرور تھا مگر میں نے وہاں سے کوئی پیکٹ نہیں نکالا۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔" سردار علی آنکھیں نکالتے ہوئے بولا اور دلاور کی طرف گھوما۔ "تم نے اُس کے بیگ کی تلاشی لی تھی۔؟"

"جی نہیں۔ ہمیں ایسی کوئی ہدایت نہیں تھی۔"

"تو اب میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ بیگ کھول کر اُس کی تلاشی لو۔"

دلاور نے جلدی سے کبڑے کی بغل میں دبا ہوا سفری بیگ ایک جھٹکے سے چھین کر اُس کی زپ کھول دی۔ پھر اُس کی تمام چیزیں سردار علی کے سامنے میز پر اُلٹ دیں۔ ایک سگریٹ کیس، ایک لائٹر۔ دو تین کتابوں اور ایک رومال کے علاوہ بیگ میں کوئی شے نہیں تھی۔ خاص طور پہ کوئی پیکٹ تو ہرگز نہیں تھا۔ اچھی طرح اطمینان کر لینے کے بعد سردار علی غصے میں کھولتے ہوئے دلاور کی جانب متوجہ ہوا۔

"تم نے ضرور راستے میں غفلت برتی ہوگی۔" وہ دہاڑا۔ "اور اس نے موقع پاکر پیکٹ کسی کے حوالے کردیا۔"

"ہرگز نہیں باس۔ یہ طیارے میں سوار ہونے کے بعد سے اب تک ہماری نظروں کے سامنے رہا ہے" دلاور جلدی سے بولا۔

"پھر پیکٹ کہاں گیا۔؟"

"میں کہہ رہا ہوں جناب کہ میرے پاس کوئی پیکٹ نہیں تھا" کبڑے نے سردار علی کے غصے سے ڈر کر ہاتھ جوڑ دیئے۔ "اور نہ میرا نام جبران ہے۔ میں ایک فقیر ہوں اور کیفے گلزار کے پاس والی گلی میں بھیک مانگ کر اپنا پیٹ پالتا ہوں۔ کل ایک صاحب نے مجھے سو روپے دیئے اور یہ سوٹ دے کر ہوائی جہاز پر سوار کرادیا۔ انہوں نے کہا تھا کہ چونکہ مجھے ہوائی جہاز میں بیٹھنے کا بہت شوق ہے اِس لئے وہ میرا شوق پورا کرنا چاہتے ہیں۔ بڈنور اُتر کر میں ریل سے واپس چلا آؤں۔"

سردار علی حیرت کے عالم میں کبڑے کو گھورتا ہی رہا تھا کہ میز پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ اُس نے ناگواری سے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اُٹھا لیا۔

"ہیلو۔" وہ بولا۔ "کون ہے۔؟"

"تمہارا مخلص جبران۔" آواز آئی۔ "مجھے اُمید ہے کہ اب تک تم نے اس بیگناہ کبڑے کی حقیقت جان کر اُسے چھوڑ دیا ہوگا۔"

سردار علی کے منہ سے ایک گہری سانس نکل گئی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اس بازی میں جبران سے ہار گیا تھا۔

"تم میری توقع سے کہیں زیادہ چالاک ہو جبران" وہ سنبھل کر بولا۔ "کیا تم پیکٹ پانے میں کامیاب ہوگئے۔؟"

"ظاہر ہے۔"

"مگر کس طرح۔ سیٹ نمبر چونتیس پہ وہ کبڑا بیٹھا تھا اور میرے آدمی قسم کھاتے ہیں کہ۔۔۔"

"یہی تمہاری غلطی تھی سردار علی" جبران نے بات کاٹ دی "ذرا یاد کر کے بتاؤ کہ اکبر نے تمہیں فون پر کس سیٹ کا نمبر بتایا تھا"

"چونتیس۔۔۔" سردار علی کہتے کہتے رک گیا۔

"اب سمجھے۔" جبران چہکا "اکبر نے سیٹ نمبر چونتیس نہیں تینتالیس پر سفر کیا تھا پیکٹ اسی میں پوشیدہ تھا۔ نمبر چونتیس میں نے اپنی گفتگو میں استعمال کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ تم نے میرے جاتے ہی اپنی سیکریٹری یا اپنے آدمیوں کو ہدایات جاری کی ہوں گی اور اس وقت تمہارے ذہن میں میرا بتایا ہوا نمبر تازہ تھا۔ مجھے امید ہے کہ اس وضاحت کے بعد تمہارے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہوگا کہ اُس وقت جبکہ تمہارے آدمی سیٹ نمبر چونتیس اور اُس کے مسافر کی طرف متوجہ تھے۔ میں سیٹ نمبر تینتالیس پر بیٹھا ہوا اپنا کام کر رہا تھا۔"

سردار علی نے پھر ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"تم جیت گئے جبران" اُس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "وہ پیکٹ مجھے واپس کردو۔ میں تمہیں اس کے لئے پچاس ہزار روپیہ تک دے سکتا ہوں۔"

گلزار

اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا جیب سے ایک سگریٹ نکال کر جلائی۔ دو تین کش لئے اور ڈھیر سارا دھواں اپنے پھیپھڑوں میں اتار لیا۔ گہرے کثیف اور تلخ دھوئیں نے اس وقت اُسے بہت سکون پہنچایا۔ ایسا لگا جیسے جسم ایکدم ہلکا ہو گیا ہے۔ ذہن کی تنی ہوئی

طنابیں ڈھیلی ہوگئی ہیں اور ایک فرحت افزا لہر رگ و ریشے میں دوڑتی چلی جارہی ہے۔ یہ اعصابی تناؤ اور ذہنی خلجان کئی روز سے اسے گھیرے ہوئے تھا۔ لیکن اب جبکہ وہ سیٹھ سلیمان کو قتل کر چکا تھا تو یہ الجھن بھی ختم ہوگئی تھی اور وہ اس طرح خوش ہوگیا تھا جیسے کوئی طالب علم امتحان میں کامیابی کی خبر سُن کر خوش ہو جاتا ہے۔

کوئی جلدی نہیں تھی کوئی اضطراب نہیں تھا۔ کوئی خوف بھی نہیں تھا۔ نہ پولیس کا نہ قانون کا۔ وہ جانتا تھا پولیس اسے کبھی گرفتار نہیں کر سکے گی۔ اور قانون کبھی یہ نہیں جان سکے گا کہ سیٹھ سلیمان کو کس نے قتل کیا ہے۔ کیونکہ اس کا سیٹھ سلیمان سے کوئی تعلق، شناسائی۔ یا رشتہ داری نہیں تھی۔ وہ جب بنگلے میں داخل ہوا تھا تو اسے کسی نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ لہٰذا پولیس اس کے متعلق کبھی کچھ نہیں جان سکے گی۔ وہ

لوگ زیادہ سے زیادہ ان لوگوں کے بارے میں چھان بین کریں گے جو کسی نہ کسی طور پر سیٹھ سلیمان سے کسی قسم کا ربط رکھتے ہیں۔ گلزار کے متعلق، پولیس کے فرشتوں کو بھی گمان نہیں ہو سکے گا۔ یہ سوچ کر وہ مسکرایا عجیب سی استہزائی ہنسی تھی۔ پھر اس نے جیب سے ڈبیہ نکالی۔ ایک اور سگریٹ جلائی گولڈ لیف کے سگریٹ کتنے فرحت بخش اور لطیف ہوتے ہیں۔ یہ اُسے معلوم نہیں تھا کیونکہ دو ماہ پہلے تک وہ گولڈ لیف سگریٹ پینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت تو اسے ریڈ لیمپ کا سگریٹ بھی مشکل سے دستیاب ہوتا تھا جیب میں پیسہ نہ ہو تن پر کپڑے نہ ہوں اور پیٹ میں کھانا نہ ہو تو آدمی عمدہ سگریٹ خریدنے کی نہیں سوچتا صرف دال روٹی کی بابت سوچتا ہے۔ اُس وقت دال روٹی کا حصول اس کے لئے ایک مسئلہ تھا۔ مگر اب صورت بدل چکی تھی۔ اب عمدہ کھانوں اور عمدہ کپڑوں کیساتھ وہ عمدہ سگریٹ بھی پیتا تھا۔ اس نے بڑے پیار سے گولڈ لیف کی سُرخ اور سفید ڈبیہ کو دیکھا۔ اور جیب میں رکھ لیا۔ پھر وہ سیٹھ سلیمان کو دیکھنے لگا۔

سیٹھ سلیمان کی لاش ان کے بیش قیمت پلنگ پر پڑی ہوئی تھی۔ خون سے سنہری ساٹن کا لحاف اور گدّا اور سفید چادر سُرخ ہو رہے تھے۔ اُن کا ایک ہاتھ اس طرح اُٹھا ہوا تھا جیسے رحم کی بھیک مانگ رہا ہو۔ آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں اور ان سے خوف جھانک رہا تھا سیٹھ سلیمان کی عمر پچاس سے اوپر تھی۔ سر بالکل گنجا تھا۔ رنگ گہرا سانولا اور چہرہ گول تھا۔ ہونٹوں پر بڑی بڑی مونچھیں تھیں جو شاید سیٹھ سلیمان نے زیادہ وجیہہ اور بارعب نظر آنے کے لئے رکھی ہوں گی لیکن یہ الگ بات ہے کہ وہ اور زیادہ بے وقوف نظر آتے تھے۔ سیٹھ سلیمان نے یکے بعد دیگرے تین شادیاں کی تھیں۔ اور تینوں بیویوں کو طلاق دیدی تھی اب وہ اس وسیع و عریض اور آراستہ و پیراستہ بنگلے میں ایک سیکریٹری، ایک ہاؤس کیپر اور ایک باورچن کے ساتھ رہتے تھے۔ دنیا کو پتہ ہو یا نہ ہو لیکن گلزار کو علم تھا کہ ان تینوں عورتوں سے سیٹھ سلیمان کا حقیقتاً کیا رشتہ تھا۔ یکایک وہ تلخی سے مسکرایا۔ "اب یہ رشتہ ٹوٹ چکا ہے سیٹھ سلیمان" اس نے آہستہ سے کہا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس وقت بنگلے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ سیکریٹری ہفتے کی چھٹی منانے اپنے گھر گئی ہوئی تھی۔ ہاؤس کیپر کو سیٹھ سلیمان نے خود ہی کسی کام سے قریبی شہر میں بھیجا ہوا تھا۔ اور اس کی واپسی دوسرے دن سے پہلے ممکن نہیں تھی۔ رہ گئی باورچن تو وہ روزانہ ہی دس بجے کام ختم کر کے اپنے گھر چلی جاتی تھی۔ یہ سب کچھ گلزار کو پہلے ہی سے معلوم تھا۔ اس نے گزشتہ پندرہ دن کی جد و جہد کے بعد معلومات حاصل کی تھیں۔ چنانچہ یہ جان لینے کے بعد کہ آج رات سیٹھ سلیمان گھر میں تنہا ہوں گے اس نے فوراً سیٹھ کو قتل کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کیونکہ اتنا عمدہ موقع پھر نہیں مل سکتا تھا۔ اگر یہ رات ہاتھ سے نکل جاتی تو پھر نہ جانے کب تک انتظار

سرورق کی دوسری کہانی

ش صغیر ادیب

کرنا پڑتا لہٰذا اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور سیٹھ سلیمان کو قتل کر دیا۔

چنانچہ سیٹھ سلیمان اب مر چکے تھے۔ جس وقت اس نے وار کیا تھا اس وقت وہ بے خبر سو رہے تھے۔ اس نے اتنی پھرتی صفائی اور مہارت سے وار کیا تھا کہ سیٹھ سلیمان کے حلق سے چیخ بھی نہیں نکل سکی تھی۔ وہ تڑپے بھی بہت کم تھے۔ اتنی جلدی اور آسانی سے مر گئے تھے کہ اسے تھوڑی سی مایوسی ہوئی تھی۔ جب زندگی اتنی حقیر۔ اور بے بضاعت اور بے وفا شے ہے تو پھر آدمی زندگی کے لئے اتنا مرتا کیوں ہے۔ کیوں اتنے جعل اور فریب کرتا ہے۔ کیوں بیشمار دل دکھاتا ہے کیوں ہر قسم کی کمینگی اور برائی پر کمربستہ رہتا ہے۔ سیٹھ سلیمان نے اس زندگی کے لئے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ سبھی کچھ تو کیا تھا۔ لیکن ان کی زندگی اتنی بے وفا اور بے مروّت نکلی کہ چشم زدن میں دامن بچا کر رخصت ہو گئی۔ اور وہ اسے نہ روک سکے۔ گلزار کرسی سے اٹھا۔ اگرچہ اس نے ایک قتل کیا تھا۔ ایک انتہائی ناپسندیدہ جرم کا ارتکاب کیا تھا لیکن اس پر کوئی گھبراہٹ یا اضطراب کی کیفیت طاری نہیں تھی۔

بڑے سکون سے وہ ایک ایک شے کا جائزہ لے رہا تھا۔ سیٹھ سلیمان واقعی بے حد دولتمند تھے۔ بنگلے کی ایک ایک شے سے ان کی امارت اور شان و شوکت ٹپک رہی تھی۔ ان کی مسہری بیحد قیمتی تھی۔ مسہری کے سرانے دائیں جانب ایک وزنی فولادی تجوری استادہ تھی۔ یقیناً اس تجوری کے اندر بے شمار دولت اور ہیرے جواہرات رکھے ہونگے۔ تجوری کے ساتھ ہی ایک الماری تھی۔ گلزار نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ الماری کے اندر متعدد بیش بہا نوادرات رکھے تھے جو سیٹھ سلیمان نے یقیناً بڑے شوق اور جستجو کے بعد جمع کئے ہوں گے۔ دیواروں پر کئی پینٹنگز آویزاں تھیں جو دنیا کے مشہور مصوّروں کی بنائی ہوئی تھیں اور بلاشبہ بہت قیمتی تھیں۔ گلزار کئی منٹ تک تصویروں کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبائی۔ مسہری کے سرانے رکھی۔ چھوٹی گول میز سے سیٹھ سلیمان کا سونے کا سگریٹ لائٹر اٹھایا۔ سگریٹ جلائی اور پھر باہر نکل آیا۔

دوسرا کمرہ ڈرائنگ روم تھا۔ مشرقی دیوار پر سیٹھ سلیمان کی ایک بڑی تصویر آویزاں تھی جس کا فریم سونے کا تھا۔ فرش پر بے حد دبیز قالین پڑا تھا۔ وسط میں چمڑے کا بیش قیمت صوفہ سیٹ رکھا تھا ایک کونے میں باقاعدہ بار بنا ہوا تھا۔ گلزار کاؤنٹر سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور شراب کی بوتلوں کو دیکھنے لگا۔ اسکاچ وہسکی۔ لندن جن۔ مارٹیل کونیک ڈارک فائر رم اور اسمرنوف واڈکا۔ یکایک وہ مسکرایا اور ہاتھ بڑھا کر کونیک کی بوتل اٹھائی۔ ایک بڑا پیگ بنایا اور حلق سے اتار لیا۔ تلخ شراب پیٹ میں پہنچی تو اس کا ذہن جھنجھنا اٹھا۔ اس نے دو تین بار آنکھیں ملیں کنپٹی پر انگلی پھیری اور پھر چمڑے کا وہ خوبصورت بٹوہ اٹھا لیا جو شاید سیٹھ سلیمان سونے سے پہلے کاؤنٹر پر ہی بھول گئے تھے۔ اس نے بٹوہ کھولا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ بٹوہ سو سو کے نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ پتہ نہیں کتنی رقم تھی۔ شاید دس ہزار، پندرہ ہزار یا بیس ہزار۔ اس نے کبھی سپنے میں بھی اتنا روپیہ یکمشت نہیں دیکھا تھا۔ کچھ دیر وہ حیرت اور شوق سے آنکھیں پھیلائے نوٹوں کو گھورتا رہا۔ پھر بٹوہ بند کر کے وہیں رکھ دیا جہاں سے اٹھایا تھا۔

اب وہ تیسرے کمرے میں داخل ہوا۔ یہ کمرہ سیٹھ سلیمان کے ملبوسات کا کمرہ تھا۔ چاروں طرف الماریاں سجی ہوئی تھیں۔ ان میں کپڑے بھرے ہوئے تھے۔ بے شمار قیمتی سوٹ، شیروانیاں، جیکٹ، قمیصیں۔ ٹائیاں اور جوتے۔ یہ سارے کپڑے غریبوں کے ایک پورے محلّے میں تقسیم ہو سکتے ہیں۔ گلزار نے تلخی سے سوچا اور دروازہ بند کر کے باہر نکل آیا۔ سب سے آخر میں وہ کچن میں گیا۔ کچن اتنا وسیع تھا کہ گلزار نے اتنا وسیع کچن پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک کونے میں الیکٹرک ککر لگا تھا۔ اس کے ساتھ ہی فریج تھا۔ پھر کپڑے دھونے اور سکھانے کی خودکار مشینیں لگی تھیں۔ شیشے کی الماریوں میں بیشمار قیمتی اور خوبصورت برتن سجے ہوئے تھے۔ ککر کے پاس ہی ایک اسٹینڈ پر تلے اوپر چھوٹی بڑی پتیلیاں رکھی تھیں۔ گلزار نے ایک پتیلی کا ڈھکن اٹھا کر دیکھا۔ نرگسی کوفتوں کی لذیذ اور اشتہا انگیز خوشبو اس کے نتھنوں میں گھستی چلی گئی۔ اسے بڑی بھوک لگ رہی تھی۔ چنانچہ اس نے چمچہ اٹھا کر چار یا پانچ کوفتے نکالے اور کھا گیا۔

یہ سب کچھ کتنا عجیب تھا۔ ہاں یہ سب کچھ بہت عجیب تھا۔ اسے یکایک ہنسی آئی۔ اس نے ایک قتل کیا ہے۔ پھر بھی وہ اس گھر میں اس طرح گھوم پھر رہا ہے جیسے یہ اس کا اپنا گھر ہو۔ اگر اچانک کوئی آ جائے اور اسے دیکھ لے تو ...... لیکن اسے کوئی نہیں دیکھے گا۔ یہ دولت مند لوگ کتنے بے وقوف ہوتے ہیں جان بوجھ کر سنسان علاقوں میں مکان بناتے ہیں۔ اور نہیں جانتے کہ کبھی کبھی یہ سناٹا ان کے لئے کتنا مضر ثابت ہوتا ہے۔ اس نے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور گھڑی پر نظر ڈالی۔ گاڑی چھوٹنے میں ابھی پون گھنٹہ باقی تھا۔ اور وہ اسٹیشن تک زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں پہنچ سکتا تھا۔ تو پھر اب وہ اس گھر میں کیا کر رہا ہے۔ اب یہاں اس کا کیا کام ہے۔ اب تو چلنا ہی چاہیے معاً اس نے طے کیا اور بتی بجھا دی۔ دروازہ احتیاط سے بند کیا اور عمارت سے

باہر نکل آیا۔

" خدا حافظ سیٹھ سلیمان ـــــ ! " وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔

سڑکوں پر کافی سناٹا پھیل چکا تھا۔ نصف رات کو سناٹا ہی ہونا چاہیئے۔ اس نے گرد وپیش کا جائزہ لیا اور اسٹیشن کی جانب چلنے لگا۔ فٹ پاتھوں پر اکا دکا لوگ چل رہے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے کاریں اور بسیں گزر رہی تھیں۔ کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا اور نہ کسی نے اسے سیٹھ سلیمان کے بنگلے سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے مطمئن ہوکر نائیلون کے باریک دستانے اتار کر جیب میں ٹھونس لئے اور قدم بہ قدم آگے بڑھتا رہا۔

موسم بہت اچھا تھا۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا یوں جھوم جھوم کر چل رہی تھی۔ جیسے کوئی حسینہ جوانی کے نشے میں چور ہو کر رقص کرتی ہے۔ بازاروں میں جلنے والی روشنیاں بہت بھلی لگ رہی تھیں ـــ آسمان پر ان گنت ستارے بکھرے ہوئے تھے اور ان کی ٹھنڈی روشنی دھرتی پر ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ فضا میں نہ جانے کہاں سے اتنی خوشبو آگئی تھی کہ اس کا انگ انگ مہک گیا تھا۔ اس نے یکایک پورا منہ کھولکر زور زور سے سانس لی اور پھر بے اختیار ہنس پڑا۔ ارے یہ دنیا اتنی حسین ہے اتنی دلفریب اور دلچسپ جگہ ہے یہ اُسے آج تک معلوم ہی نہ تھا۔ پتہ نہیں ابتک وہ کن اندھیروں میں رہا تھا۔ کہ ان روشنیوں پر اس کی نظر نہیں پڑی تھی۔ نہ جانے کس زندان میں قید رہا تھا کہ یہ ستارے اس نے نہیں دیکھے تھے۔ اس نے حیرت اور تاسف سے سوچا۔ پھر اس کی نگاہ سامنے سے آتی ہوئی ایک لڑکی پر جم گئی۔

بے حد حسین لڑکی تھی۔ اس نے گلابی رنگ کی ساری باندھ رکھی تھی۔ بالوں کا جوڑا بنا ہوا تھا۔ اس کا قد لمبا اور جسم چھریرا تھا۔ اور چلتے ہوئے یوں لچک رہا تھا جیسے بارِ گل سے گلاب کی ٹہنی لچک جاتی ہے اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ کالی تھیں۔ اور ان میں مے خانے آباد تھے۔ وہ پسندیدہ نظروں سے لڑکی کو دیکھتا رہا۔ جب وہ لڑکی اس کے قریب سے گزری تو اچانک اسے راحیلہ یاد آگئی ـــ راحیلہ اس لڑکی سے بھی کہیں زیادہ حسین تھی۔ اور بالکل اسی طرح ایسی ہی ایک رات کو ایسے ہی ایک فٹ پاتھ پر اسے ملی تھی۔ بالکل اچانک۔ فرق صرف اتنا تھا کہ آج کی طرح اس رات وہ خوش نہیں تھا۔ بلکہ تین دن کے فاقے سے تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے جسم پر بوسیدہ اور میلے کپڑے تھے اور نقاہت کے باعث قدم لڑکھڑا رہے تھے جب راحیلہ اس کی جانب دیکھ کر مسکرائی تھی تو وہ اس کے حُسن سے اس کے شباب کے بانکپن سے ذرا برابر متاثر نہیں ہوا تھا۔ بلکہ بے اختیار ہو کر اس نے سوچا تھا۔

" کاش یہ لڑکی مجھے کھانا کھلادے ـ "

" راحیلہ ـــ راحیلہ ـــ " اس نے بے اختیار ہو کر سوچا پتہ نہیں وہ کہاں ہے۔ پندرہ دن سے اس سے ملاقات نہیں ہوئی ہے اس نے کہا تھا کہ وہ بمبئی جارہی ہے۔ ممکن ہے اب واپس آگئی ہو اور کل اس سے ملاقات ہو۔ معاً گلزار نے آنکھیں بند کرلیں اور تصوّر میں راحیلہ کے بے مثال سراپا کو ہولے ہولے رقص کرتے ہوئے دیکھنے لگا اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے راحیلہ دھیرے دھیرے اس کے دل پر چل رہی ہے۔ اور وہ رنگ اور نور اور نکہت کے سمندر میں ڈوبتا جارہا ہے ڈوبتا ہی چلا جارہا ہے۔ لاانتہا گہرائیوں کی طرف۔ یہ تصور بڑا طربناک تھا۔ بڑا نشاط انگیز تھا اُسے نہیں معلوم تھا کہ کبھی کبھی ڈوبنا کتنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا بھی کیسے۔ اس نے اس سے پہلے کبھی کسی سے محبّت بھی تو نہیں کی تھی۔ راحیلہ پہلی لڑکی تھی جسے اس نے چاہا تھا۔ اور اس

پُراسرار تحریریں
شائع ہوگئی ہے
احبابِ ادب
۵-A-۸/۲ ناظم آباد کراچی

ڈاکٹر ایم اے قریشی
کی ایک اور کتاب
قدرتی شارٹ ہینڈ،
جس میں جبرائیل نے
حضرت آدم کو اماں حوّا
کا پتہ بتایا،
علمِ رمل پر ایک بھرپور
تحقیقی کتاب، قیمت ۵/-

طرح چاہا تھا کہ خود اپنی ہستی داؤ پر لگا دی تھی۔

لیکن ابھی اس کے اور راجیلہ کے درمیان بدستور ایک پتھر باقی تھا۔ تین پتھر اس نے ہٹا دیئے تھے۔ چوتھا ہٹنا باقی تھا جب تک چوتھا پتھر بھی نہیں ہٹ جاتا ہے تب تک اُسے راجیلہ نہیں مل سکتی ہے۔ تب تک وہ ترستا رہے گا اور تڑپتا رہے گا۔ اس وقت تک وہ راجیلہ سے مل سکتا ہے۔ اس سے باتیں کر سکتا ہے لیکن اُسے چھو نہیں سکتا ہے۔ باہوں میں لیکر چوم نہیں سکتا۔ یہ راجیلہ کی شرط تھی۔ اور ایک سچے، ایماندار اور صابر عاشق کی طرح اس نے طے کر لیا تھا کہ جب تک وہ چاروں پتھر اپنے اور راجیلہ کے درمیان سے ہٹا نہیں لے گا سچ مچ راجیلہ کو نہیں چھوئیگا۔

یوں ہی چلتے چلتے آخر کار وہ اسٹیشن پہنچ گیا۔ کانپور جانے والی گاڑی پلیٹ فارم پر تیار کھڑی تھی۔ اس نے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لیا اور گاڑی میں سوار ہو گیا۔ کچھ دیر بعد جب گاڑی شہر کی حدود سے نکل کر مضافات میں آئی تو اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک چھوٹی سی چرمی نوٹ بک نکالی اور دھیرے سے مسکرایا۔ پہلے صفحے پر چار نام لکھے تھے۔ سیٹھ موہن لال، پھول چند اگروال، سیٹھ سلیمان۔ اور کرنل آفتاب۔ سیٹھ موہن لال اور پھول چند اگروال کے سامنے سُرخ پنسل سے کراس کا نشان بنا ہوا تھا۔ وہ چند لمحے عجیب استہزائی نظروں سے چاروں ناموں کو گھورتا اور مسکراتا رہا۔ پھر جیب سے سُرخ پنسل نکالی سیٹھ سلیمان کے نام کے مقابل کراس کا نشان بنایا۔ نوٹ بک بند کر کے جیب میں رکھی سگریٹ نکال کر جلائی اور پھر پُرخیال انداز میں کھڑکی کے باہر دُور تک پھیلی ہوئی تاریکی میں گھورتا ہوا آہستہ سے بڑبڑایا۔

"تیسرا پتھر تو ہٹ گیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ چوتھا پتھر کہاں ہے؟"

☀

دوسرے دن شام کے اخبارات سیٹھ سلیمان کے قتل کی خبر اور تصویروں سے بھرے ہوئے تھے۔ اس نے تقریباً تمام ہی اخبارات خریدے تھے اور واردات کی پوری تفصیل اس طرح مزے لے لے کر پڑھی تھی جیسے کوئی دلچسپ رُومانی افسانہ پڑھ رہا ہو۔ خبر کے مطابق سیٹھ سلیمان کی لاش صبح اس وقت دریافت ہوئی تھی جب باورچی ان کے کمرے میں صبح کی چائے لیکر گئی تھی۔ اس وقت آٹھ بجے تھے۔ ساڑھے آٹھ بجے ایس پی ورما ناتھ بمعہ انسپکٹر نذیر کے جائے واردات پر پہنچ گیا۔ مختلف ماہرین کی ایک پوری فوج بھی ان کے ساتھ تھی۔ ورما ناتھ اور نذیر نے جائے واردات کے معائنے اور کیس کی تفتیش میں بڑی جانفشانی اور تندہی کا ثبوت دیا تھا۔ لیکن وہ ذرّہ برابر کامیابی بھی حاصل نہیں کر سکے تھے۔ انھیں گھر میں کوئی ایسا سُراغ نہیں مل سکا تھا جس سے قاتل کی شخصیت پر کوئی روشنی پڑتی ہو۔ پورے بنگلے میں کسی جگہ بھی انھیں انگلیوں کے یا کسی اور قسم کے نشانات بھی نہیں ملے تھے۔ جو خنجر انھیں سیٹھ سلیمان کے سینے میں پیوست ملا تھا۔ اس کے دستے پر بھی کوئی نشان نہیں تھا۔ لیکن بعض علامتیں ایسی ضرور ملی تھیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ کوئی شخص رات گھر میں موجود ضرور تھا۔ وہ شخص گولڈ فلیک کے سگریٹ پیتا تھا۔ اس نے سیٹھ سلیمان کے بار میں شراب پی تھی۔ پھر وہ شخص باورچیخانہ میں گیا تھا اور ہانڈی سے کچھ کھانا نکال کر کھایا تھا اور چمچہ اور پلیٹ دھوئے بغیر لاپرواہی سے میز پر ڈال دی تھی۔ نیز یہ کہ وہ شخص کریپ سول کے جوتے پہنتا ہے جس کے نشانات دروازے کے باہر والی گیلی زمین پر پلئے گئے تھے۔

"مگر سوال یہ ہے کہ وہ شخص آخر کون ہے۔؟"

ناکامی — مکمل ناکامی — گلزار کی توقع کے عین مطابق اسے یقین تھا کہ پولیس اِدھر اُدھر جھک مارتی رہے گی۔ بالکل اسی طرح جیسا سیٹھ موہن لال اور پھول چند اگروال کے سلسلے میں ہوا تھا جب اس نے ان دونوں کو قتل کیا تھا تو بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ گو پولیس نے بڑی سرگرمی دکھائی تھی اور ان دونوں کے قاتل یا قاتلوں کو پکڑنے کی پوری کوشش کی تھی بلکہ پھول چند اگروال کے قتل کے شبہے میں انھوں نے ایک شخص کو پکڑ بھی لیا تھا مگر وہ شخص قسمت کا بڑا دھنی تھا کہ آخر میں کسی نہ کسی طرح اس نے خود کو بے گناہ ثابت کر دیا تھا۔ ورنہ اس کے پھانسی پر چڑھ جانے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ بہر حال پولیس پھول چند اور موہن لال کے قاتل یا قاتلوں کو آج تک نہیں پکڑ سکی تھی۔ گلزار کو یقین تھا اس بار بھی ایسا ہی ہوگا۔ ایس پی ورما اور انسپکٹر نذیر ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے۔ مختلف لوگوں کے بیان لیں گے چند ایک لوگوں پر شبہ بھی کریں گے اور آخر میں تھک ہار کر بیٹھ جائیں گے۔ انھیں کبھی یہ نہیں معلوم ہو سکے گا کہ وہ شخص کون تھا جس نے سیٹھ سلیمان کے بنگلے میں چار یا پانچ نرگسی کوفتے کھائے تھے اور کونیک کا ایک بڑا پیگ پیا تھا۔

شام بڑی خوبصورت تھی۔ ابھی اندھیرا پوری طرح نہیں ہوا تھا۔ آسمان پر ڈوبتے سورج کی گہری سرخی ابھی باقی تھی۔ اس سرخی کے پیش منظر میں اڑتے ہوئے پرندے بہت بھلے لگ رہے تھے۔ گلزار نے سارے اخبار بغل میں دبا لئے اور ٹھنڈی سڑک کی طرف چل پڑا۔ بازاروں میں بڑی چہل پہل تھی۔ دفاتر کی چھٹی ہونے کے باعث کچھ زیادہ ہی ہجوم ہو گیا تھا لیکن گلزار ہر طرف سے بے نیاز ہو کر ٹھنڈی سڑک پر چلتا رہا۔

حتیٰ کہ کچھ دیر میں وہ میموریل ویل کے آہنی گیٹ پر پہنچ گیا۔ سڑکوں پر جتنی گہما گہمی تھی میموریل ویل میں اتنا ہی سکون تھا۔ بوڑھے برگدوں کی شاخوں میں پرندے اتر رہے تھے اور ان کی چہکار سے فضا میں ایک موسیقی ریز گونج رچی ہوئی تھی۔ گلزار نپے تلے قدموں سے روش پر چلتا رہا۔ وہ باغ کے ابتدائی حصے میں جہاں زیادہ چہل پہل تھی قطعاً نہیں رکا۔ چلتا ہوا عقبی حصے کی طرف چلا گیا۔ وہاں بالکل سناٹا تھا اور خاموشی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ باغ کے مغربی کونے میں پہنچ کر وہ یکایک رک گیا۔ اور ایک ٹک سامنے والی بینچ کو دیکھنے لگا۔ اس ویرانی میں۔ اس سناٹے میں اور اس خاموشی اور تنہائی میں اس بینچ پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اور وہ لڑکی راحیلہ تھی۔

راحیلہ کس کا نام تھا——؟

راحیلہ حسن کے اثبات کا نام تھا۔ راحیلہ چاند کی ٹھنڈک اور سورج کی پرشکوہ تابناکی کا نام تھا۔ اس نور کا نام تھا جو روح میں بالیدگی پیدا کرتا ہے اور دل و دماغ کے بعید ترین نہاں خانوں تک کو روشن کر جاتا ہے۔ راحیلہ کو دیکھ کر ہمیشہ گلزار مبہوت ہو جاتا تھا۔ اس کے ذہن میں بہت سے تصورات گڈمڈ ہو جاتے تھے۔ پھول کی رنگت، تاروں کی چمک، موسیقی کی لہر، جھیل کے کنارے کھلے ہوئے کنول کی تنہائی، پہاڑوں پر جمی برف کی جگمگاہٹ، اور حنا کی خوشبو۔ یہ سب ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتے تھے۔ اور وہ فیصلہ نہیں کر پاتا تھا کہ راحیلہ ان میں سے کیا ہے۔ وہ مسکراتی تھی تو لگتا تھا آسمان پر دھنک پھیل گئی ہے بات کرتی تھی تو کانوں میں جلترنگ کا فسوں بکھر جاتا تھا۔ اور چلتی تھی تو محسوس ہوتا تھا ہوا محو خرام ہے۔ اس کا چہرہ کتابی تھا بال دھوپ کی رنگت کے تھے اور سر سے پیر تک ایک ایک عضو سانچے میں ڈھلا ہوا تھا آنکھیں بڑی بڑی اور قندیلوں کی طرح روشن تھیں۔ اس وقت بھی وہ ایسی ہی پرشکوہ پرتمکنت اور بے مثال نظر آ رہی تھی۔ دھانی رنگ کی ساری اور اسی رنگ کے بلاؤز میں ملبوس تھی۔ گلے میں سفید موتیوں کا ہار پڑا تھا۔ بالوں کے جوڑے میں صرف ایک گلاب سجا ہوا تھا—— پتہ نہیں راحیلہ کو ساری بلاؤز سفید موتیوں کے ہار اور گلاب کے ایک پھول سے کتنا عشق تھا۔ وہ ہمیشہ صرف ساری اور بلاؤز پہنتی تھی۔ گلے میں ہار پڑا رہتا تھا اور جوڑے میں پھول بھی ہمیشہ ہی سجا رہتا تھا۔ گلزار نے اسے کبھی کسی دوسرے لباس میں نہیں دیکھا تھا۔ صرف ساری اور بلاؤز میں دیکھا تھا۔ کبھی سبز، کبھی گلابی اور کبھی سیاہ۔ اور نہ کبھی اس نے راحیلہ کو کوئی دوسرا زیور استعمال کرتے دیکھا تھا۔ صرف ہار اور صرف ایک پھول۔

راحیلہ مسکرا رہی تھی۔ گلزار بھی مسکرایا۔ اور آگے بڑھ کر خود بھی بینچ پر بیٹھ گیا۔ دونوں ایک دوسرے کو تکلم آمیز نظروں سے کئی لمحے تک دیکھتے رہے۔ پھر راحیلہ نے مترنم آواز میں دھیرے سے کہا۔

"کیسے ہو——؟"

"اچھا ہوں، آپ سنائیے——!"

"ٹھیک ہوں۔" راحیلہ کے لہجے میں دوستی اور اپنائیت تھی

"آپ تو بمبئی گئی تھیں شاید۔ کب آئیں——؟"

"ہاں! آج ہی صبح آئی ہوں۔ بمبئی میں کام بہت تھا لیکن تمہاری وجہ سے چلی آئی——"

"شکریہ——" گلزار نے آہستہ سے کہا۔ پھر غیر ارادی طور پر جیب میں ہاتھ ڈالا۔ مگر فوراً ہی اسے یاد آ گیا کہ راحیلہ کو سگریٹ کے دھوئیں سے وحشت ہوتی ہے لہٰذا اس نے پشیمان ہو کر ہاتھ نکال لیا۔ اور ذرا ٹھہر کر بولا۔

"میں نے سیٹھ سلیمان کو تلاش کر لیا تھا——"

"اچھا——" یکایک راحیلہ نے بے چین ہو کر کہا——

"کہاں ہے وہ——؟"

"ہے نہیں۔ تھا——" یہ کہہ کر گلزار نے اخبار اپنے زانو پر پھیلا لیا۔ پہلے ہی صفحہ پر سیٹھ سلیمان کی بڑی سی تصویر اور اس کی موت کی خبر چھپی ہوئی تھی۔ راحیلہ یکلخت ہر طرف سے بے خبر ہو کر تصویر کو دیکھنے لگی اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر چلے گئے۔ پہلے اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ پھر سفیدی میں سیاہی گھلتی چلی گئی اور پھر دھیرے دھیرے چہرہ سرخ ہو گیا ایسی سرخی جو اعصابی کھنچاؤ اور اندرونی جوش کے باعث پیدا ہوتی ہے۔ راحیلہ کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ہونٹ لرز رہے تھے اور سارے جسم میں ایک تناؤ سا پیدا ہو گیا تھا۔ کئی لمحے یونہی گزر گئے۔ پھر گلزار نے راحیلہ کی مدھم لیکن پرجوش آواز سنی۔

"تو تم نے اسے مار ڈالا——؟"

"ہاں——!"

"اوہ میرے خدا——" یکایک راحیلہ نے طویل سانس لی گھوم کر گلزار پر نظر ڈالی اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پراضطراب لہجے میں بولی—— "تم کتنے اچھے ہو۔ سچ مچ کتنے اچھے ہو گلزار۔ تم نہیں جانتے کہ تم نے مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے—— تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس وقت مجھے کتنی خوشی حاصل ہوئی ہے—— کتنا سکون ملا ہے۔ تمہارا بہت بہت شکریہ گلزار——"

"ارے نہیں اب ایسا بھی کیا ـــ" گلزار جلدی سے بولا۔ "میں نے جو کچھ بھی کیا ہے اس میں میرا مفاد بھی تو ہے اور پھر اگر میں تمہارے لئے اتنا بھی نہ کر سکوں تو میری زندگی کس کام کی۔ چاہنے والے تو پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکال لاتے ہیں۔"

راحیلہ مسکرانے لگی۔ پھر قدرے توقف کے بعد آہستہ سے بولی: "مگر یہ تھا کہاں ـــ؟"

"لکھنؤ میں ـــ" گلزار نے جواب دیا۔ "لیکن اسے تلاش کرنے میں مجھے خاصی دقت ہوئی۔ لکھنؤ جاکر اس شخص نے اپنا نام بدل لیا تھا۔ اور سیٹھ سلیمان کے بجائے اپنے خاندانی نام سیٹھ قادری سے مشہور تھا۔ مگر بہرحال میں نے اسے تلاش کر لیا۔"

"تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی تھی ـــ؟"

"ذرا بھی نہیں ـــ!"

"کسی نے تم کو دیکھا تو نہیں تھا۔ کہیں پولیس کو نہ پتہ چل جائے ـــ؟"

"ہرگز نہیں ـــ" گلزار پُراعتماد لہجے میں بولا۔ "پولیس کو قطعاً پتہ نہیں چل سکتا۔ مجھے کسی نے سیٹھ سلیمان کے گھر جاتے یا واپس آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ لہٰذا کسی کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اسے میں نے مارا ہے اور پھر اگر کبھی پولیس کو پتہ چل بھی جائے تو میں آپ سے وعدہ کر چکا ہوں کہ آپ کے اوپر ذرا بھی آنچ نہیں آئے گی۔"

"مجھے اپنی پرواہ نہیں ـــ" راحیلہ نے بے فکری سے کہا۔ "میں تو تمہارے لئے پریشان رہتی ہوں۔ میرے لئے تم کتنے خطرات مول لے رہے ہو۔"

"مجھے ان خطرات کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔" گلزار نے مسکرا کر جواب دیا۔ "خطرات کے باوجود یہ زندگی اس زندگی سے بہتر ہے جو دو ماہ پہلے تک میرا مقدر تھی۔ مجھے وہ وقت کبھی نہیں بھولے گا۔ اور آپ کو بھی یاد ہوگا جب میں کئی دن کے فاقے سے ...."

"ارے چھوڑو بھی ـــ" راحیلہ نے جلدی سے کہا۔ "اب ان باتوں کو یاد کرنے سے کیا فائدہ ـــ"

گلزار چپ ہو گیا۔ راحیلہ بھی خاموش رہی۔ اس نے بنچ کی پشت سے ٹیک لگالی۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ لگتا تھا اندر ہی اندر وہ کسی کشمکش میں مبتلا ہے۔ کسی لذت انگیز تصور سے لطف اندوز ہو رہی ہے۔ گلزار چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی۔ جب راحیلہ اس کے سامنے نہیں ہوتی تھی تو اس کا دل چاہتا تھا۔ راحیلہ مل جائے تو وہ اسے گلے سے لگالے۔ اس کے گالوں کو چومے اس کے بالوں کو چومے۔ لیکن جب وہ سامنے آجاتی تھی تو گلزار نروس ہو جاتا تھا۔ رعبِ حسن تھا یا احسانمندی کا جذبہ کہ وہ اسے چھو بھی نہیں سکتا تھا بس دیکھتا رہتا اور مسرور ہوتا رہتا...... مسرور ہوتا رہتا۔ کہ اتنی حسین اتنی بے مثال لڑکی کی محبّت اسے حاصل ہے۔ اور ایک دن یہ لڑکی اس کی اپنی ہو جائے گی۔ وہ دن زیادہ دُور نہیں ہے۔ بہت نزدیک آگیا ہے۔ صرف چند دنوں کی بات اور ہے۔ محض ایک پتھر اور ہٹانا ہے ـــ

یکایک راحیلہ نے آنکھیں کھولیں۔ اور جذبات انگیز آواز میں بولی ـــ

"گلزار مجھے بتاؤ۔ جب تم نے اُسے مارا تھا تو کیا ہوا تھا۔ مجھے ذرا ذرا سی تفصیل بتاؤ۔ اس کے چہرے کے کیا تاثرات تھے۔ خون نکلا تھا یا نہیں۔ اور اس کی چیخ کیسی تھی ـــ؟ کیا تم نے اُسے بتایا تھا کہ تم اسے کیوں قتل کر رہے ہو؟"

گلزار نے دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا۔ "نہیں میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا۔ کیونکہ وہ سو رہا تھا جب میں اس کے بنگلے میں میں داخل ہوا ہوں تو تقریباً نصف رات تھی۔ اس کے بنگلے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ یہ بات مجھے پہلے ہی معلوم تھی کیونکہ میں کئی دن سے تحقیق و تفتیش میں لگا ہوا تھا۔ وہ اپنی خواب گاہ میں اپنے بیحد قیمتی بستر پہ بے خبر سو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میرے دل میں شدید نفرت پیدا ہوئی۔ نہ جانے کیوں ـــ حالانکہ میں نے پہلے اپنی زندگی میں اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بہرحال پھر میں نے جیب سے خنجر نکالا۔ ویسا ہی خنجر جیسا اگروال اور موہن لال پر استعمال کر چکا تھا۔ آپ کو پتہ ہے میں نے چار خنجر اسی مقصد کے لئے پہلے سے خرید رکھے تھے۔ اور پھر میں نے اچانک وار کیا۔ اس کے حلق سے چیخ نہیں نکلی تھی۔ صرف ایک ہلکی سی سسکی نکلی تھی۔ شاید اس لئے کہ خنجر سیدھا اس کے دل میں پیوست ہو گیا تھا۔ تکلیف کے باعث اس کا چہرہ بگڑ کر سیاہ ہو گیا تھا۔ اور سینے سے خون کا فوارہ ابل پڑا تھا۔ گاڑھا گاڑھا سُرخ خون۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی بند ٹوٹ گیا ہے۔ اتنا خون تو موہن لال اور اگروال کے جسم سے بھی نہیں نکلا تھا۔ پھر وہ تڑپنے لگا۔ لیکن صرف دو یا تین منٹ۔ اس کے بعد اس کا جسم ساکت ہو گیا۔"

راحیلہ نے ایک طویل سسکی لی۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی: "مجھے یاد ہے۔ ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔ جب انھوں نے میرے باپ کو قتل کیا تھا۔ اسی طرح میرے باپ کے جسم سے بھی خون نکلا تھا۔ اسی طرح وہ بھی تڑپا تھا...... اوہ میرے خدا.....

اور پھر انھوں نے میری آبروریزی کی تھی۔ مجھے ایک ایک بات اچھی طرح یاد ہے۔ میرے باپ کی لاش ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے تڑپ رہی ہے۔ میری چیخیں ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔ لیکن آج مجھے کتنا سکون ملا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرے سینے سے کوئی بوجھ ہٹ گیا ہے۔"

"مت یاد کیجئے ان باتوں کو بھول جائیے۔" گلزار نے دوستانہ انداز میں تلقین کی۔

"نہیں بھول سکتی گلزار۔ نہیں بھول سکتی۔" راحیلہ نے مضطرب ہو کر کہا۔ "تمھارے اوپر وہ قیامت نہیں گزری۔ جو مجھ پر گزری ہے۔ ورنہ تم ایسا نہ کہتے۔ مجھے پورا سکون اس وقت تک نہیں مل سکتا جب تک یہ چاروں ختم نہیں ہو جاتے۔ تین چلے گئے۔ لیکن چوتھا ابھی باقی ہے وہ ناپاک خبیث آدمی جب تک اس دھرتی پر موجود ہے میں آرام سے نہیں بیٹھ سکتی۔ میں بھٹکتی رہوں گی دن رات بھٹکتی رہوں گی اور تڑپتی رہوں گی۔"

"وہ بھی نہیں بچے گا۔ آپ اطمینان رکھیئے۔" گلزار جلدی سے بولا۔ "میں اسے بھی جہنم رسید کر کے رہوں گا۔"

"مجھے یقین ہے گلزار۔ تم اپنا وعدہ پورا کرو گے۔" راحیلہ کے لہجے میں ممنونیت تھی۔

"آپ کو بھی اپنا وعدہ یاد ہے؟" گلزار نے پوچھا۔

"ہاں یاد ہے۔" راحیلہ نے آہستہ سے کہا۔ "میں بھول بھی کیسے سکتی ہوں۔"

"مگر سوال یہ ہے کہ وہ آخر کہاں ہے؟"

"مجھے علم نہیں۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔" گلزار پُراعتماد لہجے میں بولا۔ "میں بہرحال اسے تلاش کر لوں گا۔ خواہ وہ پاتال میں ہی کیوں نہ جا کر چھپ جائے۔ جلد ہی وہ بھی اپنے ساتھیوں سے جا کر مل جائے گا۔"

راحیلہ مزید کچھ نہیں بولی۔ گلزار بھی خاموش ہو گیا۔ اب اندھیرا پھیل گیا تھا۔ پرندوں کی چہکار کبھی کی معدوم ہو چکی تھی۔ چاروں طرف سناٹا سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اور پارک میں تفریح کرنے والے لوگ ایک ایک کر کے جا چکے تھے۔ یکایک راحیلہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور گلزار سے بولی۔ "اچھا اب میں چلوں گی۔ اگلے ہفتہ شام کو یہیں پر ملنا میں انتظار کروں گی۔"

پھر وہ چلی گئی گلزار وہیں بیٹھا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ روش کے موڑ پر جا کے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ پھر گلزار بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ گیٹ کی جانب چلنے لگا۔ سردست اسے کوئی اور کام نہیں تھا۔ صرف گھر جا کر سوجانا تھا۔ لیکن اگلے دن سے پھر نئی مہم شروع کرنی تھی۔ یہ نئی مہم تھی۔ کرنل آفتاب کو تلاش کرنا تاکہ وہ اسے قتل کر سکے!

لیکن سوال یہ تھا کہ کرنل آفتاب کہاں ہے۔؟

کچھ لوگوں کی زندگی بڑی آسانی سے گزر جاتی ہے۔ کوئی مختصر سا سفر کسی سیدھی اور صاف پگڈنڈی پر سے طے کر لیا جائے۔ لیکن کچھ لوگوں کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔ ان کی زندگی حادثوں اتفاقات اور ناقابل فہم، واقعات سے عبارت ہوتی ہے جیسے رات کے اندھیرے میں کسی دشوار گزار جنگل سے گزرنا۔ قدم قدم پر پیچ و خم۔ گھاٹیاں، ٹیلے اور سراب۔ وہ ہر دن کسی نئی خوشی سے دوچار ہوتے ہیں اور ہر دن کسی نئے غم کا سامنا کرتے ہیں۔ گلزار کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس کی زندگی میں خوشیاں بہت کم آئی تھیں۔ غم بہت زیادہ تھے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کا کوئی رشتہ دار ہے یا نہیں جب ہوش سنبھالا۔ ایک بڑی بی کو دیکھا تھا جنھوں نے اسے پالا تھا۔ وہ گلزار کی ممانی تھیں۔ پھر وہ بھی چلی گئیں اور وہ تنہا رہ گیا۔ غریبی کا اندھیرا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ در در کی ٹھوکریں کھانے کے باوجود آمدنی کی کوئی صورت نہیں نکل سکی تھی۔ اور وہ بے حد دکھی ہو گیا تھا۔ اگر یہی صورت رہی تو زندگی آخر کیسے گزرے گی۔

وہ ایک ویران سی شام تھی لیکن صرف گلزار کے لئے۔ ورنہ درحقیقت بازاروں میں اتنا ہجوم تھا جیسے شہر کی ساری آبادی، گھروں سے نکل کر بازاروں میں جمع ہو گئی ہے۔ روشنیوں سے دکانیں جگمگا رہی تھیں۔ سڑکوں پر رکشوں تانگوں اور کاروں کی بھاگ دوڑ جاری تھی۔ لوگ خوش تھے اور تفریح کا بھرپور لطف اٹھا رہے تھے لیکن اس رنگ و نور میں اس کیف و انبساط میں گلزار کا کوئی حصہ نہیں تھا صبح سے وہ سڑکوں پر آوارہ کتّے کی طرح مارا مارا پھر رہا تھا۔ اس کے جسم پر شکستہ قمیص تھی بوسیدہ پاجامہ تھا۔ پیروں میں پھٹی ہوئی ربڑ کی چپلیں تھیں۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور آنکھیں اندر کی جانب دھنسی ہوئی زرد اور بے رونق ہو رہی تھیں۔ تین دن کی بھوک...... ہاں تین طویل اور تلخ دنوں کی بھوک نے اس کی یہ حالت بنائی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ برسوں کا مریض ہے۔ پیٹ میں بھوک کی شدت سے اینٹھن ہو رہی تھی۔ اور چلتے وقت ٹانگیں نقاہت کے باعث بُری طرح کانپتی تھیں اس کے باوجود وہ صبح سے چل رہا تھا۔ یونہی بے مقصد۔ بغیر کسی ارادے

کے جب بہت تھک جاتا۔ تو کہیں بیٹھ کر تھوڑی دیر سستا لیتا۔ اس کے بعد پھر چلنا شروع کر دیتا۔

کئی بار اس کا دل چاہا تھا۔ کسی کار کے سامنے لیٹ جائے۔ یا گنگا پر جا کر پل سے چھلانگ لگا دے۔ کیا فائدہ اس طرح جینے سے۔ مر جائیں گے تو بھوک تو نہیں لگے گی۔ سردی تو نہیں ستائے گی۔ کسی کے آگے ہاتھ تو نہیں پھیلانا پڑے گا۔ اس دن اسے مر جانے کا تصور بڑا خوبصورت محسوس ہوا تھا۔ پہلی بار اس پر انکشاف ہوا کہ موت کتنی پیاری شے ہے۔ کتنے دکھوں کا علاج ہے۔ وہ لوگ کتنے بے وقوف ہیں جو مرنے سے ڈرتے ہیں۔ ارے ایک بار مر کر تو دیکھو۔ پھر تمہیں پتہ چلے گا کہ موت قدرت کا کتنا بڑا انعام ہے۔

اس سمے وہ ایک بیکری کے سامنے کھڑا، شوکیس میں رکھے کیک کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور بار بار پپڑی جمے ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اس وقت بڑی حسرت تھی۔ آنکھوں میں بہت زیادہ گرسنگی اور ہوس تھی۔ اس وقت اگر اسے سات ملکوں کی بادشاہت بھی پیش کی جاتی تو وہ ٹھکرا دیتا اور لپک کر کیک اٹھا لیتا۔

تبھی اس کی نظر اچانک اس لڑکی پر پڑی۔

وہ لڑکی بڑی حسین تھی اور چند قدم کے فاصلے پر کھڑی اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ سفید ساری میں وہ کسی حور کی طرح باوقار اور مقدس نظر آ رہی تھی۔ گلزار نے اتنی حسین اور پرکشش لڑکی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس کے حسن سے متاثر نہیں ہوا۔ بلکہ پہلا خیال جو اس کے دل میں آیا وہ یہ تھا۔

"کاش یہ لڑکی مجھے کھانا کھلا دے۔"

لڑکی یکایک مسکرائی۔ تو گلزار بھی احمقوں کی طرح مسکرانے لگا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی مسکراہٹ نے اسے اور زیادہ حقیر بنا دیا تھا۔ خواہ مخواہ وہ کنپٹی کھجلانے لگا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ کوئی بات کرے یا چپ چاپ دوسری طرف چل دے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی قدم اٹھاتا۔ اچانک لڑکی نے کہا۔

"کیا دیکھ رہے ہو ___؟"

"کچھ نہیں ___!" گلزار اور زیادہ نروس ہو گیا۔

"شاید بہت بھوکے ہو۔ کیوں ___؟" لڑکی نے پوچھا

"ہاں ___!" اگرچہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اثبات میں جواب دے۔ لیکن یہ لفظ تو خود بخود نکل گیا تھا۔ وہ یکایک بہت نادم ہو گیا اور گردن جھکا کر زمین کو گھورنے لگا۔ لڑکی چند ثانیے اسے دیکھتی رہی۔ پھر آگے بڑھتی ہوئی آہستہ سے بولی۔

"میرے ساتھ آؤ ___!"

وہ چپ چاپ چل پڑا۔ جیسے کوئی پالتو کتا اپنے مالک کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ ایسے ہی وہ بھی چلنے لگا۔ لڑکی آگے چل رہی تھی۔ اور شاید قصداً ایسی سڑکوں سے گزر رہی تھی جہاں زیادہ آمد و رفت نہیں تھی اور روشنی بھی کم تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ شہر کے نیم تاریک اور سنسان علاقے میں پہنچ گئے۔ اس عرصے میں کوئی بات چیت ان کے درمیان نہیں ہوئی تھی۔ گلزار کو یہ بھی اندازہ نہیں ہوا کہ انھوں نے کتنا فاصلہ طے کیا جب اس کا ذہن پیچ در پیچ خیالات کے سحر سے آزاد ہوا تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک عظیم الشان کوٹھی میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہ کوٹھی سول لائن کے عقب میں دریائے گنگا کے نزدیک کہیں واقع تھی۔ بہت بڑی کوٹھی تھی۔ پائیں باغ بھی بہت کشادہ تھا۔ یہ سارا علاقہ بہت خوبصورت لیکن بجید سنسان تھا۔ کوئی بازار نہیں تھا اس لئے چہل پہل نہیں ہوتی تھی۔ صرف امراء کی کاریں گزرتی تھیں یا پھر اکا دکا پیدل چلنے والے نظر آجاتے تھے۔

وہ کچن کی جانب سے ایک چھوٹے دروازے سے عمارت کے اندر داخل ہوئے۔ کچن اور راہداری کی بتیاں جل رہی تھیں۔ راہداری سے گزر کر وہ ایک بڑے کمرے کے دروازے پر پہنچے۔ لڑکی اچانک دروازے پر رک گئی۔ اور گھوم کر گلزار سے بولی:۔

"تم اندر چل کر بیٹھو۔ میں ابھی آتی ہوں۔ بتی جلا لینا۔"

گلزار کچھ نہیں بولا۔ خاموشی سے اندر داخل ہو گیا۔ بتی کا سوئچ تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ روشنی کر کے وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ یہ شاید کھانے کا کمرہ تھا۔ ایک جانب فریج رکھا ہوا تھا۔ ایک لمبی چوڑی میز تھی اور اس کے گرد سات آٹھ کرسیاں پڑی تھیں۔ گلزار ایک ایک شے کو دیکھتا اور حیران ہوتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے ___ یہ لڑکی کون ہے۔ اسے اس گھر میں لے کر کیوں آئی ہے۔ کیا وہ اتنی رحم دل ہے کہ محض اسے کھانا کھلانے لائی ہے۔ اگر اتنی ہی بات ہے تو بہت بڑی بات ہے۔ دنیا میں کتنے لوگ ہیں جو اتنے درد مند ہوتے ہیں۔ اور اتنا خوبصورت دل رکھتے ہیں اس کے دل میں معاً لڑکی کے لئے بہت عزت و احترام کا جذبہ پیدا ہوا اور احساس ممنونیت کی شدت سے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

لڑکی جلدی ہی واپس آ گئی اور گلزار کے سامنے والی کرسی پر

بیٹھ گئی۔ پھر نرم لہجے میں بولی۔

"کیا نام ہے تمھارا۔؟"

"گلزار۔!"

"میں راحیلہ ہوں۔" لڑکی نے دوستانہ انداز میں کہا۔

"میں نے تمھیں بازار میں دیکھا تھا۔ بہت پریشان نظر آتے تھے۔"

"ہاں۔ میں کئی روز سے بھوکا ہوں۔"

"کیوں۔؟"

"مفلسی۔" گلزار کربناک آواز میں بولا۔ "میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ بالکل اکیلا ہوں۔ اور بہت غریب ہوں۔ میں نے اپنے حالات سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔"

"غم نہ کرو۔" راحیلہ کا لہجہ حوصلہ دلانے والا تھا۔ "دنیا میں بہت سے انسانوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔ دکھ اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کوئی شخص ہمیشہ خوش اور کامیاب نہیں رہتا۔ زیادہ تر لوگ مظلوم اور دکھی ہوتے ہیں۔ اور ہمیشہ غم کی آگ میں جلتے رہتے ہیں۔!"

"ہاں آپ ٹھیک کہتی ہیں۔"

"کھانا کھاؤ گے۔؟"

یہی تو وہ جملہ تھا جس کا انتظار اتنی دیر سے گلزار کر رہا تھا اس جملے کے ایک ایک لفظ میں شہد کی مٹھاس اور زندگی کی نوید تھی۔ اور اس کے کانوں میں رس گھولتی چلی گئی تھی۔

وہ یکایک آگے جھکا اور جلدی سے بولا۔

"ہاں۔!"

"تو پھر اپنی مدد آپ کرو۔" راحیلہ نے پُرتبسم ہونٹوں کو جنبش دی۔ "فریج سامنے رکھا ہے۔ اس میں روٹیاں بھی ہیں اور کباب بھی ہیں۔ ادھر سامنے اسٹینڈ پر ہنڈیا رکھی ہے۔ اس میں پانچ میل کی ترکاری ہے اور......"

راحیلہ نہ جانے کیا کیا کہتی رہی۔ گلزار نے مزید کچھ نہیں سنا۔ اس طرح لپک کر اٹھا جیسے گدھ مردے پر جھپٹتا ہے۔ فریج سے کباب پانی کی بوتل، اور روٹیاں نکالیں۔ ہانڈی سے ترکاری لی اور پھر کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح سارا کھانا جلدی سے کھا جائے۔ سارے کباب، ساری روٹیاں، ساری ترکاری اسے اس کا بھی احساس نہیں تھا کہ راحیلہ کیا سوچ رہی ہو گی۔ ممکن ہے اسے بالکل ہی گنوار سمجھ رہی ہو۔ درحقیقت اس وقت وہ راحیلہ کو بھول ہی گیا تھا۔ ساری توجہ کھانے پر مرکوز تھی۔ جو اگرچہ ٹھنڈا تھا مگر اسے بےحد لذیذ معلوم ہو رہا تھا۔ روٹی کی خوشبو اس کے مشامِ جان کو مہکا رہی تھی آلو کی بھینی بھینی مہک اس کی روح کو معطر کر رہی تھی۔ راحیلہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی اور مسکراتی رہی۔ کھانے سے فارغ ہو کر گلزار کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے جسم میں جان ہی نہ رہ گئی ہو۔ شاید یہ زیادہ کھانا کھا لینے کا نتیجہ تھا۔ وہ پست ہو کر کرسی پر نیم دراز ہو گیا اور آہستہ سے بولا

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں"

"ارے اس کی کوئی پرواہ نہ کرو۔" راحیلہ نے نرمی سے کہا۔ "جب میں نے تمھیں دیکھا تھا تو تم پر بہت ترس آیا تھا۔ میں فوراً سمجھ گئی تھی کہ تم بہت دکھی آدمی ہو۔ دکھی لوگوں کو دیکھ کر میں ہمیشہ خود بھی دکھی ہو جاتی ہوں۔ شاید اس لئے کہ میں نے خود بھی بہت سے دکھ جھیلے ہیں۔"

"آپ بہت اچھی ہیں۔" گلزار نے تشکر آمیز لہجے میں کہا

راحیلہ کچھ نہیں بولی۔ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی چند لمحے بعد گلزار خود ہی بولا۔

"بہرحال میں آپ کا ممنونِ احسان ہوں۔ اگر کبھی وقت آیا تو میں بھی آپ کے کسی کام آنے کی کوشش کروں گا۔"

"شاید ایسا موقع آ ہی جائے۔" راحیلہ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "لیکن بعد کی بات ہے۔ جب وقت آئیگا تو دیکھا جائے گا۔ اس وقت میرے خیال میں شاید تمھیں کچھ پیسوں کی بھی ضرورت ہو گی۔"

"جی۔!" گلزار حیرت سے بولا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" راحیلہ گلزار کے حیرت زدہ چہرے پر توجہ دیئے بغیر بولی۔ اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئے۔ یہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ یکایک گلزار کو احساس ہوا کہ گھر میں سوائے راحیلہ کے اور کوئی نہیں ہے کیونکہ اس عرصہ میں اس نے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ نہ کوئی آواز سنی تھی۔ اس نے اچانک راحیلہ سے پوچھ ہی لیا۔

"گھر میں اور کوئی نہیں ہے شاید۔؟"

"نہیں۔ یہاں میں اپنی خالہ اور تین ملازموں کیساتھ رہتی ہوں۔ خالہ کسی رشتہ دار کے یہاں گئی ہوئی ہیں۔ اور نوکر چھٹی پر ہیں مگر تم اس کی پرواہ مت کرو۔" یہ کہہ کر راحیلہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اور قدرے ٹھہر کر نرم لہجے میں بولی۔

"تمھارے کپڑے بہت بوسیدہ ہیں۔"

"میں بہت غریب جو ہوں ۔۔" گلزار خجالت سے بولا۔

"خیر کوئی بات نہیں ۔۔" راجیلہ کی آواز پُرسکون تھی ۔۔ اس نے گلزار کی جانب دیکھا اور یکایک مسکرائی ۔ "ذرا اس میز کی نچلی دراز تو کھولو ۔۔!"

گلزار نے آگے بڑھ کر میز کی دراز کھولی اور دوسرے لمحے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ دراز موٹی موٹی گڈیوں سے بھری ہوئی تھی۔ دس دس کے نوٹ اور سو سو کے نوٹ اور پانچ پانچ سو کے نوٹ ۔ گلزار پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی نوٹوں کو اور کبھی راجیلہ کو دیکھ رہا تھا ۔۔!

دوسرے دن سے اس کی زندگی بدل گئی۔ گویا بات ناقابل یقین تھی۔ انسانی زندگی میں ایسا عام طور پر تو نہیں ہوتا کہ ایک بھکاری رات میں سوئے تو بھکاری ہو۔ اور صبح جاگے تو شہزادہ بن چکا ہو۔ کسی وقت گلزار کو شبہ ہوتا کہ شاید وہ سپنا دیکھ رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد آنکھ کھل جائے گی اور پھر وہی بھوک ہوگی، وہی مفلسی ہوگی اور وہی بیماری ہوگی۔۔ لیکن وہ سپنا نہیں تھا حقیقت تھی۔ جیسے صبح کا اجالا حقیقت ہوتا ہے۔ راجیلہ نے اسے پانچ ہزار روپئے دیئے تھے۔ چنانچہ دوسرے دن اس نے ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ نئے کپڑے خریدے، نئے جوتے خریدے اور شہزادوں کی طرح زندگی گزارنے لگا۔

وہ مسرت اور شادمانی کے دن تھے۔ وقت سمندر کی لہر کی طرح تیز روی سے گزر رہا تھا صبح ہوتی، شام ہوتی اور پھر رات ہو جاتی۔ لیکن گلزار کو پتہ ہی نہ چلتا۔ وہ ہر روز نیا سوٹ پہنتا۔ اعلیٰ درجے کے سگریٹ پیتا اور عمدہ ہوٹلوں میں کھانا کھاتا۔ ایک ماہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ اس عرصہ میں راجیلہ سے صرف دو بار ملاقات ہوئی۔ راجیلہ نے اسے سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ اس سے ملنے کے لئے اس کے بنگلے پر نہ جائے۔ کیونکہ وہ ایک نوجوان لڑکی ہے اور ایک اجنبی مرد سے اس کا ملنا دنیا کو افسانے تراشنے کا موقع دے سکتا ہے۔ اس نے اس ہدایت پر سختی سے عمل کیا تھا۔ دو بار راجیلہ سے اس کی ملاقات شام کے سناٹے میں کسی پارک یا گنگا کے ساحل پر ہوئی تھی۔

لیکن تیسری ملاقات پر راجیلہ پھر اسے اپنے بنگلے پر لے گئی کیونکہ اس روز بھی اس کی خالہ کسی رشتہ دار کے یہاں گئی ہوئی تھیں۔ اور نوکر چھٹی پر تھے۔ راجیلہ نے اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ وہ پہلے سے بہت بدل گیا ہے اور بہت ہینڈسم نظر آتا ہے۔ اس نے امید ظاہر کی کہ وہ جلد ہی کوئی اچھی ملازمت تلاش کرے گا اور زندگی میں جماؤ اور سلیقہ پیدا کرے گا۔ پھر اس نے مزید پانچ ہزار روپے گلزار کو دیئے تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔

"لیکن ..... لیکن اس کی کیا ضرورت ہے ۔"

"تمہارے پاس ختم ہو گئے ہوں گے ۔" راجیلہ مسکرائی۔

"لیکن اس کی کیا ضرورت ہے ۔" گلزار نے گویا احتجاج کیا لیکن یہ اور بات ہے کہ اس کی آواز میں ممنونیت کے سوا کچھ نہیں تھا۔۔ "پہلے ہی آپ کا مجھ پر بہت احسان ہے پھر یہ مزید کرم کس لئے۔ میں بھلا کس طرح آپ کی عنایتوں کا بدلہ اتار سکوں گا ۔۔؟"

"چاہو تو اتار سکتے ہو ۔۔" راجیلہ کی آواز پُراسرار تھی۔

"کس طرح ۔۔؟" گلزار سر تا پیر سوال بن گیا۔

"کیا واقعی تم میرے کسی کام آنا چاہتے ہو ۔۔؟"

"ہاں ۔۔ آزما کر تو دیکھئے۔ اگر میں آپ کے لئے اپنی جان بھی دے سکا تو خود کو خوش نصیب سمجھوں گا۔!" گلزار نے تیقن اور اعتماد سے کہا ۔۔!

راجیلہ نے فوراً ہی کچھ نہیں کہا۔ اس کا چہرہ یکایک سنجیدہ اور پُراسرار ہو گیا۔ وہ گہری سرد آنکھوں سے گلزار کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ جیسے پرکھ رہی ہو کہ گلزار نے جو کچھ کہا ہے وہ محض الفاظ ہیں یا ان میں کوئی معنی اور جذبہ بھی ہے۔ گلزار تھوڑا سا نروس ہو گیا۔ پتہ نہیں راجیلہ کی آنکھوں میں ایسی کیا بات تھی کہ وہ جلدی سے فرش پر بچھے قالین کو گھورنے لگا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے راجیلہ کی آنکھوں سے کوئی برقی رو نکل کر اس کے رگ و پے میں سرایت کرتی جا رہی ہے۔ چند لمحے یونہی گزر گئے۔ پھر معاً راجیلہ نے میز پر رکھے البم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔۔

"ذرا اس البم کا آخری صفحہ تو کھولو ۔۔"

گلزار نے چپ چاپ تعمیل کی۔ البم کے آخری صفحے پر چار مردوں کی تصویریں چسپاں تھیں۔ چاروں معمر مرد تھے اور تصویروں کے نیچے ان کے نام بھی لکھے تھے۔ سیٹھ موہن لال۔ پھول چند اگروال سیٹھ سلیمان اور کرنل آفتاب ۔ گلزار حیرت سے تصویروں کو دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ان تصویروں کو دکھانے سے راجیلہ کا مقصد کیا ہے۔ چنانچہ اس نے جواب طلب نظروں سے راجیلہ کو دیکھا۔

"یہ میرے باپ کے بہت گہرے دوست تھے۔ اور میں انہیں چچا کہتی تھی ۔"

"اچھا پھر ۔۔؟"

"ان میں سے ایک اسی شہر میں رہتا ہے۔ باقی تین دوسرے مقامات پر چلے گئے ہیں۔ لیکن کہاں ہیں یہ مجھے نہیں معلوم ہے۔" راحیلہ ٹھہرے ہوئے گہرے اور سرد لہجے میں کہہ رہی تھی ۔۔۔ "میں چاہتی ہوں تم انھیں تلاش کرو ۔۔۔"

"میں انھیں تلاش کروں لیکن کیوں ۔۔۔؟"

"انہیں تلاش کرو اور ۔۔۔۔۔" راحیلہ کی آواز میں تانبے کے برتن کی گونج تھی ۔۔۔ "اور انھیں قتل کر دو ۔۔۔!"

"قتل کر دوں ۔۔۔؟" گلزار یکایک جھجک کر پیچھے ہٹا "آپ کا مطلب یہ ہے انھیں جان سے مار دوں ۔۔۔ مم ۔۔۔۔۔ مگر یہ تو جرم ہے ۔۔۔"

"مجھے معلوم ہے ۔۔۔" راحیلہ کی آواز بدستور سرد تھی ۔۔۔ "جب میں نے تمھیں کھانا کھلایا تھا تو ہرگز میرا ارادہ یہ نہیں تھا کہ تم سے ایسا کوئی کام لوں گی ۔ لیکن تم میرے کسی کام آنا چاہتے ہو تو یہی ایک احسان ہے جو تم مجھ پر کر سکتے ہو ۔"

"مگر کیوں ۔۔۔۔۔۔ آپ کیوں انھیں قتل کرانا چاہتی ہیں"

گلزار نے یہ جملہ کہا تو اسے ایسا لگا جیسے یہ کسی اور شخص کی آواز ہے ۔ اس کی اپنی نہیں ۔ بہت دور سے آتی ہوئی کمزور اور مدھم آواز ۔ غالباً یہ اس کے اندر بیٹھا ہوا گلزار بول رہا تھا ۔ حیرت سے اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا ۔۔۔ کیونکہ اسے ہلکا سا گمان بھی نہیں تھا کہ راحیلہ اس سے ایسا کوئی کام لے گی ۔ راحیلہ تو محض ایک لڑکی ہے ۔ نازک سی معصوم سی رحمدل اور ہمدرد ۔ وہ ایسی کوئی خوفناک بات کیسے کر سکتی ہے ۔۔۔ گلزار کو شبہ ہوا شاید وہ مذاق کر رہی ہے چنانچہ اس نے ذرا سنبھل کر پوچھا ۔۔۔!

"کیا آپ سچ مچ سنجیدہ ہیں ۔۔۔؟"

"ہاں ۔۔۔" راحیلہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ۔۔۔ "میں بالکل سنجیدہ ہوں ۔ لیکن تمھیں میں مجبور نہیں کرتی ۔ تم چاہو تو انکار بھی کر سکتے ہو ۔۔۔"

"لیکن آپ انھیں کیوں قتل کرانا چاہتی ہیں ۔۔۔؟"

"کیونکہ میں ان سے انتقام لینا چاہتی ہوں ۔۔۔"

"انتقام ۔۔۔؟" گلزار نے حیرت سے کہا ۔ "مگر کیوں انھوں نے کیا کیا ہے ۔۔۔؟"

راحیلہ نے چہرہ موڑ کر گلزار کو دیکھا ۔ پھر نظریں اوپر اٹھا کر چھت کو تاکنے لگی ۔ یکایک اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا آنکھوں کی چمک دھندلا گئی تھی ۔ اور جذبات کی شدت سے گردن کی رگیں تن گئی تھیں ۔ گلزار کو نہیں معلوم تھا کہ اس کا یہ مختصر سا اور بظاہر بے ضرر سوال راحیلہ کو اتنی تکلیف پہنچائے گا کہ اس کی آنکھیں بھیگ جائیں گی چند لمحے بعد راحیلہ بولی تو اس کی آواز کانپ رہی تھی اور لہجے کا کرب گلزار کو فضا میں پھیلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا ۔ وہ دھیرے دھیرے کہہ رہی تھی ۔۔۔ "تم نہیں جانتے گلزار میں کتنی دکھی ہوں ۔۔۔ کتنی ستم رسیدہ ہوں اور یہ ستم ان چاروں نے مجھ پر توڑا ہے ۔۔۔ ان لوگوں نے میرے باپ کو قتل کیا تھا ۔۔۔ میری آنکھوں کے سامنے ان لوگوں نے سسکا سسکا کر میرے باپ کو مارا تھا اور میری آبروریزی کی تھی ۔۔۔"

"گگ ۔۔۔۔۔۔ کیا ۔۔۔؟" گلزار کے حلق میں پھندا پڑ گیا

"شاید تمھیں یقین نہیں آیا ۔۔۔" راحیلہ نے پُرسوز لہجے میں کہا ۔۔۔ "بظاہر میری بات ایسی ہی ہے کہ کوئی بھی اس پر یقین نہیں کرے گا لیکن یہ سچ ہے ۔۔۔ بالکل اسی طرح سچ ہے جیسے تم گلزار ہو اور میں راحیلہ ہوں ۔۔۔ میں وہ رات کبھی نہیں بھولوں گی جب میرا باپ ان لوگوں نے مجھ سے چھین لیا ۔ یہ ایک سال پہلے کی بات ہے جب یہ چاروں اور میرے والد اکبرپور والے ہمارے دیہی مکان میں جمع ہوئے تھے ۔ وہ ایک بھیانک اور لرزہ خیز رات تھی ۔ آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور موسلادھار بارش ہو رہی تھی ۔ تیز ہوائیں چاروں طرف چیختی چلّاتی پھر رہی تھیں ۔۔۔ مکان کے باہر ہر سو گہرا اندھیرا اور بھیانک سناٹا محیط تھا ۔ لیکن مکان کے اندر ڈرائنگ روم میں خرابیٔ موسم کا کوئی اثر نہیں تھا ۔ وہاں تو جام پر جام چل رہے تھے ۔ اور ریکارڈ پلیئر پر انگریزی موسیقی کے ریکارڈ بج رہے تھے ۔ میرے والد شراب نہیں پیتے تھے ۔ صرف یہ چاروں پیتے تھے اور والد دوستی کے ناطے کبھی انھیں منع نہیں کرتے تھے ۔ میں اس وقت اپنے کمرے میں تھی اور سونے کی کوشش کر رہی تھی ۔ تبھی اچانک میرے کانوں میں ایک تیز وحشتناک چیخ کی آواز آئی ۔ میں بھاگ کر ڈرائنگ روم میں پہنچی تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ۔ میرے والد زمین پر پڑے تھے اور ان کے سینے سے خون نکل کر فرش پر پھیل رہا تھا ۔ اور یہ چاروں میرے والد کے گہرے دوست اور میرے منہ بولے چچا کھڑے دیوانوں کی طرح ہنس رہے تھے ۔ میرا خیال ہے میں زور زور سے چیخی تھی لیکن اپنی آواز میں نے خود بھی نہیں سُنی ۔ غالباً میری چیخیں حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئی تھیں ۔ پھر میں الٹے پاؤں بھاگی اور اپنے کمرے میں آ گئی ۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کروں ۔ کسے مدد کے لئے

بلاؤں۔ اکبر پور ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ میرے مکان کے آس پاس ویسے بھی آبادی نہیں تھی اس لئے کسی کو بلانا ناممکن ہی تھا۔ پھر کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو میں سسک سسک کر رونے لگی۔"

یکایک راحیلہ چپ ہوگئی۔ اس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ گلزار نے دیکھا کہ اس نے اپنی انگلیاں اتنی قوت سے ایک دوسرے میں پھنسا رکھی تھیں کہ ناخن اور پوریں دودھ کی طرح سفید پڑ گئی تھیں۔ گلزار نے ایک طویل سانس لے کر پوچھا۔

"پھر کیا ہوا تھا ۔۔ ؟"

"وہ ایک سپنا تھا۔ بھیانک سپنا ۔۔" راحیلہ نے جیسے خواب میں بولنا شروع کیا ۔۔ "میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں ۔۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ جو کچھ میں نے دیکھا تھا وہ سب کیا تھا۔ کیا واقعی وہ میرے باپ کی لاش تھی ۔۔ کیا واقعی وہ خون ان کے جسم سے نکلا تھا ۔۔ مگر کیوں ۔۔ ؟ تھوڑی دیر پہلے تک تو وہ سب لوگ خوش تھے اور ہنس بول رہے تھے۔ پھر یہ کیا ہوا ؟ میرے والد کیسے مر گئے ۔۔ انھیں کس نے مارا ۔۔ ؟ یقین، وہم، دہشت ۔ اور بے چارگی کی کشاکش کا وقفہ طویل نہیں ہوا تھا کہ وہ چاروں اچانک میرے کمرے میں آ گئے ۔۔ اور پھر جانتے ہو کیا ہوا ۔۔ نہیں تم اندازہ نہیں کر سکتے ۔۔ تم اس درد کو محسوس بھی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ قیامت مجھ پر گزری تھی ۔۔ میں نے ان کے آگے ہاتھ جوڑے رو رو کر گڑگڑا کر ان کی خوشامد یں کیں ۔۔ انھیں خدا کا واسطہ دیا ۔۔ انھیں یاد دلایا کہ وہ میرے چچا ہیں۔ لیکن انھوں نے ایک نہیں سُنی ۔ ان سب نے شیطانوں کا روپ دھار لیا تھا ۔۔ ان کی خباثت اور کمینگی ان کے چہروں سے عیاں تھی۔ وہ سب کے سب دیوانوں کی طرح ہنس رہے تھے اور میرے کپڑے نوچ رہے تھے۔ پھر انھوں نے میری عزت لوٹی ۔ اور ۔۔ حتیٰ کہ روتے روتے میں بے ہوش ہوگئی ۔۔"

راحیلہ پھر خاموش ہوگئی ۔۔ اور بے رونق آنکھوں سے خلا میں گھورتی رہی۔ گلزار کا ذہن یقین اور بے یقینی کے درمیان معلق تھا۔ راحیلہ کی آواز بدستور اس کے کانوں میں اس طرح گونج رہی تھی۔ جیسے صحرا میں چلتی ہوئی تیز ہوا سیٹی بجاتی ہے ۔ اور اس کے دل میں ایسی کسک ہو رہی تھی گویا کوئی اسے مٹھی میں لیکر مسل رہا ہو کئی منٹ تک جب راحیلہ چپ ہی رہی تو گلزار خاموشی کی گونج سے گھبرا گیا۔ اور ہونٹ دانتوں میں دبا کر بولا ۔۔

"مجھے بہت رنج ہوا ۔ واقعی یہ حادثہ بڑا دردناک تھا۔ لیکن کون جانتا ہے کہ ایک انسان کس وقت حیوان بن جائے گا ۔"

راحیلہ نے نظر گھما کر اس کی جانب دیکھا لیکن کچھ بولی نہیں گلزار نے قدرے توقف کے بعد کہا ۔" تو وہ لوگ پکڑے نہیں گئے ۔ میرا مطلب ہے پولیس نے انھیں گرفتار کیوں نہیں کیا ۔"

"کیونکہ کوئی ثبوت نہیں تھا ۔۔" راحیلہ نے رنجیدہ ہو کر کہا ۔" انھیں کسی نے ہمارے گھر آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ان لوگوں نے اپنی موجودگی دوسرے مقامات پر ثابت کر دی تھی ۔ اس لئے پولیس نے خیال کیا کہ میرے والد نے کسی وجہ سے خودکشی کر لی ہے ۔"

"تم نے بھی پولیس کو کچھ نہیں بتایا ۔۔ ؟"

"نہیں ۔۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں مزید ذلت رسوائی اور پچھتاوے کا سامنا نہیں کر سکتی تھی ۔ اس لئے خاموش ہو رہی تھی"

"ہُم ۔۔" گلزار آہستہ سے بولا ۔۔" لیکن ان لوگوں نے تمھارے والد کو کیوں قتل کیا تھا ۔۔ ؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم ۔۔" راحیلہ نے جواب دیا۔

اور اب تم انتقام لینا چاہتی ہو ۔ تم چاہتی ہو کہ میں انھیں قتل کر دوں ۔۔ جنھوں نے تمھاری دنیا تاریک کی تھی تاکہ ...... تاکہ تم کو سکون مل سکے ۔ !"

راحیلہ نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ صرف گلزار کی آنکھوں میں جھانکا ۔۔ اس کی بڑی بڑی جھکتی ہوئی آنکھوں میں صرف ایک ہی لفظ ناچ رہا تھا ۔۔ ہاں ۔۔ گلزار نے گردن جھکا لی ۔ اور بیچین ہو کر سوچا ۔ اب میں کیا کروں ۔۔ چار انسانوں کو قتل کرنا کوئی معمولی بات نہیں ۔ ایک بھیانک جرم ہے ۔ قدم قدم پر مجھے خطرے کا سامنا کرنا ہوگا۔ پولیس مجھے پکڑ بھی سکتی ہے ۔ کوئی معمولی سی غلطی، چھوٹی سی بھول میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال سکتی ہے ۔ اگر پولیس نے مجھے پکڑ لیا تو کیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ موت سے کم کوئی سزا مجھے نہیں مل سکتی ۔ تو پھر میں کیا کروں ۔۔ میں کیا کروں ...... ؟

"ہاں، اب تم کیا کرو گے ۔ اچھی طرح سوچ لو ۔ یہ زندگی اور موت کا سوال ہے ۔ تمھیں اپنی ہستی داؤ پر لگانی ہوگی ۔ اور کوئی ضرورت نہیں کہ تمھارے تینوں کارڈ پکے ہی ہوں ۔ تین جوکر بھی ہو سکتے ہیں اس صورت میں تم قسمت کی ستم ظریفی کا نشانہ بن جاؤ گے۔ لیکن خیال رہے کہ تم اس دنیا میں اکیلے ہو۔ تمھارا کوئی نہیں ہے ۔ تم محبت کی ایک نگاہ اور ہمدردی میں ڈوبے ایک لفظ کے لئے ہمیشہ ترستے رہے ہو ۔ وہ دن بھی تمھیں یاد ہوں گے جب تم فاقے کرتے تھے اور پیوند زدہ کپڑے پہنتے تھے مگر

یہ لڑکی جو اس وقت تمھارے سامنے بیٹھی ہے۔ اس نے تمھیں سب کچھ دیا ہے وہ سب کچھ جو تم چاہتے تھے۔ اب یہ لڑکی تمھارے سامنے صورتِ سوال کھڑی ہے۔ اس کے چہرے پر امید و بیم کی پرچھائیاں ہیں اور کان تمھاری آواز پر لگے ہیں۔ کیا تم اس کا دل توڑ دو گے۔ باوجود اس کے کہ تم اس کے احسان مند ہو۔ اس دنیا میں کتنے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کے کام آتے ہیں جو دوسروں کے لئے مر جانے کا فن جانتے ہیں۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں اور جو ہوتے ہیں وہ عظیم ہوتے ہیں چنانچہ تم نے اگر اس لڑکی کے لئے جان بھی دیدی تو تمھیں ملال نہیں ہوگا۔"

گلزار نے معاً گردن اٹھا کر راحیلہ کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عزم، اعتماد اور تیقن کی روشنی تھی۔

سیٹھ موہن لال کو قتل کرنا کچھ مشکل نہیں ثابت ہوا۔ اس کا بنگلہ چکیری کے قریب ایک پُرفضا اور پُرسکون مقام پر تھا۔ آس پاس اور بھی بنگلے تھے۔ لیکن آمد و رفت نہ ہونے کے باعث ہر وقت سناٹا رہتا تھا گلزار نے چند روز میں سیٹھ موہن لال کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرلیں۔ وہ ہر شام اپنے بنگلے کے عقب میں ایک ویران پگڈنڈی پر ٹہلتا تھا اور دُور تک چلا جاتا تھا۔ ایک دن گلزار ایک درخت کی آڑ میں چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ جب سیٹھ موہن لال اس کے قریب سے گزرا تو وہ اچانک آڑ سے نکل کر سامنے آگیا۔ ہونٹوں میں ایک عدد سگریٹ دبائی اور سیٹھ موہن لال سے بولا۔

"تمھارے پاس ماچس ہوگی ــــ؟"

"نہیں ــــ!" سیٹھ موہن لال نے بے توجہی سے جواب دیا۔

"ہائیں ــــ" گلزار نے آنکھیں نکالیں۔ "تمھارے پاس ماچس نہیں ہے۔ کیسے نامعقول آدمی ہو ــــ!"

"کیا بکتے ہو ــــ؟" سیٹھ موہن لال بگڑ گیا ــــ "تمھیں بات کرنے کی بھی تمیز نہیں ہے ــــ"

"تمیز ہو یا نہ ہو ــــ" گلزار غرا کر بولا۔ "لیکن جن لوگوں کے پاس ماچس نہیں ہوتی میں انھیں قتل کر دیا کرتا ہوں ــــ!"

اگلے چند لمحے سیٹھ موہن لال کی زندگی کے آخری لمحے ثابت ہوئے۔ اس نے خود کو بچانے کی بے پناہ جدوجہد کی چیخا بھی لیکن یہ اور بات ہے کہ اس کی آواز کسی کے کانوں تک نہ پہنچ سکی۔ گلزار نے اسے پھرتی سے نیچے گرا لیا۔ جیب سے خنجر نکالا اور اس کے سینے میں اتار دیا ــــ!

پھر درخت کے پیچھے سے بیگ نکالا کپڑے بدلے۔ دستانے وہیں جلا ڈالے اور ہر ممکن احتیاط کے ساتھ واپس چلا آیا۔ بعد میں کافی دیر تک وہ ہنستا رہا تھا۔ آخر اس مسخرے پن کی ضرورت ہی کیا تھی۔ غالباً یہ ضرورت سے زیادہ اعصابی ہیجان کا نتیجہ تھا کہ اس کی ذہنی رو بہک گئی تھی۔ اور اس نے خواہ مخواہ ماچس والا مسخرہ پن کیا تھا۔ لیکن مسخرے پن کا یہ وقفہ بہت مختصر تھا۔ بعد ازاں اس پر خوف و دہشت کا حملہ ہوا تھا۔ ساری رات موہن لال کی لاش اس کے تصور میں ناچتی رہی تھی۔ خون اُبل اُبل کر پھیلتا رہا تھا اور سیٹی کی آوازیں اس کے کانوں میں گونجتی رہی تھیں۔ بس اب پولیس والے آیا ہی چاہتے ہیں۔ وہ بغیر کسی پس و پیش کے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں گے۔ اور پھر پھانسی پر چڑھا دیں گے ــــ!

دوسرے دن کے اخبارات سیٹھ موہن لال کے قتل کی خبر سے بھرے ہوئے تھے۔

وہ کئی روز تک ڈرتا رہا۔ اپنے سائے سے بھی بھڑکتا اور بھاگتا رہا۔ پولیس والوں کو دیکھ کر اس کے چہرے پر پسینہ بہنے لگتا۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ سیٹھ موہن لال کے قاتل کا کوئی پتہ نہ چلا اور آخر کار دھیرے دھیرے گلزار مطمئن ہو گیا۔

پھر اس نے پھول چند اگروال کو تلاش کیا اور اسے بھی قتل کر دیا۔ اس کے بعد سیٹھ سلیمان کی باری آئی۔ وہ بھی کیفر کردار کو پہنچ گیا تین پتھر ہٹ چکے تھے گویا وہ تین قدم راحیلہ کے اور نزدیک پہنچ گیا تھا۔ پچھلے چند ہفتوں میں جب جب اس نے راحیلہ کو اپنی کامیابی کی اطلاع دی تھی۔ راحیلہ بہت خوش ہوئی تھی اور بات خود بخود بنتے بنتے یہاں تک آ پہنچی تھی کہ اس نے راحیلہ سے زندگی بھر کا ساتھ طلب کر لیا۔ راحیلہ نے انکار نہیں کیا تھا۔ ہاں یہ ضرور کہا تھا کہ جب تک اس کا مشن پورا نہیں ہوتا اس وقت تک گلزار اسے چھو بھی نہیں سکے گا کیونکہ وہ ایک شریف مشرقی لڑکی ہے۔ لیکن مشن پورا ہو جانے کے بعد.....

اور اس کا مشن اب تقریباً پورا ہو چکا تھا۔ صرف ایک قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اور صرف ایک پتھر ہٹانا تھا جب یہ پتھر بھی ہٹ جائے گا تو کوئی فاصلہ باقی نہیں رہے گا۔ دوری مٹ جائے گی اور راحیلہ اس کی ہو جائے گی۔ وہ دن اس کی زندگی کا سب سے خوبصورت دن ہوگا۔ اس دن ساری کائنات کی مسرتیں اس کے قدموں پر ڈھیر ہو جائیں گی۔ اور وہ دنیا کا خوش نصیب ترین انسان ہوگا۔

مگر سوال یہ تھا کہ کرنِ آفتاب کہاں ہے ــــ؟

☼

ٹھکرا پور کے چھوٹے سے دیہاتی اسٹیشن پر اتر کر گلزار نے کپڑوں پر جمی گرد جھاڑی۔ انگلیوں سے بال سنوارے اور اس وقت تک وہیں کھڑا رہا جب تک ٹرین چلی نہ گئی۔ پھر اس نے بھی اپنا بیگ اٹھایا۔ اور گیٹ کی جانب چلا۔ اسٹیشن پر دو چار مسافر ہی اترے تھے اور وہ بھی اس عرصے میں جا چکے تھے۔ پلیٹ فارم پر سناٹا ہو گیا تھا۔ گلزار ٹکٹ چیکر کو ٹکٹ دیکر باہر آیا۔ اور تجسس آمیز نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

ٹھکرا پور نیپال کی سرحد کے نزدیک ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اسٹیشن ہی سے ہمالیہ کی برفانی چوٹیاں جگمگاتی نظر آتی ہیں۔ اطراف کا سارا علاقہ اونچی نیچی پہاڑیوں اور خم کھاتی ہوئی محبوب کی البیلی نظر کی طرح چھپتی اور سامنے آتی ہوئی پگڈنڈیوں پر مشتمل ہے۔ اسٹیشن سے باہر آکر گلزار ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ اور بے حد محویت کے عالم میں برف پڑتی چوٹیوں اور نیچے سدا بہار درختوں اور بل کھاتی پگڈنڈیوں کو دیکھنے لگا۔ اس نے اتنا دلفریب اور خوبصورت منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ فلک بوس پہاڑ اور ان پر جمی ہوئی جھلملاتی ہوئی برف کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اتنے پرندے نہیں دیکھے تھے۔ میدانوں میں وہ حسن کہاں جو دور تک پھیلے ہوئے پہاڑی سلسلوں کے بلند و پست میں ہے۔ کئی منٹ کی محویت کے بعد وہ جاگا اور گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ اسٹیشن کے باہر کوئی آبادی نہیں تھی۔ یقیناً گاؤں وہاں سے دور رہا ہوگا۔ البتہ چند دکانیں تھیں۔ دو تین ٹوٹے پھوٹے تانگے اور ایک بیل گاڑی کھڑی تھی۔ نیچے نشیب میں ایک ننگ دھڑنگ لڑکا بھینس کی پیٹھ پر بیٹھا چلا جا رہا تھا۔ چند ایک خوانچے والے بھی تھے۔ گلزار نے جیب سے سکہ نکالا اور ایک خوانچے والے سے بھنے ہوئے چنے خریدے۔ پھر روا روی کا انداز اختیار کرکے اس سے پوچھا۔

"یہاں سے گاؤں کتنی دور ہے ــ؟"

"بس تھوڑی ہی دور ہے بابو جی ــ!" خوانچے والے نے مسکین انداز میں مسکرا کر جواب دیا۔

"وہاں کوئی ہوٹل بھی ہے ــ؟"

"ہاں بابو جی! ایک ہے اور دو تین سرائے بھی ہیں۔ مگر آپ کے لئے مناسب نہیں ہیں۔ آپ ٹھہرے شہری بابو۔"

"ارے ایسی کوئی بات نہیں بھئی ــ" گلزار جلدی سے مسکرا کر بولا ــ اور ہاں تم یہاں کسی محمد خان ٹھیکیدار کو جانتے ہو"

"نہیں بابو۔ ہم کا نہیں مالوم ــ"

"اچھا خیر ــ!" گلزار یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

بستی تک پہنچنے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی۔ یہ چھوٹی سی بستی اسے ہر لحاظ سے پسند آئی۔ سڑکیں اور گلیاں گو پتلی اور ٹیڑھی میڑھی تھیں۔ جگہ جگہ گائے بھینس اور بکریاں بندھی تھیں لیکن اسے ہر جگہ مناسب حد تک صفائی نظر آئی۔ لوگ سیدھے سادے اور معصوم ــ اور جفاکش دکھائی دیتے تھے۔ ان کے چہرے محنت کے نور اور زندگی کے حسن سے معمور تھے۔ گلزار کو اس بستی کے مقابلے میں شہروں کی زندگی بڑی حقیر اور مصنوعی محسوس ہوئی۔ شہروں میں خلوص کہاں ہے۔ دوستی کہاں ہے ــ آدمیت کہاں ہے۔ شہروں میں تو ہر شخص بھاگ رہا ہے اپنے آپ میں ڈوبا ہوا ہے اور ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہے۔ گلزار کافی دیر تک ادھر ادھر گھومتا رہا۔ اور سادگی میں ڈوبی ہوئی ہر شے بہت غور سے دیکھتا رہا۔ ننگے اور میلے کچیلے بچے رنگ برنگ کے لہنگے پہننے والی اور بیک وقت چھ چھ گھڑے اٹھانے والی عورتیں اور چھوٹی چھوٹی پگڑیاں باندھے ہوئے مرد۔ یہ سب کچھ اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ کئی بار تو اس کا دل چاہا کہ یہیں رہ جائے اور کانپور واپس جانے کا خیال ترک کردے۔ مگر راجیلہ ......؟

پھر وہ ایک سرائے میں گیا۔ چھوٹی سی سرائے تھی ــ اکثر دیواریں اور چھت کچی تھیں۔ اور یہ سرائے آبادی کے پچھلے حصے میں کافی سنسان مقام پر تھی ــ ایک پتلی سی سڑک بل کھاتی ہوئی کھیتوں سے گزرتی جنگل میں چلی گئی تھی۔ سرائے کے عقب میں فوراً ہی کھیتوں اور گھنی جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ گلزار نے خوب سوچ سمجھ کر اس سرائے کا انتخاب کیا تھا۔ اس نے اپنا نام کیدار ناتھ اور پتہ جھانسی کا لکھوایا تھا۔ چابی لے کر وہ اپنے کمرے میں آیا۔ دروازہ احتیاط سے بند کیا۔ چھوٹا سا سفری بیگ چارپائی پر رکھا اور عقبی کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔ شام کے پھیلے ہوئے اندھیرے میں دور تک کھیت درخت اور جھاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ وہ کئی منٹ تک کھڑکی میں کھڑا پُر خیال اور متجسس نظروں سے ایک جانب دیکھتا رہا۔ اس طرف کافی فاصلے پر ایک وسیع اور اونچا ٹیلا تھا۔ ٹیلے کے نشیب میں ایک قدرتی تالاب تھا اور تالاب کے کنارے کنارے ایک پتلی سی پگڈنڈی گزرتی ہوئی آگے جا کر پہاڑی ٹیلوں کے دامن میں کہیں گم ہو گئی تھی۔ کئی منٹ بعد گلزار نے کھڑکی بند کر دی۔ لالٹین جلائی اور پھر اپنے چہرے سے چوڑے فریم والی سبز شیشوں کی عینک اتاری۔ گھنی داڑھی الگ کی کوٹ اور قمیص اتار کر کندھوں کے نیچے سے پیڈ اتارے جس سے کمر جھکائے

جھکائے اب ریڑھ کی ہڈی میں درد ہونے لگا تھا۔ اس نے دو تین طویل انگڑائیاں لیں اور پسلیوں کو دبانے لگا۔ پھر اس نے ناک سے ننھے ننھے اسپرنگ نکال کر سگریٹ کیس میں رکھ لیے اور تب یکایک وہ مسکرایا۔

"کتنی پُرلطف بات ہے ـــ!" یکایک اس نے خود سے کہا۔ "جب میں یہاں سے چلا جاؤں گا تو لوگ اور یقیناً پولیس بھی ایک ایسے شخص کو تلاش کرتی پھرے گی جس کے چہرے پر گھنی کھچڑی داڑھی ہے آنکھوں پر چشمہ ہے اور پیٹھ کے کوبڑ کے باعث جس کا قد بمشکل ساڑھے چار فٹ نظر آتا ہے۔ اس شخص کا نام کیدار ناتھ ہے اور وہ جھانسی کا رہنے والا ہے۔ لیکن ان بیچاروں کو کبھی یہ معلوم نہ ہوسکے گا کہ اس نام اور اس حلیے کا آدمی نہ کبھی اس دنیا میں تھا اور نہ کبھی ہوگا۔ یہ خیال بڑا دلچسپ اور سنسنی خیز تھا۔ گلزار دیر تک اس خیال سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

پھر وہ چارپائی پر لیٹ گیا سر تک چادر اوڑھ لی اور محمد خان ٹھیکیدار کے بارے میں سوچنے لگا۔ پچھلے چند گھنٹے جو اس نے بستی میں گھوم کر گزارے تھے ضائع نہیں گئے تھے۔ اس نے بہرحال یہ معلوم کر لیا تھا۔ کہ محمد خان ٹھیکیدار کہاں ہے۔

☼

یہ دوسرے دن کی شام تھی جب گلزار اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر آہستہ سے نیچے اترا۔ کھڑکی بند کی اور تالاب کی جانب چل پڑا آسمان پر شام ہی سے گہرے سیاہ بادل چھا گئے تھے اس لئے ہر طرف معمول سے زیادہ اندھیرا تھا۔ کھیتوں میں بھی سناٹا تھا۔ کسان اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے پھر بھی گلزار حتی الامکان جھاڑیوں اور درختوں کی آڑ لے کر چلتا رہا۔ اس کے قدم تیز تیز اُٹھ رہے تھے تاکہ کم سے کم وقت میں منزل مقصود پر پہنچ جائے اسے یقین تھا کہ رات کے اندھیرے اور سناٹے میں اُسے کوئی نہیں دیکھے گا اور سرائے کے تمام لوگ یہی سمجھتے رہیں گے کہ وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہا ہے۔

اسے پہاڑی علاقے کے پتھریلے پُرپیچ اور دشوار گزار راستوں پر چلنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس لئے اسے چلنے میں تھوڑی دقت ہو رہی تھی۔ یہ دشواری اور زیادہ ہوتی اگر اسے راستہ نہ معلوم ہوتا۔ لیکن دن میں ایک بار وہ اس جگہ کو دیکھ آیا تھا جہاں اسے جانا تھا۔ اور وہ اپنے راستے کا تعین کر چکا تھا اس لئے وہ زیادہ اعتماد سے چل رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ تالاب پر پہنچ گیا اور ایک چکر کاٹ کر پہاڑی کے عقب میں آگیا۔ یہاں جھاڑیاں بہت گھنی تھیں۔ اور راستہ بتدریج نشیب میں چلا گیا تھا۔ اس نے سفری بیگ سے ٹارچ نکال لی۔ اور اس کی محدود روشنی میں آگے بڑھنے لگا۔

نشیب کے بعد اسے ایک گھنے اور طویل باغ سے گزرنا پڑا۔

پھر ایک چھوٹی سی ندی آگئی۔ ندی کے اوپر کوئی پل نہیں تھا۔ لیکن۔ چونکہ ندی گہری نہیں تھی اس لئے اس نے آسانی سے پار کر لی۔ اس تمام عرصے میں وہ کسی گھبراہٹ یا خوف کا شکار نہیں ہوا تھا۔ اطراف و اکناف میں مکمل اندھیرا تھا اور چاروں طرف ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں کوئی بھی نہیں تھا جو اسے دیکھتا۔ یہ علاقہ بستی سے تقریباً پانچ میل دور تھا اور اسے قطعی اطمینان تھا کہ وہ ہر طرح محفوظ رہے گا۔

ندی عبور کر کے وہ اونچے درختوں کے ایک جھنڈ سے گزرا اور اس کی نگاہ سامنے۔ قدرے بلندی پر واقع ایک خوبصورت عمارت پر جم گئی۔ عمارت گو چھوٹی تھی مگر جاپانی کھلونوں کی طرح خوبصورت تھی طرز بناوٹ جدید انداز کا تھا۔ اور اس کے چاروں طرف خاردار تاروں کا جنگلہ لگا ہوا تھا۔ ایک پتلا سا راستہ بلند ہوتا ہوا جنگلے کے گیٹ تک چلا گیا تھا۔ راستے کے دونوں طرف مہندی کی باڑھیں لگی تھیں گلزار کو عمارت کے ایک وسیع دریچے میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ وہ دریچہ غالباً ڈرائنگ روم کا تھا۔ گلزار نے اپنا سفری بیگ ایک جھاڑی کی آڑ میں رکھ دیا۔ اور گھوم کر چاروں طرف نظر ڈالی۔ اور ایک انوکھی سی سنسنی اپنی رگوں میں دوڑتی ہوئی محسوس کی۔ یہ خاموشی، یہ تنہائی یہ حدِ نظر تک پھیلا ہوا ویرانہ، یہ پُرسکوت ٹیلے اور خاموش جھاڑیاں۔ اور اس ویرانے میں یہ چھوٹا سا مکان ـــ اس مکان میں ٹھیکیدار محمد خان رہتا ہے ـــ دنیا اور اس کے ہنگاموں سے دُور ـ انسانوں سے دُور ـــ اس مکان کے آس پاس پھیلی ہوئی سینکڑوں ایکڑ زمین اس کی اپنی ہے۔ یہاں وہ ایک شہنشاہ کی طرح رہتا ہے اور اپنے بیشمار ملازموں پر حکومت کرتا ہے۔ واقعی وہ بہت ذہین ہے۔ اس کے لئے اس علاقے اور اس مکان سے زیادہ محفوظ پناہ گاہ اور کوئی نہیں ہو سکتی!

یکایک وہ مسکرایا۔ طنز میں ڈوبی ہوئی استہزائی ـــ مسکراہٹ تھی۔ پھر اس نے بیگ کھول کر چند ضروری چیزیں نکالیں اور مکان کی طرف بڑھ گیا۔

روشن دریچے کے ساتھ ہی داخلی دروازہ تھا۔ اس نے دستک دی اور انتظار کرنے لگا۔ چند ثانیہ بعد دوسری جانب قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر بولٹ گرا اور دروازہ کھل گیا۔ گلزار نے دیکھا اس کے سامنے اونچے قد اور چوڑے شانوں والا ایک

شخص کھڑا تھا۔ اگرچہ وہ خاصا بدلا ہوا نظر آرہا تھا اس کے سر پر اب بہت تھوڑے بال تھے اور وہ بھی دودھ کی طرح سفید تھے۔ ہونٹوں کے اوپر گھنی اور بڑی بڑی سفید مونچھیں بھی تھیں۔ زیادہ جاگنے یا زیادہ مے نوشی کے باعث آنکھیں سُرخ اور تھکی تھکی نظر آرہی تھیں ـــ پیٹ بہت بڑھ گیا تھا جو اسے خاصا مضحکہ خیز بنا رہا تھا چہرے پر سختی، رعونت اور کینہ توزی کے تاثرات تھے ـ حلیئے میں کافی فرق ہونے کے باوجود گلزار فوراً پہچان گیا کہ وہ کرنل آفتاب ہے۔

کرنل آفتاب بہت غور سے گلزار کو دیکھ رہا تھا۔ معاً اس نے بھاری اور گونجدار آواز میں کہا۔ "فرمایئے ـــ؟"

"کیا آپ ہی محمد خان ٹھیکیدار ہیں ـــ؟" گلزار نے پوچھا

"ہاں ـــ!"

"کیا آپ مجھے اندر آنے کے لئے نہیں کہیں گے ـــ؟"

گلزار تیکھی مسکراہٹ کے ساتھ بولا ـــ "میں کانپور سے آیا ہوں"

ڈرائنگ روم میں پہنچکر گلزار حیرت زدہ رہ گیا۔ کمرے کی آرائش اس کی توقع سے زیادہ شاندار تھی۔ فرنیچر اور دوسری اشیاء بہت قیمتی اور خوبصورت تھیں۔ کمرے میں بجلی کی موجودگی سے ظاہر تھا کہ کرنل نے اپنا ذاتی جنریٹر لگا رکھا ہے گلزار کو جنریٹر کی مدھم آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ اسے ایک جانب ریکارڈ پلیئر بھی رکھا ہوا نظر آیا۔ ساتھ میں ریکارڈوں کا ریک بھی تھا جس میں بے شمار ریکارڈ لگے ہوئے تھے۔ گلزار نے آہستہ سے سیٹی بجائی۔ اور گھوم کر محمد خان کی طرف دیکھا.....

"فرمایئے! آپ یہاں کیوں آئے ہیں ـــ؟" بالآخر محمد خان نے کرخت آواز میں پوچھا۔ اس کے انداز سے ناگواری کا اظہار ہو رہا تھا۔

گلزار ذرا تمسخر سے مسکرایا۔ "مجھے افسوس ہے میری آمد کا مقصد جان کر آپ خوش نہیں ہوں گے ـــ"

"کیا مطلب ـــ؟" محمد خان نے حیرت سے پوچھا۔

"میں یہاں کئی باتیں جاننے کے لئے آیا ہوں۔" گلزار کے لہجے میں بیحد تیکھا پن تھا ـــ "جن میں سے ایک یہ ہے کہ کیا آپ، واقعی محمد خان ٹھیکیدار ہیں ـــ؟"

"تم کیا بک رہے ہو ـــ؟" محمد خان یکایک جھنجلا کر چیخا ـــ "تمھارا دماغ تو درست ہے۔ اگر میں محمد خان نہیں ہوں تو کیا ہوں ـــ"

ہسٹیریا

ایک خوفناک مرض

ہسٹیریا کا مرض آج کل عام ہوتا جا رہا ہے! اور اس کا شکار زیادہ تر ایسی کنواری لڑکیاں ہیں جن کو بچپن ہی سے مرغن غذائیں بغیر ہاتھ پیر ہلائے کھانے کو ملتی ہیں۔ اور بوجوہ ان کی شادی نہیں ہو پاتی۔ علاوہ ازیں غم، غصہ، قبض، خون حیض کا کمی کے ساتھ آنا یا بالکل ہی بند ہو جانا رحم کی خرابی اور خاوند کی جنسی کمزوری کی وجہ سے بھی یہ مرض پیدا ہوتا ہے! اور اس مرض سے دل دماغ اور معدہ متاثر ہو جاتا ہے۔ جب دورہ شروع ہوتا ہے تو مریضہ کا جی متلاتا، کلیجہ جلنا اور پیٹ میں نفخ سا ہو جاتا ہے جمائیاں اور انگڑائیاں آتی ہیں۔ بدن بھاری اور سُست ہو جاتا ہے۔ دل دھڑکنا سانس تکلیف سے آنا اور چہرہ زرد ہو جاتا ہے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ مریضہ بدحواس ہو کر پیر مارتی اور چیخ مار کر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ ہسٹیریا کا مریض سب کچھ سنتا اور اس کا جواب دیتا ہے۔ اس کی آواز بدل جاتی ہے اس میں بلا کی قوت آجاتی ہے اور ایسے کام سر انجام دے سکتا ہے جو حالت ہوش میں ناممکن ہیں بعض اوقات پیش گوئیاں کر کے جاہل عوام کو شک و شبہ میں ڈالتا ہے۔

احتناقی پیکوڈ

ہسٹیریا کا سب سے مؤثر اور جدید علاج ہے۔ مفصل لٹریچر اور طبی مشورہ ۲۰ پیسے کے ٹکٹ بھیجکر مفت حاصل کریں۔ ہر دوا فروش سے طلب کریں کہیں نہ ملے تو براہ راست ہم سے منگوائیں۔ قیمت ۲۱ دنٹس پیکنگ ۔/۶ علاوہ محصولڈاک

تیار کردہ، جاوید یونانی لیبارٹریز رجسٹرڈ میانوالی

"بڑی آسان بات ہے —" گلزار طنز سے مسکرایا۔ "تمہارا پورا نام کرنل آفتاب محمد خان ہے۔ یہاں آ کر تم نے اپنے پہلے نام کا استعمال ترک کر دیا اور بڑی آسانی سے محمد خان ٹھیکیدار بن گئے —"

کرنل آفتاب اچانک اس طرح جھجک کر پیچھے ہٹا جیسے اس پر سانپ نے حملہ کیا ہو۔ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں اور ان میں حیرت اور سختی کچھ زیادہ ہی اُبھر آئی تھی۔ اس نے کینہ توز لہجے میں کہا۔

"تم کون ہو —؟"

گلزار نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ ہاتھ اٹھا کر اپنے کوٹ پر انگلیاں پھیریں۔ اور مسکرا کر بولا — "میں ایک کُبڑا آدمی ہوں اور میرا نام گلزار ہے —"

"تو پھر تم کیا چاہتے ہو —؟"

"تمہیں — !" گلزار ہاتھ اٹھا کر مسکرایا — "لیکن اس سے پہلے میں تمہیں ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں — یہ چار افراد کی کہانی ہے جنھوں نے ایک سرد طوفانی اور بھیانک رات میں اپنے ایک محسن اور دوست کو قتل کر دیا تھا۔ ان میں سے تین کو تو میں نے تلاش کر لیا تھا اگر تم اخبار پڑھتے ہو تو تمہیں پتہ ہو گا کہ وہ تینوں اب اس دنیا میں نہیں ہیں اپنے کئے کی سزا پا چکے ہیں۔ چوتھے کی مجھے تلاش تھی —"

کرنل آفتاب خون آشام نظروں سے گلزار کو گھور رہا تھا۔ اس کا چہرہ تاریک ہو گیا تھا۔ اور گردن کی رگیں تن گئی تھیں۔ لیکن گلزار اس کی طرف توجہ دیئے بغیر کہتا رہا — "لیکن چوتھا آدمی بہت چالاک تھا وہ اپنے دوست کو قتل کرنے کے بعد فرار ہو گیا اور ایک دُور دراز اور تقریباً غیر آباد علاقے میں جا کر آباد ہو گیا۔ مزید احتیاط کے طور پر اس نے اپنا نام بھی بدل لیا۔" اتنا کہہ کر اچانک گلزار رک گیا۔ گھوم کر کرنل آفتاب کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ اور لمحہ بھر ٹھہر کر چبھتی ہوئی آواز میں بولا — "لیکن تم نہیں جانتے — تمہاری تلاش میں میں نے کتنے پاپڑ بیلے ہیں۔ کتنے لوگوں سے ملا ہوں اور کتنی جستجو کے بعد تم تک پہنچا ہوں۔ کانپور میں مجھے پتہ چلا کہ تم اپنے آبائی گاؤں رام نگر چلے گئے ہو۔ وہاں معلوم ہوا کہ کلکتے میں ہو کلکتے میں تمہارا سراغ نکالنا آسان کام نہیں تھا۔ لیکن میں نے بہرحال معلوم کر لیا کہ تم وہاں سے گورکھپور گئے تھے۔ اور وہاں کے ایک زمیندار سے زمینیں خریدی تھیں۔ اس کے بعد میرے لئے یہاں تک پہنچنا زیادہ مشکل نہیں تھا —" گلزار اچانک رک کر مسکرایا — "کیا تم میری اس تمام جدوجہد کی داد نہیں دو گے۔ کرنل آفتاب —؟"

"لیکن تم مجھے کیوں تلاش کر رہے تھے —؟"

"کیونکہ میں تمہیں قتل کرنا چاہتا ہوں — !"

"کیا —؟" کرنل آفتاب یکایک زور سے چیخا — "تمہارا دماغ تو درست ہے —؟"

"چیخو مت کرنل —" گلزار استہزائی انداز میں مسکرایا۔ "اطلاعاً عرض ہے کہ میرا دماغ بالکل درست ہے اور بقائمی ہوش و حواس میں تمہارے تین ساتھیوں کو جہنم بھیج چکا ہوں اور اب تمہاری باری ہے — سمجھے —؟"

کرنل آفتاب کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ اس نے تیزی سے دروازے کی جانب بڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن گلزار بہرحال اس سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا۔ ایک ہی جست میں اس نے کرنل آفتاب کو جا لیا۔ کرنل آفتاب بیشک فوج میں کرنل رہا ہو گا۔ لیکن اب اس میں فوجیوں والا دم خم نہیں تھا۔ گلزار نے اسے آسانی سے نیچے گرا لیا۔ اس وقت گلزار کا چہرہ جوش اور ہیجان کے باعث تمتما رہا تھا۔ آنکھوں میں اندھیرے میں چمکنے والے جگنوؤں کی چمک تھی۔ کیونکہ یہی وہ لمحہ تھا جس کا وہ اب تک انتظار کر رہا تھا۔ اس لمحے کے لئے اس نے کتنی جدوجہد کی تھی۔ کتنے لمبے فاصلوں کی مسافت طے کی تھی تاکہ اس چوتھے پتھر کو اپنے راستے سے ہٹا دے۔ اور پھر ایک ہی جست میں راحیلہ کے قریب پہنچ جائے۔ راحیلہ — راحیلہ ...... تم کہاں ہو۔ دیکھو۔ دیکھو یہاں آؤ میرے قریب۔ اور اس منظر کو دیکھو۔ یہ ہے تمہارے باپ کا چوتھا قاتل تم اسے مرتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھیں نا۔ دیکھو — اس وقت یہ بالکل میرے رحم و کرم پر ہے۔ بے بس تنکے کی طرح بے سہارا۔ میں اس کے سینے میں بالکل اسی طرح خنجر اتار دوں گا جس طرح اس نے تمہارے باپ کے سینے میں اتارا تھا۔ اور پھر سُرخ خون کا فوارہ اُچھلنے لگا اور پھر اس کا دم نکل جائے گا۔ اور تمہارا انتقام پورا ہو جائے گا۔ راحیلہ کیا تم یہ منظر نہیں دیکھو گی جس کا تم مدت سے انتظار کر رہی تھیں — !

کرنل آفتاب گلزار کی گرفت سے نکلنے کی جی جان سے کوشش کر رہا تھا۔ لیکن یہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کے قویٰ جواب دے چکے تھے۔ اور شاید وہ بزدل بھی تھا۔ گلزار نے دو تین گھونسے اس کی پسلیوں میں مارے تو وہ فرش پر گر پڑا۔ دوسرے لمحے گلزار کے ہاتھوں میں خنجر نظر آیا۔ اس کی خیرہ کن چمک سے کرنل کی آنکھوں کی روشنی مدھم پڑ گئی۔ چہرہ تاریک ہو گیا۔ اور اس کے حلق سے ایک تیز چیخ نکلی۔ لیکن وہ چیخ نہ تو ڈھال تھی اور نہ پتھر کا خول جو خنجر کو نہیں روک سکی۔ خنجر کی آبدار نوک سیدھی اس کی پسلیوں میں اترتی

چلی گئی ---- !

یکایک گلزار نے چبھتی ہوئی آواز میں کہا --- میں جانتا ہوں کرنل تم ایک بھگوڑے فوجی ہو۔ تم امن کے دنوں میں فوج میں رہ کر ترقی کرتے کرتے کرنل بن گئے تھے لیکن جب جنگ میں دادِ شجاعت دینے کا وقت آیا تو تم بیماری کی آڑ لے کر الگ ہو گئے۔ لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ تم اتنے بزدل اور کائیر اور پاکھنڈی ہو۔ ارے تم تو فوجی جوانوں کی جوانمردی پر ایک بدنما دھبّہ ہو۔ لعنت ہے تم پر --- "

کرنل کے ہاتھ جڑے ہوئے تھے اور وہ لرزتی ہوئی آواز میں گلزار سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ خنجر اپنا کام کر چکا تھا۔ اور موت اور زندگی کے درمیان صرف چند قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ گلزار نے یکے بعد دیگرے کئی وار کئے اور مسلسل کہتا رہا ---

" چیخنا بیکار ہے کرنل --- میں جانتا ہوں اس وقت گھر میں کوئی نہیں ہے لہٰذا کوئی تمھاری مدد کو نہیں آئے گا۔ رہ گیا میں --- تو مجھے تم پر رحم کھانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے کیونکہ تمھیں وہ رات یاد ہوگی جب تم نے کسی پر اسی طرح وار کیا تھا۔ اور تمھیں اس پر رحم نہیں آیا تھا --- ! "

کرنل کے چہرے پر کشمکش کے آثار تھے۔ اس کے ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ بہت کچھ پوچھنا چاہتا ہو۔ جاننا چاہتا ہو۔ گلزار کون ہے --- اسے کیوں قتل کر رہا ہے --- جس شخص کا وہ ذکر کر رہا ہے۔ اور جسے کرنل آفتاب اور اس کے دوستوں نے مل کر قتل کیا تھا اس سے گلزار کا کیا تعلق ہے --- لیکن اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ الفاظ ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ پھر بھی اس نے کسی نہ کسی طرح چند الفاظ ادا کر ہی لئے۔

" تت..... تم شاید شیخ اکبر علی کا ذکر کر رہے ہو۔ اس کا تم سے کیا تعلق ہے ---؟ "

" تمھیں اس کی کوئی پرواہ نہیں ہونی چاہئیے۔" گلزار نے ایک اور وار کیا۔ یکایک اسے ایک خیال آیا۔ ایک عجیب لیکن ذہن کو جھنجھوڑ دینے والا خیال۔ اس نے ایک کے بعد ایک تین آدمی قتل کئے تھے اور اب چوتھا بھی مر رہا تھا۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ ان چاروں نے راحیلہ کے باپ شیخ اکبر علی کو کیوں قتل کیا تھا۔ اس نے اٹھا ہوا ہاتھ فوراً روک لیا اور نسبتاً نرم لہجے میں بولا۔

" کرنل اب تم مر رہے ہو۔ کیا اب بھی تم یہ نہیں بتاؤ گے کہ تم نے شیخ اکبر کو کیوں مارا تھا ---؟ "

کرنل نے یکایک ہونٹ بھینچ لئے۔ مضطرب اور الجھی ہوئی نظروں سے گلزار کو دیکھنے لگا۔ پھر طویل سانس لے کر بولا " اچھی بات ہے۔ تم اگرچہ میرے قاتل ہو۔ لیکن میں تمھاری یہ خواہش ضرور پوری کروں گا --- دراصل ہم چاروں نے ایک بھیانک جرم کیا تھا۔ کسی طرح یہ جرم اکبر علی کے علم میں آگیا۔ اس نے کہا کہ ایک شریف اور ایماندار شہری کی حیثیت سے اس کا فرض ہے کہ وہ اس جرم کی اطلاع پولیس کو دیدے۔ اور وہ ایسا ضرور کرے گا۔ اور ہمارے پاس اس کو روکنے کا کوئی طریقہ نہیں تھا"

" چنانچہ تم نے اسے دیانت کے راستے پر چلنے سے روک دیا۔" گلزار نے نفرت سے کہا اور خنجر ایک بار پھر اٹھا لیا۔

گلزار نے کبھی اپنی زندگی میں اتنا ہیجان اور بیقراری محسوس نہیں کی تھی جتنی اس وقت محسوس کی۔ جب وہ کانپور اسٹیشن سے باہر نکلا سفر کس طرح کٹا تھا یہ اسے علم نہیں لیکن اسٹیشن سے راحیلہ کی کوٹھی تک کا فاصلہ کیونکر کٹے گا یہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اگر اس کے اختیار کی بات ہوتی تو اڑ کر پہنچ جاتا۔ اور اگرچہ ٹیکسی پوری رفتار سے چل رہی تھی پھر بھی اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ رینگ رہی ہو۔ بے قراری، الجھن، بے چینی اور شوق --- راحیلہ کو دیکھنے کا شوق اسے کرنل کی موت کی اطلاع دینے کا شوق۔ راحیلہ کس قدر خوش ہوگی۔ اسے کتنا سکون ملے گا۔ خود گلزار بھی بے حد مسرور تھا۔ آخری پتھر ہٹ چکا تھا۔ اب اس کے اور راحیلہ کے درمیان کوئی شے حائل نہیں ہو سکتی تھی۔ اب وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے راحیلہ کو جیت لے گا ---- !

اگرچہ اسے راحیلہ کے بنگلے پر نہیں جانا چاہئیے تھا کیونکہ راحیلہ نے اسے منع کر دیا تھا لیکن اپنے آپ کو روکنا گلزار کے لئے بہت مشکل تھا۔ وہ انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ پتہ نہیں کب راحیلہ سے ملاقات ہو --- دو دن بعد یا چار دن بعد یا چھ دن بعد۔ وہ اتنا عرصہ کیسے انتظار کرے گا جذبات کے ابال اور بے چینی سے اس کا دم گھٹ جائے گا۔ اور پھر یہ بھی تو ہے کہ راحیلہ کوئی پابردہ لڑکی نہیں ہے۔ سڑکوں پر گھومنے اور کالج میں پڑھنے والی لڑکی ہے لہٰذا اگر ایک بار ہاں صرف ایک بار وہ اپنی مرضی سے --- راحیلہ کے بنگلے پر چلا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر بنگلے پر کسی اور سے سامنا ہو گیا تو وہ کہہ دے گا کہ وہ راحیلہ کا کالج کے زمانے کا دوست ہے کئی سال پہلے باہر چلا گیا تھا۔ اب واپس آیا ہے تو راحیلہ سے بھی ایک بار مل لینا چاہتا ہے ---- !

دن آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا۔ شام کا رومان انگیز دھندلکا چاروں اور پھیلتا جا رہا تھا۔ کسی نہ کسی طرح ٹیکسی نے راحیلہ

کے بنگلے تک فاصلہ طے کر لیا۔ گیٹ سے کچھ فاصلے پر ہی وہ اُتر پڑا۔ کرایہ ادا کیا۔ پھر ٹیکسی واپس چلی گئی اور وہ گیٹ کے اندر داخل ہو گیا۔

ہر طرف سناٹا تھا اور خاموشی۔ بنگلے میں کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ البتہ ایک کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ گویا راحیلہ کمرے میں موجود تھی۔ گلاب کی کیاریوں کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے جھک کر ایک پھول توڑ لیا۔ آج وہ یہ پھول راحیلہ کے بالوں میں سجا دے گا۔ راحیلہ کو گلاب کے پھول بہت پسند ہیں نا۔ جب وہ یہ پھول خود اپنے ہاتھوں سے اس کے جوڑے میں سجائے گا تو وہ کتنا خوش ہو گی۔ یہ سوچ کر گلزار مسکرایا۔

جب وہ ورانڈے کے قریب پہنچا تو یکایک ایک نوکر بائیں جانب والی راہداری سے نکل کر سامنے آگیا۔ گلزار کو سوالیہ نظروں سے دیکھ کر اس نے پوچھا۔ "فرمائیے بابو جی ۔۔۔؟"

"گھر میں کوئی ہے ۔۔۔؟" گلزار نے شائستگی سے پوچھا۔

"ہاں! بیگم صاحب ہیں ۔ آئیے میرے ساتھ ۔۔۔"

چند منٹ بعد نوکر اسے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ گلزار نے حیرت اور شوق سے چاروں طرف دیکھا۔ یہ وہی ڈرائنگ روم تھا۔ جہاں وہ راحیلہ کے ساتھ پہلے بھی آچکا تھا۔ وہی صوفہ وہی کرسیاں وہی ٹیبل ۔ وہ دراز بھی سامنے نظر آ رہی تھی جس میں سے راحیلہ کے کہنے پر گلزار نے روپیہ نکالا تھا۔ وہ ٹھیک اسی جگہ بیٹھا جہاں پہلے بیٹھا تھا پھر نوکر نے کہا ۔۔۔ "آپ تشریف رکھیں بیگم صاحبہ ابھی آتی ہیں ۔۔۔"

گلزار انتظار کرنے لگا۔ ایک ایک لمحہ ایک صدی کے برابر طویل ہو گیا تھا۔ پھر آخر کار دروازہ آہستہ سے کھلا۔ اور گلزار بوکھلا کر کھڑا ہو گیا اور اس کی نگاہ دروازے پر جم گئی ۔۔۔ لیکن آنے والی راحیلہ نہیں تھی۔ ایک معمر اور باوقار خاتون تھیں۔ ان کی آنکھوں پر چشمہ چڑھا ہوا تھا۔ تقریباً سارے بال سفید ہو گئے تھے۔ جسم پر لباس بھی سفید تھا اور انھوں نے سیاہ شال اوڑھ رکھی تھی جو ان کی شخصیت میں بے پناہ تمکنت پیدا کر رہی تھی۔ گلزار نے سٹپٹا کر کہا۔ "آپ ۔۔۔؟"

"جی ہاں ۔۔۔!" خاتون مسکرائیں ۔۔۔ "آپ کو کس سے ملنا ہے۔"

فوری طور پر گلزار کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے کیسے کہے اتنا تو وہ سمجھ ہی گیا تھا کہ معمر خاتون راحیلہ کی خالہ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتیں۔ لیکن وہ کیسے کہے کہ وہ راحیلہ سے ملنا چاہتا ہے۔ اسے تذبذب میں دیکھ کر خاتون نے خود ہی کہا۔

"آپ کون ہیں ۔ کہاں سے آئے ہیں ۔۔۔؟"

"میں گلزار ہوں ۔۔۔" گلزار نے خود پر قابو پا کر کہنا شروع کیا۔ "اسی شہر کا رہنے والا ہوں۔ لیکن باہر چلا گیا تھا۔ کئی سال بعد واپس آیا ہوں۔ میں اور مس راحیلہ کئی سال کالج میں اکٹھے پڑھتے رہے تھے ۔۔۔!"

"اوہ ۔۔۔!" خاتون یکایک صوفے پر بیٹھ گئیں۔ اور ان کے چہرے پر کرب کے آثار نظر آئے۔ پھر انھوں نے مغموم لہجے میں کہا ۔۔۔ "تو تم راحیلہ بٹیا کے دوست ہو اور اس سے ملنا چاہتے ہو ۔۔۔؟"

گلزار نے سر جھکا لیا۔

خاتون نے چند لمحے بعد خود ہی کہا۔ "تم کئی سال باہر رہے ہو اس لئے تمھیں علم نہیں ۔۔۔"

"کیا ۔۔۔؟" گلزار نے چونک کر پوچھا۔

"یہی کہ راحیلہ کا انتقال ہو چکا ہے ۔۔۔"

"جی ۔۔۔!" گلزار بوکھلا کر رہ گیا۔ اسے ایسا لگا۔ جیسے کسی نے اس کے دل پر گھونسہ مارا ہو یا اسے کسی بہت بلند پہاڑ سے دھکا دے دیا ہو اور وہ لڑھکتا ہوا۔ نیچے بہت نیچے کسی لاانتہا گہری اندھی کھائی میں گرتا چلا جا رہا ہو۔ یہ عورت آخر کیا بکواس کر رہی ہے۔ کہیں اس بڑھیا کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے۔ خبیث ، پاگل ۔۔۔ بھلا راحیلہ کیسے مر سکتی ہے۔ وہ تو زندہ ہے۔ اور گلزار سے ملتی رہی ہے۔ اس نے جلتی ہوئی نظروں سے خاتون کی جانب دیکھا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ ایسے کیسے ہو سکتا ہے .... راحیلہ تو ...."

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ بٹیا راحیلہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔"

"مگر ...... مگر ...... سنیئے تو ۔۔۔ راحیلہ میرا مطلب ہے کہ راحیلہ اور میں ......"

"مجھے یقین ہے بیٹا۔ تم اور راحیلہ بہت اچھے دوست رہے ہو گے۔ اگر تم یہاں ہوتے اور ہماری بربادی کی داستان سنتے تو تمھارا بھی کلیجہ پھٹ جاتا۔ یہ ایک سال سے کچھ اوپر کی بات ہے ایک رات میرے بہنوئی شیخ اکبر علی کو کسی نے قتل کر دیا۔ وہ اس رات اپنے اکبر پور والے مکان میں تھے۔ راحیلہ بھی وہیں تھی۔ قاتل نے پہلے تو میرے بہنوئی کو قتل کیا پھر راحیلہ کی عزّت بھی لوٹ لی۔ باپ کے قتل اور بھرائی آبرو کے لٹ جانے سے اس کے دل و دماغ پر اتنا شدید اثر پڑا کہ وہ بیمار ہو گئی۔ سرسام کا حملہ ہوا تھا۔ بخار اتنا تیز تھا کہ اس کے جسم پر ہاتھ نہیں رکھا جاتا تھا۔ حادثہ کے بعد وہ صرف چوبیس گھنٹے زندہ رہی۔ اور اس

میں بھی زیادہ تر بے ہوش رہی۔ حواس بحال نہیں تھے۔ اس لئے جب چند منٹ کے لئے ہوش میں آتی تو ہذیان بکنے لگتی تھی عجیب ناقابل فہم باتیں — میں انتقام لوں گی — میں انتقام لوں گی۔ میں ان کا خون پی جاؤں گی — بس یہی دو تین جملے رٹتی رہتی اور پھر بے ہوش ہو جاتی۔ مرتے وقت بھی اس کے ہونٹوں پر انتقام کا لفظ تھا۔ لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکی اور آخر کار وہ مر گئی — "

خاتون ایک لمحے کے لئے رکیں گلزار کو دیکھا اور رنجیدہ لہجے میں پھر بولیں — "پولیس کا خیال تھا کہ راحیلہ قاتل یا قاتلوں کو ضرور جانتی ہے۔ لیکن اسے بتانے کا موقع نہیں ملا۔ اس کا ذہن ہی مفلوج ہو چکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قاتل یا قاتلوں کو پولیس نہیں پکڑ سکی وہ آج بھی زندہ ہیں۔ مگر اب اس گھر میں کوئی نہیں ہے۔ صرف میں ہوں اور چند نوکر ہیں۔ نہ راحیلہ ہے نہ میرے بہنوئی۔ ان کی یادیں رہ گئی ہیں یا پھر ان کی اشیا رہیں۔ جنھیں میں نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ ان کی کتابیں، ان کے کپڑے۔ راحیلہ کی ٹرافیاں۔ اس کی سینڈلیں حتیٰ کہ اس کا کنگھا اور برش تک میں نے یادگار کے طور پر رکھ لیا ہے اور.....؟"

خاتون کہتی رہیں۔ نہ جانے کیا کیا۔ ان کی آواز لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی گئی — گلزار کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا وجود دھیرے دھیرے تحلیل ہوتا جا رہا ہے۔ دھیرے دھیرے اس کا قد سکڑتا جا رہا ہے اور ذہن سوتا جا رہا ہے۔ اور آنکھیں پانی بن کر بہتی جا رہی ہیں اور زبان گویائی سے محروم ہو چکی ہے۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ راحیلہ کی آرزو پوری ہو چکی ہے۔ قاتل اب زندہ نہیں ہیں سب کے سب مر چکے ہیں۔ لیکن وہ کہہ نہ سکا حتیٰ کہ اس کے کان سو گئے اور آنکھوں کے آگے گہرا اندھیرا چھا گیا

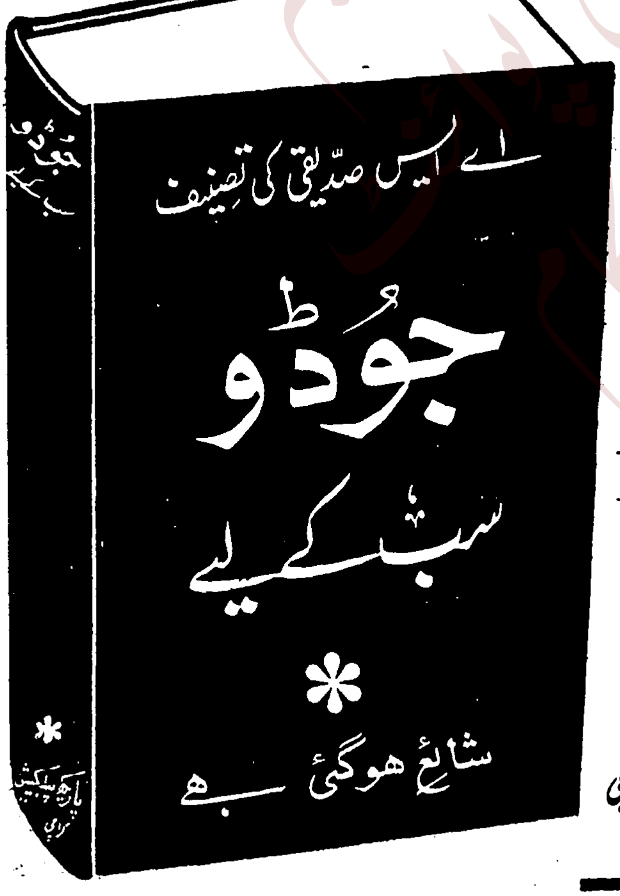

ذاتی دفاع کی تدبیروں اور جوڈو کے فن پر اردو میں پہلی کتاب

● آج کا دور ہنگاموں اور تشدد کا دور ہے، کمزوروں عورتوں اور نوعمر لڑکوں کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہے

● آسان ترین زبان میں یہ کتاب ماہرین جوڈو کی آراء کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے۔

آج ہی طلب فرمائیے

— قیمت ۴/- روپے —

علاوہ محصول ڈاک

کراچی بک ڈپو

۴۸ — اردو بازار ✺ کراچی

پاکستان